رجسٹرڈ نمبر ایل ۳۷۹۷

منظور کردہ جناب ڈائرکٹر صاحب بہادر سررشتہ تعلیم پنجاب
بموجب سی ایم نمبر ۱۱۴۳۵ سی، مورخہ ۲۲ مئی ۱۹۳۶ء

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اردو ایڈیشن

زیر ادارت
خان بہادر شیخ نور الٰہی، ایم اے، آئی ای ایس
بشیر احمد ہاشمی ایم اے - ایم - ای - ڈی پی ای - ایس
پروفیسر گوپال داس کھنہ، ایم اے، بی ٹی

Vol. 5. April, 1938. No. 1.

سالانہ چندہ: چار روپے

مفید اللغات اُردُو

منظور کردہ جناب ڈائرکٹر صاحب پبلک انسٹرکشن پنجاب
بموجب سرکلر نمبر ۹-23307 مورخہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۳۶ء

یہ کتاب محکمۂ تعلیم پنجاب کے منظور شدہ مدارس و دیگر مکاتب کی ضروریات اور عام طلبہ و شائقین کی سہولت کے لیئے نہایت کوشش، محنت اور عرقریزی سے تیار کی گئی ہے۔

اس کتاب میں ہزاروں الفاظ عربی، فارسی، پنجابی، ترکی، انگریزی وغیرہ زبانوں میں جلی قلم سے مع ان کے اعرابوں کے نہایت صحت اور صفائی سے دیئے گئے ہیں اور ہر لفظ کے مقابلے میں اس کے معنی نہایت خوبی اور صفائی سے پیش کیئے گئے ہیں۔ یہ کتاب عمدہ سفید کاغذ پر نہایت خوشخط چھپی ہے اور کپڑے کی خوبصورت سنہری جلد سے مزیّن ہے۔

قیمت فی جلد دو روپے (عہ)

المشتہران
رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز
ایجوکیشنل پبلشرز، لاہور

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اُردو ایڈیشن

نمبر (۱)	اپریل ۱۹۳۸ء	جلد (۵)

فہرستِ مضامین

ایڈیٹوریل

انفرادی غیر ذمّے داری ہمیشہ جماعت میں اس طرح اثر کر جاتی ہے کہ ملّت غیر ذمّے دار بن جاتی ہے۔ اکثر ملّت کے اربابِ حل و عقد کی غیر ذمّے داری بتدریج افراد پہ اپنا اثر ڈالتی ہے۔ بہرحال غیر ذمّے داری خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، سماج کی زندگی کو نقصان پہنچانے کا باعث ہو جاتی ہے۔ ایک ملک دوسرے ملک سے، ایک حکومت دوسری حکومت سے، ایک ادارہ دوسرے ادارے سے اور ایک فرد دوسرے فرد سے تاثرات قبول کرتا ہے۔ یورپ کی طوائف الملوکی کا اثر تمام دنیا میں رونما ہو رہا ہے اور ہندوستان کی سماج بھی روز نئے نئے اثرات قبول کر رہی ہے۔ اس وقت سیاسی اور اقتصادی تاثرات کی توضیح مدّنظر نہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ ان تاثرات میں سے دو یعنی "استبداد" اور "آزادی" کو مدِنظر رکھتے ہوئے اپنے مدارس کے متعلق کچھ عرض کیا جائے۔

استبداد ہر طرح اور ہر صورت میں مذموم ہے۔ آزادی ہر طرح اور ہر صورت میں قابلِ ستائش ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ ہم اپنے مدارس سے استبداد کا اخراج اور ان میں آزادی کا رواج ضروری سمجھیں۔ اس لیے ان دو لفظوں یعنی "استبداد" اور "آزادی" کا صحیح مفہوم واضح ہو جانا ضروری ہے۔

استبداد کے معنی ہیں کسی جائز مطالبے کو جبریہ طور پہ دبا دینا اور آزادی کے معنی ہیں، ہر جائز مطالبے کو تسلیم کرنا۔

آیئے دیکھیں کہ ہندوستانی مدارس میں استبداد کس حد تک موجود ہے اور آزادی کس

حد تک۔

مدرسے کے دو اہم اجزاء مدرس اور طلبہ ہیں۔ فرداً فرداً لیکن نہایت اختصار کے ساتھ کوشش کی جائیگی کہ اُن کے حالات کا محاسبہ کریں۔

مدرّس بالعموم ہیڈ ماسٹر کے احکامات کی تعمیل کرتا ہے، جو جماعت اور جو مضمون اُسے دیا جاتا ہے، اُسے پڑھاتا ہے۔ جو قوانین مدرسے میں رائج ہوتے ہیں، اُن کی پابندی کرتا ہے۔ ہیڈ ماسٹر انسپکٹر کے احکامات کی تعمیل کرتا ہے۔ مدرسے کے نصاب، کتابوں کے انتخاب مضامین کی تدریس اور چھوٹے چھوٹے شعبوں کے انتظام میں انسپکٹر کے احکامات کے خلاف کوئی طریق کار اختیار کرنے کا مجاز نہیں لیکن انسپکٹر بھی سررشتہ تعلیم کے قوانین کی پابندی کے باعث اسی درجہ محتاج ہے، جیسا کہ ہیڈ ماسٹر یا سررشتہ تعلیم خود، حکومت کی پالیسی کے پابند ہیں یعنی ابتدا سے انتہا تک ایک مستند قانون ہے، جس کی پابندی ہر فرد پر لازم ہے۔ ہر نظام کے لیے ضروری ہے کہ اس میں ہم آہنگی ہو لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ امر واقعہ ہے کہ اکثر اور بیشتر ایک نظام، اپنے کارکنوں کو سست اور اپاہج بنا دیتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر یوں سمجھیے کہ آزادی کو سلب کر لیتا ہے۔ میرا اس سے یہ مطلب نہیں کہ آزادی اور غیر ذمّے داری کو ہم معنی قرار دوں لیکن میں یہ اعلان کرنے سے بھی باز نہیں رہ سکتا کہ ہر شخص جو کسی اصول کے ماتحت جزوی باتوں کو نظرانداز کر دے، وُہ ذمّے دار نہیں۔ اگر ایک ہیڈ ماسٹر چند خاص کتابیں اپنے مدرسے میں ایسی رائج کرنا چاہتا ہے، جو سررشتہ کی طرف سے منظور نہیں ہو چکیں، لیکن جو طلبہ کی تعلیم و تربیت اور تشکیلِ سیرت، مروّجہ کتابوں سے بہتر کر سکتی ہیں، تو اُسے اختیار ہونا چاہیے کہ وُہ انھیں رائج کر دے ایسی چھوٹی چھوٹی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں، جن کے سبب سے ہمارے مدارس پابند ہیں اور اس لیے اپنے مدرسوں میں جائز اصلاح

کرنے سے قاصر ہیں۔

اس مستبد ماحول کا اثر یہ ہوتا ہے کہ مدرّسین بھی غیر ارادی طور پر اپنے طرزِ عمل میں مستبد ہو جاتے ہیں۔

اب طلبہ کو دیکھیے، پہلے دن سے بچّے کے ماں باپ اس کی زندگی کو "یہ کرو۔ یہ مت کرو" کا محتاج بنا دیتے ہیں۔ بچّہ روتا ہے، تو ماں اس سے رونے کی وجہ دریافت نہیں کرتی، بلکہ اُسے دودھ دے کر خاموش کر دیتی ہے۔ یہ پہلا سبق ہوتا ہے، جو بچّے کو ضد کی ترغیب دلاتا ہے۔ کچھ بڑا ہو کر جب یہ بچّہ ضدّی بن جاتا ہے، تو ماں اور باپ ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ سے کام لیتے ہیں، یعنی ایک مرض کا علاج اس سے زیادہ مہلک مرض میں مبتلا کر دینے سے کیا جاتا ہے۔ مدرسے میں داخل ہونے سے پہلے اکثر بچّے ماں باپ کے استبداد کا نشانہ بن چکتے ہیں اور مدرسے میں آ کر مستبد ماحول میں کام کرنے والے اُستادوں کے زیرِ سایہ مزید استبداد کے تختۂ مشق بنتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ ایسے طلبہ جب کبھی آزادی پائیں گے، تو آزادی کے صحیح استعمال سے ناواقف ہونے کے باعث، اس آزادی کا ناجائز استعمال کریں گے، یعنی وہ ایک حد تک آزادی اور غیر ذمّے داری میں تمیز اور تفریق نہ کر سکیں گے۔ اُن میں بھلے اور بُرے، صحیح اور غلط میں تمیز کرنے کی صلاحیت بہت کم ہوگی۔ اُن کی قوّتِ ارادی بہت حد تک کمزور ہو چکی ہوگی۔ ان میں عزّتِ نفس اور بہادری کم، چاپلوسی اور ظلم کوشی زیادہ جلوہ گر ہو جائیگی۔

یہ بچّے بڑے ہو کر، قوم کا بوجھ کس طرح اپنے کندھوں پر سنبھال سکیں گے اور کیا ہم مدرّسین آنے والی نسل کی کوتاہیوں کے ذمّے دار نہ ٹھیرائے جائیں گے۔ بیشک ہم قصوروار ہونگے۔ اگر دیکھتے بھالتے اور جانتے بوجھتے ہم اس امر کی انتہائی کوشش نہ کریں کہ ہمارے

آج کے شاگرد، جو کل کے کارزارِ حیات کے جانباز سپاہی ہیں، ان عیوب سے پاک رہ سکیں۔

چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما ــــــــــــ

امریکہ اور دیگر متمدّن ممالک نے اکثر جگہ ایسے مدارس کھولے ہیں، جہاں بچے کم از کم دن کے بارہ گھنٹے موجود رہتے ہیں، یعنی ماں باپ کے استبداد کا بڑی حد تک خاتمہ کر دیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ خود ایک ایسے انتظام اور دستور کے پابند ہو گئے ہیں۔ جس میں استبداد کو دخل نہیں۔ ہماری نگاہوں میں گھر کا مفہوم کچھ اور ہے اور مدرسے کا مفہوم کچھ اور۔ کتاب کچھ اور ہے، کھیل کچھ اور۔ اِن مدارس میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ مدرسہ اور گھر ایک ہو جائے سبق اور کھیل کا فرق مٹ جائے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ بچّے کی زندگی سے استبداد حرفِ غلط کی طرح مٹ گیا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے لیے یہ مواقع اور اسباب مہیّا نہیں۔ لیکن یہ ہر وقت ممکن ہے کہ ہم اپنا ذاتی اور شخصی طرزِ عمل بدل دیں اور انتہائی کوشش کریں کہ ہمارے مدرسے جیسے کچھ بھی ہوں، ہم ان میں سے استبداد اُٹھا دیں اور ایسا ماحول پیدا کریں کہ جس میں پلنے بڑھنے والی نسلیں ہمارے لیے باعثِ فخر و مباہات ہوں۔

انشاء اللہ کسی آئندہ فرصت میں ان اسباب کی مزید تشریح کی جائیگی۔

۵

وارد ھا کمیٹی کی رپورٹ

از

مقبول بیگ بدخشانی، بی۔ اے سینٹرل ماڈل اسکول، لاہور

تیسرا باب

معلّموں کی تربیّت

اس اسکیم کو کامیاب بنانے کے لیے بڑی ضروری بات یہ بھی ہے کہ معلّموں کی تربیت ٹھیک ہوئی ہو۔ حالات اوسط درجے کے ہوں، تو کہا جاسکتا ہے کہ جتنے معلّم اچھے ہونگے، اُتنا ہی تعلیم کا معیار اُونچا ہوگا اور جب حالات ایسے ہوں کہ تعلیم کے سارے نظام ہی کو بدل دینے کی ضرورت محسوس ہو، تو معلّموں کی ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ یہ معلّم نئے تعلیمی اور سماجی خیالات سے آگاہ ہوں اور اسکیم کو کامیاب بنانے کے لیے پرشوق اور پرجوش طریقے سے کام کریں۔

چونکہ انھیں بچّوں کو تعلیمی مضمون بھی پڑھانا ہیں اور ان کے علاوہ دستی کام بھی سکھانا ہیں، اس لیے ان کی اپنی تربیت اس صورت سے ہونا چاہیے کہ اُنھیں خاص خاص بنیادی دستکاریوں میں بھی اچھی خاصی مہارت حاصل ہو۔

ہمارے معلّموں کا تعلیم دینے کا طریق بہت کچھ مختلف ہوگا۔ مختلف مضمونوں کو وُہ الگ الگ سمجھ کر نہیں پڑھائینگے، بلکہ پڑھاتے وقت ان کے ذہن میں یہ خیال ہوگا کہ یہ سارے کے سارے مضمون ایک ہی بڑے مضمون کا حصّہ ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ

بہت قریب کا تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ معلموں کو ایسی تربیت دی جائے کہ وُہ خود منصوبے سوچ سکیں اور ایسی اسکیم تیار کر سکیں، جس میں سارے مضمون ایک دوسرے سے خاص ربط و علاقہ رکھتے ہوں اور گویا یوں وہ علم، زندگی اور روزمرہ کے کام کاج کو ایک ہی رشتے میں پرو دے سکیں۔

ضروری ہے کہ یہ معلّم زندگی اور زندگی کے مشغلوں میں خاص دلچسپی رکھتے ہوں اور جو تعلق ہمارے اسکول کو ہماری سماج سے ہے، اس سے بھی پوری پوری واقفیت رکھتے ہوں۔ اگر ہم چاہیں کہ اسکیم کامیابی کے ساتھ چل نکلے، تو ہمیں ان باتوں پر زور دینا ہوگا۔ لیکن اس کے علاوہ معلموں کی تربیت کے نصاب میں بعض اور مضمونوں اور مہارتوں کی بھی ضرورت ہے ——

کسی تربیت گاہ میں داخل ہونے کے لیے ضروری شرط یہ ہونا چاہیے کہ طالب علم دسویں جماعت کسی قومی اسکول یا کسی سرکاری مدرسے سے پاس کر چکا ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ورنیکلر مڈل یا اس کے برابر کا کوئی اور امتحان پاس کرنے کے بعد کسی اسکول میں بچّوں کو پڑھانے کا کم سے کم دو سال کا باقاعدہ تجربہ رکھتا ہو۔

معلموں کی تربیّت کا پورا کورس

عرصہ تربیّت —— تین سال

(۱) ا۔ کپاس بونا، چننا، بیلنا، دُھننا (یا اُون کا دُھننا) سوت کاتنا اور تانا بننا۔

ب۔ چرخہ چلانے کا کام یا اور دوسرے ہتیاروں کا استعمال جو اس بنیادی دستکاری میں کام آسکیں۔

ج۔ دیہات کی صنعتوں کا اقتصادی علم —— خاص طور پر ان صنعتوں کا اقتصادی علم، جو

اسکول کے کام کے لیے چُنی گئی ہوں۔

د۔ بڑھئی کا ابتدائی کام، جس سے اس چُنی ہوئی دستکاری سے واسطہ پڑتا ہو۔

(۲) نیچے لکھی ہوئی صنعتوں میں کسی ایک کی تربیت۔

ا۔ سوت کاتنا اور بننا۔

ب۔ زراعت۔

ج۔ سبزی کی کاشت اور بیل بوٹے لگانا۔

د۔ چمڑے کا کام۔

ہ۔ کھلونے بنانا۔

ز۔ بڑھئی کا کام۔

ح۔ کاغذ بنانے کا کام۔

یا کوئی دوسرا دستی کام جو کسی خاص جگہ کے حالات کے مناسب ہو۔

(۳) تعلیم کے اصول میں نیچے لکھی ہوئی باتیں شامل ہونا چاہییں۔

ا۔ دستی کام کے ذریعے تعلیم کرنے کا بنیادی خیال۔

ب۔ درسگاہ کا سماج کے ساتھ تعلق۔

ج۔ بچے کے ذہنی حالات کا سادہ سا خاکہ۔ (اس میں جہاں تک ممکن ہو، ایسے واقعات کو نظر کے سامنے رکھیں، جو تجربے اور مشاہدے میں آسکیں)۔

د۔ پڑھانے کے طریقے، جن کو خاص طور پر منصوبے تیار کرنے اور ان پر عمل کرنے سے تعلق ہو۔

ہ۔ نئی تعلیم کے مقصد اور مجلسی زندگی کے اصلی حالات کی روشنی میں ان کا مطالعہ۔

(۴) نفسیات، صحت، صفائی اور اخلاق کے علوم کا خاکہ، جن کا ہماری روزمرہ کی زندگی کے ساتھ قریب کا تعلق ہے۔

(۵) سماجی تعلیم کے بنیادی نصاب میں ضرورت کے موافق ترمیم اور ان پر عمل کرنا تاکہ معلم یہ سمجھ سکیں کہ وہ اپنے آپ کو مجلسی حالات کے موافق کیونکر ڈھال سکتے ہیں۔ اس کے بعد پچھلی سی نظر ڈالنا چاہیے کہ گزرے ہوئے پچاس سالوں میں ہندوستان اور ہندوستان کی باہر کی دنیا کے حالات کیسے رہے۔

(۶) مادری بولی میں نصاب کا مطالعہ۔ تاکہ اس کے ذریعے معلّم اپنے ملک کے ادبی اور فنی شاہکاروں سے اچھی طرح واقف ہو جائیں اور عام تہذیب کی بنیاد کو جان سکیں۔

(۷) ہندوستانی کی تعلیم۔ ملک کے ہر حصّے کا معلّم، چاہے وہاں ہندوستانی بولی جاتی ہو یا نہیں، ہندی اور فارسی رسم الخط پڑھ سکے اور لکھ بھی سکے۔ اگر ہم چاہیں کہ اس تعلیم کے بنیادی، تہذیبی اور سماجی مقصد ہمیں حاصل ہو سکیں، تو ہندوستانی کی تعلیم ہر اسکول میں لازمی ہونا چاہیے۔ اسکول چاہے سرکاری ہو یا غیر سرکاری، لیکن سرکار سے مدد یافتہ ضرور ہو۔

(۸) تختۂ سیاہ پر لکھنا اور خط لگانا۔

(۹) بدن کی تربیت۔ ڈرل اور اپنے ہاں کی کھیلیں۔

(۱۰) تربیت گاہوں سے ملحقہ اسکولوں میں جا کر اُستادوں کی نگرانی میں پڑھانا اور تجربہ حاصل کرنا۔

ہم چاہتے ہیں کہ معلّموں کی ان تربیت گاہوں کے ساتھ بورڈنگ ہاؤس بھی ہوں، جہاں طلبہ اور معلّم ساتھ ساتھ رہتے ہوں۔ سماجی اور تمدّنی زندگی کی نشو و نما مل جُل کر کرنا چاہیے تاکہ معلّموں کو ذاتی دلچسپیوں کو ظاہر کرنے کا موقع ملتا رہے۔

ہم ان تربیت گاہوں کے اسٹاف کے ممبروں کی توجہ اس امر کی طرف دلاتے ہیں کہ اپنے یہاں مختلف قسم کے مشغلے اور مجلسی تفریحیں جاری کریں تاکہ تربیت پانے والے یہ معلم اپنے فراغت کے وقتوں میں ان میں حصّہ لے سکیں۔ ایسی تربیت گاہوں کی کامیابی کا معیار یہ ہوگا کہ وہاں مشغلے اور مجلسی تفریحیں عام ہو جائیں اور ہونے والے معلم ان میں دلی شوق سے حصّہ لیں اور بعد میں ان کا اثر اسکولوں اور سماج کی زندگی پر خوش گوار پڑے۔

ظاہر میں یہ نصاب کچھ زیادہ معلوم ہوگا اور بعض لوگ یہ بھی خیال کریں گے کہ اس میں دعوے بہت کیے گئے ہیں، جو عمل میں نہیں آسکتے۔ ہم اس قسم کے خیالات کو دور کر دینا چاہتے ہیں۔ اگر پورے ارادے کے ساتھ کام کیا جائے، تو یہ کورس خوش اسلوبی کے ساتھ ختم ہو جا سکتا ہے۔ اوّل ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ مسلسل تین سال کا نصاب ہے۔ اس لیے ہم اس کے لیے زیادہ بہتر خاکہ تیار کر لے سکتے ہیں۔ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ خاکہ ہماری موجودہ صورت حال سے زیادہ اچھا ہوگا۔ دوسرے ہمیں اُمّید ہے کہ چند ہی سالوں کے بعد جب یہ اسکیم اچھی طرح سے چل نکلے، تو ہمارے طالب علم بھی ان نئی درسگاہوں سے تعلیم پا چکے ہونگے اور دستی کام اور سماجی تعلیم میں کافی دسترس حاصل کر لی ہوگی۔ ان مرحلوں کو طے کر کے معلّمی کی تربیت پانے کے لیے تربیت گاہ میں آئیں گے۔ یہاں اُنھیں کوئی مشکل نظر نہ آئیگی۔ یہاں اُنھیں وہی چیزیں سیکھنا ہیں اور اُنھی میں پیشہ ورانہ مہارت حاصل کرنا ہے، جنھیں وُہ پہلے سے سیکھ آئے ہیں۔ تیسرے ہم پھر اس بات پر زور دینگے۔ یہ ہمارا مقصد ہرگز نہیں کہ ان فنوں کی نہایت باقاعدہ اور خاص علمی روشنی میں تعلیم دی جائے (اس صورت میں یہ ضرور ہی خیالی اور نظری ہو جائیگی اور اس لیے مشکل بھی) بلکہ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ جو باتیں شہریت، صحت صفائی، زخمیوں کی امداد اور بچّوں کے رویّے سے تعلق رکھتی ہوں

اور جو علمی مسئلے ہمارے اسکولوں میں یا سماجی زندگی کے روزمرہ میں پیش آئیں، وہ انھیں سکھا دیے جائیں۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ تربیت پانے والے معلّموں کے دل میں اگر پیشہ ورانہ برتری کا خیال پیدا ہو جائے اور ان کی عملی دلچسپی حرکت میں آجائے، تو ان میں کئی معلّم نجی طور پر خاص خاص مضمونوں کا علمی صورت میں بھی مطالعہ شروع کر دینگے اور ان سے زیادہ سے زیادہ واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کرینگے، لیکن جہاں تک معلّموں کے تین سالہ عرصے کا تعلق ہے، ہم نہیں چاہتے کہ تعلیمی اعتبار سے انھیں علّامہ بنا دیں، بلکہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ ذہین، تعلیم یافتہ اور ہوشیار صنّاع پیدا کریں، جو ذوقِ سلیم رکھتے ہوں۔ قوم کی خدمت کے لیے کمربستہ رہیں اور آنے والی نسلوں کی دستگیری کے لیے تیار رہوں تاکہ وہ اس اسکیم کی قدر و قیمت کو ٹھیک ٹھیک پہچان سکیں۔

معلّموں کی تربیت کا چھوٹا نصاب

ہم اس اسکیم کو جلد سے جلد شروع کر دینے کیلیے سفارش کرتے ہیں کہ معلّموں کو سال بھر کا ایک چھوٹا نصاب شروع کرا دیا جائے، جو ہمارے موجودہ اسکولوں، قومی درسگاہوں اور آشرموں کے حالات کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا ہو۔ اس کے لیے وہی لوگ چُنے جائیں جنھیں بچّوں کو پڑھانے کا یا بنیادی کام سکھانے کا تجربہ ہو اور وعدہ کریں کہ دل اور دماغ کی پوری توجہ کے ساتھ اس اسکیم کو چلائیں گے۔ معلّموں کی تعداد، ان اسکولوں کی تعداد کی نسبت سے مقرر ہونا چاہیے، جو شروع میں کھولے جائیں۔

معلّموں کی تربیت میں ذیل کی باتیں شامل ہونا چاہییں :-

۱۔ روئی دُھننا، تکلے سے سوت کاتنا۔ بنیادی دستکاری چاہے وہ اپنے لیے کوئی سی چُن لیں، لیکن اس کا اختیار کرنا ہر ایک کے لیے لازمی ہوگا۔

ب۔ جن بنیادی دستکاریوں کا ہم اُوپر ذکر کر چکے ہیں، ان میں کسی ایک میں مہارت حاصل کرنا تاکہ بچوں کو اس دستکاری میں کم سے کم تین سال کی ابتدائی تعلیم دے سکیں۔

ج۔ جسم کے علم، صحت و صفائی اور خوراک کے علم کا مختصر سا نصاب۔

د۔ دستکاری کے اسکول کا بنیادی خیال اور سماج کے ساتھ اس کا تعلق۔

ہ۔ مختلف مضمونوں کی سلسلے وار تعلیم دینے کے لیے سادہ سادہ کاموں کے منصوبے تیار کرنا اور ان کے مطابق عمل کرنا۔

و۔ ہندوستانیوں کی بیداری کے مختصر تاریخی سبق اور موجودہ صدی کی تحریکوں کے مختصر حالات۔

ز۔ اسکول میں جائزہ اُستادوں کی دیکھ بھال میں کم سے کم پچیس سبق پڑھانا۔

چوتھا باب

نگرانی اور امتحان

۱۔ نگرانی ——————

نئے اسکولوں کے لیے جتنی ضرورت اچھے تربیت یافتہ معلموں کی ہے، اتنی ہی ضرورت لائق اور ہمدرد نگرانی کرنے والوں کی بھی ہے۔ نگرانی بڑی مہارت کا کام ہے، اس لیے ہم سفارش کرتے ہیں کہ نگرانی کرنے والوں کی تربیت کا بھی خاص انتظام کیا جائے تاکہ یہ ہمارے اسکولوں کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں پر غور کرتے رہیں۔ ہماری رائے میں نگران کا کام سرانجام دینے کے لیے کم سے کم یہ خصوصیت ہونا چاہیے کہ اُس نے کسی بنیادی اسکول میں تعلیم دینے کا تجربہ حاصل کر لیا ہو۔ نگرانی صرف معائنہ کر لینے تک محدود نہ ہونا چاہیے، بلکہ نگرانی کا مقصد یہ ہے

کہ معلموں کے ساتھ مل جل کر کام کیا جائے۔ اپنے تجربے اور قابلیت سے انھیں مدد دی جائے۔ تعلیم کے تجربوں میں نگران کا کام ایک لیڈر اور رہنما کا کام ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ نگرانی اور رہنمائی کے ذریعے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائیں، تو ضروری ہے کہ نگرانی کے انتظامی اور دفتری روزمرّہ کا بوجھ ہلکا کر دیں۔ نگرانوں کی تعداد کافی ہو اور نگرانی کے جو علاقے مقرر کیے جائیں، اتنے بڑے نہ ہوں کہ ان کی دیکھ بھال بھی آسانی کے ساتھ نہ ہو سکے۔ اس سے خرچ تو ضرور بڑھ جائیگا، لیکن اگر اس میں بچت کرنے کی کوشش کی گئی، تو یہ بچت نقصان کا موجب ہوگی۔

ب۔ امتحانات ــــــ

ہمارے ملک میں امتحانوں کا جو طریق رائج ہے، وہ تعلیم کی بربادی کا موجب ہے۔ امتحانوں کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اس لیے تعلیم کا چہرہ اور بھی مسخ ہو گیا ہے۔ ماہرین تعلیم کا خیال ہے کہ طلبہ کے کام کی الگ الگ جانچ یا سارے اسکول کے کام کاج کی جانچ کرنے کے لیے موجودہ طریق امتحان ناقص اور ادھورا ہے۔ اس سے بچے کی قابلیت کی ٹھیک ٹھیک جانچ نہیں ہوتی اور جو تھوڑی بہت ہوتی بھی ہے، اس کے پیش نظر بچے کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہم اس بات کا خیال رکھیں گے کہ قومی تعلیم کو امتحان کے اس زہریلے اثر سے بچالیں۔

قابلیت کی جانچ کا مقصد اس صورت سے بھی پورا کیا جا سکتا ہے کہ تعلیمی بورڈ کے انسپکٹر صاحبان حلقہ وار کچھ بچوں کو چن کر ان کے گروہ بنالیں اور نمونے کے طور پر ان کی قابلیت کا خاص اہتمام کے ساتھ اندازہ کرلیں، اس سے سارے اسکول کی لیاقت کا اندازہ ہو جائیگا، لیکن جانچ کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا جائے کہ نصاب تیار کرنے والے ماہرین کو ساتھ لے لیا جائے تاکہ نصاب پر نظر ثانی بھی ہو سکے۔ یہ امتحان کافی لمبے ہونا چاہییں تاکہ

نصاب کی کوئی چیز نظر انداز نہ ہو جائے۔ جانچ کے نمبر، طلبہ کی ذاتی رائے کو پیشِ نظر رکھ کر نہیں، بلکہ عام اصول کے موافق دینا چاہییں۔

نمونے کے طور پر امتحان لینے کا طریق جاری ہو جائے، تو اس سے اسکول کی قابلیت بڑھ جائیگی اور آخری جماعت کے چھ ہفتے کا وقت بچ جائیگا۔ یہ وقت عام طور سے لکھے ہوئے نوٹوں کو رٹنے اور سبقوں کو دہرانے میں صرف ہوا کرتا ہے۔ اس وقت سے ہم یہ کام لے سکتے ہیں کہ ہر طالب علم کی بنیادی دستکاری کی مہارت کا آہستہ آہستہ سے اندازہ کرتے رہیں۔ دیہات کے رہنے والوں کی بہتری کے لیے جو مضمون پڑھائے جاتے ہیں، ان کی جانچ زیادہ غور اور توجہ کے ساتھ ہونا چاہیے۔ ایک درجے سے دوسرے درجے میں ترقی دینے کے لیے اس ریکارڈ کو دیکھا جائیگا، جو طلبہ کے سال بھر کے کام کاج کو پیشِ نظر رکھ کر تیار کیا گیا ہوگا۔ سارے اسکول میں قابلیت کے خاص معیار کو قائم رکھنے کے لیے تعلیمی بورڈ کو چاہیے کہ سال بہ سال ہر درجے کے فریقوں میں چند طلبہ کو چن لیں اور نمونے کے طور پر ان کی جانچ کریں۔ لیکن جہاں تک ممکن ہو، یہ خیال رہے کہ کسی لڑکے سے جماعت کا پورا کام یا اس کام کا بڑا حصّہ دوبارہ نہ کرایا جائے۔ اگر کسی ایک جماعت میں طالب علم زیادہ تعداد میں ناکام رہیں، تو اس جماعت کے اُستاد کے کام پر نظر رکھنا چاہیے، لیکن اگر سارے اسکول کا یہی حال ہو، تو اسکول کے انتظام پر توجہ دینا چاہیے اور اگر تمام اسکولوں کا یہی حال ہو، تو سمجھنا چاہیے نصاب میں کوئی خرابی ہے اور وہ معیار درست نہیں، جو دوسرے درجوں میں ترقی دینے کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ اس کے لیے کوئی تدبیر سوچنا چاہیے۔ یہ بات تو کسی صورت میں درست نہیں کہ ایک ہی جماعت کے لڑکے اسی جماعت میں دوسری بار تعلیم حاصل کریں۔

تعلیمی بورڈ کو اسکول کی قابلیت کی جانچ ان نمونوں کے ذریعے کرنا چاہیے، جن کا

اُوپر ذکر آچکا ہے اور بچّوں اور معلّموں کے اس کام کے ذریعے بھی، جو وہ گاؤں کے لوگوں کی زندگی سدھارنے کے لیے انجام دیں۔ ضلع وار اسکولوں کے کاموں کی سالانہ نمائش کی جائے، تو اُس سے قابلیت کا معیار حاصل کرنے میں بڑی مدد ملیگی۔

پانچواں باب

انتظام

۱۔ تعلیم کے مقصد، دوسرے باب میں لکھے جاچکے ہیں، ان کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ طلبہ اسکول میں سات سال تک تعلیم پائیں۔ گہری سوچ اور فکر کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بچّے سات برس کی عمر کے ہوجائیں، تو انھیں لازمی تعلیم شروع کرا دینا چاہیے۔ ہم نے اس اصول کو تسلیم کرلیا ہے کہ بنیادی دستکاری جہاں تک ممکن ہو، ہر ایک کے لیے ایک ہی ہونا چاہیے۔ اس لیے ہم سفارش کرتے ہیں کہ تمام ان بچّوں اور بچّیوں کے لیے، جن کی عمر سات سال سے چودہ سال تک کی ہو، تعلیم لازمی قرار دی جائے اور ان سے کسی قسم کی فیس نہ لی جائے۔ لڑکیوں کے لیے اس قدر رعایت رکھی جائے کہ اگر ان کے سرپرست چاہیں تو بارھواں سال پورا کرنے کے بعد انھیں اسکول سے ہٹالیں۔

۲۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ لازمی تعلیم کے لیے جو سات سال کی عمر مقرر کی گئی ہے، اس سے گویا ہم نے بچّوں کی زندگی کا اوّلین حصّہ نظر انداز کر دیا ہے۔ ان کی یہ زندگی یقیناً ناموافق حالات میں گزریگی۔ وہ پست اور تاریک مکانوں میں رہیں گے۔ عام طور سے ان کی پرورش اور نگرانی ایسے لوگوں کے ہاتھ ہوگی، جو علم سے جاہل محض اور بچّوں کی تربیت سے بالکل غافل ہیں اور جو دو وقت پیٹ بھرنے کے لیے سارا وقت ناقابلِ برداشت مشقت میں

لگے رہتے ہیں اور اس صورت میں کہ انھیں کسی دوسری چیز کا ہوش نہیں ہوتا۔ ہمیں اس ضرورت کا پورا پورا احساس ہے کہ حکومت تین سال سے سات سال کے بچّوں کی تربیت کے لیے کوئی اچھا انتظام کر دے، لیکن ملک کی بد حالی کو دیکھتے ہوئے ہم یہ سفارش نہیں کر سکتے، لیکن جب بھی ہم یہ ضرور بتا دینا چاہتے ہیں کہ اس بارے میں حکومت اپنی ذمے داری کو بھول نہ جائے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر اس بنیادی اسکیم پر جو پیش کی جا رہی ہے اور جس کو ہماری گھریلو زندگی سے بہت قریب کا تعلق ہے، پورا پورا عمل کیا گیا، تو یہ کامیابی کے ساتھ چلنے لگیگی اور بچپن کی تربیت کے لیے بہت اچھے اسباب پیدا ہو جائیں گے۔ اس سے بالغوں کو بھی تعلیم دینے میں خاصی مدد ملیگی، جس کی طرف ہمیں بہت جلد توجہ دینا ہوگی۔

۳۔ جو وقت نصاب کے مختلف مضمونوں کو پڑھانے میں درکار ہیں، اس کا اندازہ ہم نے دینے کی کوشش کی ہے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس کے لیے ذیل کی تقسیم درست ہوگی۔

بنیادی دستکاری	تین گھنٹے
موسیقی، ڈرائنگ، ریاضی	چالیس منٹ
سماجی مطالعہ اور عمومی سائنس	چالیس منٹ
کسرت	دس منٹ
تفریح	دس منٹ
کل وقت	پانچ گھنٹے اور تیس منٹ

اس اندازے کو تیار کرتے وقت ہمارے پیشِ نظر سوت کاتنا اور سوت بُننا، گویا صرف وہی بنیادی دستکاریاں تھیں، لیکن اگر کوئی اَور دستکاری اختیار کی جائے، تو اُس کے لیے وقت مختلف ہو سکتا ہے، لیکن کسی دوسری بنیادی دستکاری کو اس سے

زیادہ وقت نہ ملنا چاہیے، جس کا ذکر کردیا گیا ہے۔

اسکول کو سال بھر میں کم سے کم ۲۸۸ دن کام کرنا چاہیے، یعنی مہینے میں چوبیس دن اوسطاً۔

۴۔ چونکہ بچّوں کے مزاج اور ان کی دلچسپیاں مختلف ہوتی ہیں، اس لیے اس اختلاف کا لحاظ رکھتے ہوئے ہم سفارش کرتے ہیں کہ مختلف قسم کی دستکاریاں جاری کی جائیں۔ آخری دو جماعتوں میں تو ضرور ہی ایسا کوئی انتظام ہونا چاہیے۔

۵۔ ہماری رائے ہے کہ ہر اسکول کے ساتھ کافی کھلا زمین کا قطعہ ہو، جس میں ایک باغ اور کھیل کے لیے ایک میدان بن سکے۔

۶۔ تحقیق سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ کھانے کو بُری غذا ملے۔ تو دماغی حالت بھی پست ہوتی ہے۔ دماغی پستی اور غذا کو گویا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ دیہات کے بچّوں کی غذا عام طور سے اچھی نہیں ہوتی، اس لیے ہم سفارش کرتے ہیں کہ تمام بچّوں کو اسکول میں ایک ناشتا دیا جائے۔ گویا یہ کمی اس صورت سے پوری ہو جا سکتی ہے۔ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس کام پر جو خرچ اُٹھیگا، اُسے پورا کرنے میں عام لوگ بھی حکومت کا ہاتھ بٹائینگے۔

۷۔ جہاں تک معلموں کی تنخواہوں کا تعلق ہے، ہم بھی گاندھی جی کی تائید کرتے ہیں، یعنی اگر ممکن ہو، تو پچیس روپے تک ہوں۔ بیس روپے سے کم کسی صورت میں نہیں ہونا چاہییں، لیکن ہم یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ اُونچی جماعتوں کو پڑھانے کے لیے زیادہ قابلیت کے معلّموں کی ضرورت ہے، اس لیے انھیں زیادہ تنخواہیں ملنا چاہییں۔

۸۔ اس تجربے کے شروع کے دو تین سالوں میں خاص خاص قابلیت کے معلّم رکھے جائیں، چاہے اُنھیں تنخواہیں کچھ زیادہ ہی دینا پڑیں تاکہ انتخاب کیے ہوئے اسکولوں میں نئے

کورس اور نئے طریقِ تعلیم کو خوش اسلوبی کے ساتھ چلا سکیں۔ جب آزمائش کا یہ وقت کامیابی کے ساتھ ختم ہو جائے، تو اُس کے بعد اوسط درجے کے معلّم کے لیے جس نے تربیت گاہ میں تین سال کا نصاب ختم کر لیا ہے، اس کو سنبھال لینا سہل ہو جائیگا۔

۹۔ ہمارا خیال ہے کہ کسی جماعت میں طالب علم تیس سے زیادہ نہ بڑھیں۔ اگر تعداد اس سے زائد ہو گئی، تو وہ اپنے اہم فرضوں کو کامیابی کے ساتھ نہیں نباہ سکیں گے۔

۱۰۔ معلّموں کے انتخاب میں ان کو ترجیح دی جائے، جو مقامی ہوں یا آس پاس کے رہنے والے ہوں۔

۱۱۔ اگر ہم چاہیں کہ عورتیں تعلیم کے پیشے کو اختیار کر لیں، تو اُن کی ہمّت بڑھانے کے لیے ہمیں تربیت کے خاص انتظام کرنا چاہییں۔

۱۲۔ جو طالب علم تربیت کے لیے بھیجے جائیں، ان کے انتخاب میں خاص دیکھ بھال کی ضرورت ہے۔ اس انتخاب کے لیے تمام اصول بھی بنانا چاہییں۔ ہمیں یقین ہے جب تک یہ معاملہ طے نہ کر لیا گیا اسکیم کے کامیاب ہونے کی امید بہت کم ہے۔ تعلیم کرنے کے لیے خاص اخلاقی میلان اور خاص سماجی رجحان کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ بھی بعض خاص صفتیں درکار ہوتی ہیں۔ یہ فرض کر دینا ہرگز درست نہیں کہ جو اپنے آپ کو تعلیمی خدمات کے لیے پیش کر دے، وہ اس کے لائق بھی ہے۔ اس لیے چاہیے کہ ان کے انتخاب میں بڑی احتیاط اور توجّہ سے کام لیں۔ بہتر یہ ہو گا کہ صرف ایسے اشخاص لیے جائیں، جن کی طبیعتوں میں سماجی خدمت کا میلان

موجود ہو۔

۱۳۔ ہم سفارش کرتے ہیں کہ ان تربیت گاہوں کے ساتھ بورڈنگ ہاؤس بھی ہونا چاہییں، جن میں ہر مذہب اور ہر ملّت کے لوگ شامل ہو سکیں۔ ذات پات کی کوئی تمیز نہ ہو۔ کھانا بھی سب ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کھائیں۔

۱۴۔ ان تربیت گاہوں میں دستکاری کے خاص خاص ماہر ملازم رکھے جائیں تاکہ دستکاری میں طلبہ کو اچھی طرح سے تعلیم کر سکیں۔ اس سلسلے میں اگر ضرورت ہو، تو مقامی کاریگروں کی خدمات سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے تاکہ وہ بنیادی دستکاری کے معلّموں کا ہاتھ بٹائیں یا طلبہ کی بنائی ہوئی چیزوں کی، جو فروخت کرنے کے لیے بھیجی جائیں گی، آخری درستی کر لیں۔

۱۵۔ تربیت گاہوں میں ایسے کورس بھی وسیع پیمانے پر شامل کیے جائیں، جن کے وسیلے سے معلّم مختلف وقتوں میں اپنے علم کو تازہ کرتے رہیں۔ ایسے نصاب مختلف قسم کے ہوں۔ پیشہ ورانہ بھی ہوں صنعت و دستکاری سے تعلق رکھنے والے بھی ہوں، اس سے معلّموں کی لیاقت بڑھتی رہیگی۔

۱۶۔ ہر تربیت گاہ کے ساتھ اسکول ہوں، جہاں نئے نئے تعلیم کے طریقوں کا تجربہ کیا جائے۔ ان اسکولوں میں معلّم خاص قابلیت کے رکھے جائیں اور یہ اسکول اردگرد کے اسکولوں کے لیے نمونہ ہوں۔ دوسرے اسکولوں کو موقع دیا جائے کہ یہاں آکر پڑھانے کے طریقوں پر غور کریں اور وہ چیزیں دیکھیں، جو یہاں کے استعمال میں آتی ہیں۔

۱۷۔ بنیادی دستکاری کا جاری کرنا۔ کورسوں کا ایک دوسرے کے ساتھ ربط اور

سلسلہ اور ان کا تعلق انسانی زندگی کے ساتھ۔ عملی کام کے ذریعے تعلیم دینا۔ ذاتی اپج سے کام کرنا۔ سماجی ذمّے داریوں کا خیال پیدا کرنا۔ یہ گویا نئی اسکیم کے مقصد ہیں۔ یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتے ہیں کہ طلبہ اور معلّموں ــــــــ بالخصوص معلّموں کو ایسی کتابیں مہیّا کی جائیں، جو ہمارے مقصد کو حاصل کرنے میں مدد دیں۔ تصویر دار کتابیں، فنِ تعلیم سے تعلق رکھنے والی خاص کتابیں اور مضمونوں میں باہمی ربط پیدا کرنے والے پروگرام تیار کرنا بہت ضروری ہیں۔ درسی کتابیں نئے سرے سے تصنیف ہونا چاہییں۔ جن میں ضرورت کے مناسب روح ڈالی جائے۔ صوبوں کے تعلیمی بورڈ اور قومی تعلیم کی مرکزی درسگاہ بھی جس کے قائم کرنے کی نیچے سفارش کی گئی ہے، اس سلسلے میں بہت کچھ مفید خدمتیں انجام دے سکتی ہے۔ جو جو صوبے اسکول جاری کرنے کا ارادہ کریں، وہی جلد از جلد ان کتابوں کی تصنیف اور ضروری سامان کی تیاری کا بھی خاطر خواہ انتظام کریں۔

۱۸۔ امتحان کے باب میں ہم بتا چکے ہیں کہ اسکول کی قابلیتوں کی جانچ پڑتال ہر صوبے کے تعلیمی محکمے کے ذمّے ہوگی۔ ہم سفارش کرتے ہیں کہ ہر صوبے کا تعلیمی بورڈ درسی حصّے کے لیے ایسے معلّم مہیّا کرے، جو تعلیم میں خاص مہارت رکھتے ہوں اور خاص علمی طریق پر تحقیق کریں تاکہ اسکول کے نصاب کو روزمرّہ کی زندگی کے موافق ڈھال سکیں۔ معلّموں کو مدد دیں کہ وہ قابلیت پیدا کرنے والے نئے قاعدے استعمال کر سکیں۔ تعلیمی بورڈ کا یہ کام بھی ہوگا کہ ترقی یافتہ طریقوں کا تجربہ کریں اور معلّموں کو ایسے ذریعے بہم پہنچائیں کہ وہ ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے تعلیمی تجربوں سے باخبر رہ سکیں اور معلّموں اور نگرانوں کی تربیت میں بھی رہنمائی کریں۔

۱۹۔ ہم یہ بھی سفارش کرتے ہیں کہ ان سرکاری بورڈوں کے علاوہ ہندوستانی

تعلیم کی ایک غیر سرکاری مرکزی درسگاہ بنائی جائے، جس پر انتظام کی ذمّے داری نہ ہو اور اس میں ایسے معلّم شامل ہوں، جو تعلیم کے میدان میں اور دوسرے تمدّنی حلقے میں کافی نام پا چکے ہوں۔ اس درسگاہ کے مقصد یہ ہونا چاہییں :-

(الف) تعلیم کی پالیسی اور تعلیمی کام میں مشورہ دینا۔

(ب) تعلیم کے سلسلے میں جو کوششیں ہندوستان یا ہندوستان سے باہر ہو رہی ہیں، ان کے متعلق بحث کرنا اور اپنے مطالعہ اور بحث کے نتیجوں سے ان سب لوگوں کو مطلع کرنا، جو تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

(ج) ہندوستان کے مختلف صوبوں، ریاستوں اور دوسرے ملکوں میں جو تعلیمی کام ہو رہے ہیں، ان سے باخبر رہنا اور ان کے متعلق اطلاعیں حاصل کرنا۔

(د) تعلیم سے تعلق رکھنے والے مسائل کی تحقیق کا انتظام کرنا۔

(ہ) تعلیمی کارکنوں کے لیے رسالے اور میگزین شائع کرنا۔

۲۰۔ اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ عام لوگوں کی بہتری کے مختلف محکمے جنھیں ہونے والے شہریوں کے لیے کام کرنا ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ کوئی ربط و تعلق نہیں رکھتے۔ ہم سفارش کرتے ہیں کہ تعلیم کے محکمے کے لیے ایسے مواقع بہم پہنچائے جائیں کہ وہ صحت، زراعت، تعمیرات، امدادِ باہمی، بلدیات غرض کہ دوسرے محکموں سے مل کر کام کر سکے اور ہمارے اسکول، صحت مند، خوشحال اور لائق قوم کی تعمیر کر سکیں۔

مدرسوں میں فنونِ لطیفہ کی تعلیم

از
مرزا سجّاد حسین، آرٹ ماسٹر، ٹریننگ کالج، مسلم یونیورسٹی

(گزشتہ سے پیوستہ)

ڈرائنگ ماسٹر اور شاگرد

ہندوستان میں تعلیمی اداروں میں آرٹ کیا حیثیت رکھتا ہے، اس کا ذکر شروع میں تمہیداً اختصار کے ساتھ کیا جاچکا ہے۔ قبل اس کے کہ اس فن کے دیگر مدارج ضابطۂ تحریر میں لائے جائیں، مناسب ہوگا کہ اُس کی کچھ اور تفصیل کی جائے۔ ممالک متّحدہ آگرہ و اودھ میں ڈرائنگ ماسٹروں کو دو سال کی تعلیم کے بعد سند دی جاتی ہے۔ وہ لوگ اس امتحان کے لیے منتخب کیے جاتے ہیں، جن کا انٹرنس کے امتحان میں اختیاری مضمون ڈرائنگ ہوتا ہے۔ ان کے لیے جو نصابِ تعلیم مقرر ہے، وہ بھی دقیانوسی اصول پر مبنی ہے۔ مثلاً جیومیٹری کے مجسّمات (Geometrical solids) کی شکلیں مختلف زاویوں سے بنانا اور جس طرح ہمیں اشیا نظر آتی ہیں، اسی طرح ان کی تصویر کھینچنے (Perspective) کے قاعدے بتانا، جو ان شکلوں کے بنانے میں عمل میں آتے ہیں۔ (Free Arm Drawing) اس کی مشق اس طرح سے ہوتی ہے کہ یا تو کوئی نقشہ آئندہ ہونے والے ڈرائنگ ماسٹروں کے سامنے لٹکا دیا جاتا ہے اور وہ اُس کی نقل چھوٹے یا بڑے پیمانے پر کرتے ہیں یا درجے کا ماسٹر تختۂ سیاہ پر کوئی شکل جس کی بنا جیومیٹری کے قاعدے سے مرتّب ہوتی ہے، کھینچ دیتا ہے۔ معمولی قسم کی

چیزیں مثلاً میز، کرسی، اسٹول، برتن وغیرہ بھی بنوائے جاتے ہیں۔ اگر پھولوں اور مختلف قسم کے پودوں کی مشق کروا دی، تو گویا ہدف پر تیر مارا۔ خاکوں کی مشق برائے نام ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ طالب علم (آئندہ ہونے والے مدرّس) اپنی ہائی اسکول کی آٹھ دس سال کی ناقص تعلیم کے دوران میں جدّت، تخیل اور صبر کی خداداد قوتیں کھو چکے ہوتے ہیں۔ اس وقت تو اُن کی کوشش محض یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح وُہ امتحان میں کامیابی حاصل کریں اور برسرِ روزگار ہو جائیں۔ اگر درجے کا ماسٹر چاہے بھی کہ اس سلسلے میں اُن سے کچھ کام لے، تو یہ اُس کے امکان سے باہر ہوتا ہے۔ فری ہینڈ ڈرائنگ کی بابت لوگوں کو عجیب قسم کی غلط فہمی ہے۔ کوئی شکل جو کاغذ پر چھپی ہُوئی ہو اور طالب علم اُس کو بغیر کسی آلے کی مدد کے دوگنی یا تین گنی بڑی بنائے، اُس کو فری ہینڈ ڈرائنگ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے حالانکہ فنِ مصوری میں ہر قسم کا کام، جو آزادانہ کیا جائے، اس نام کا مستحق ہے۔ ڈرائنگ ماسٹروں کی، رنگوں کے استعمال کی تعلیم بھی ناقص ہوتی ہے۔ ان کو عملی جامیٹری بھی پڑھائی جاتی ہے۔ یہ ہے موجودہ ڈرائنگ ماسٹروں کی تعلیم کا لب لباب۔ صرف یو پی ہی میں یہ حالت نہیں ہے، بلکہ ہندوستان کے ہر گوشے میں یہی پرانا طرزِ تعلیم جاری ہے۔ مثال کے طور پر احاطۂ بمبئی میں انٹرمیڈیٹ گریڈ کا ایک امتحان ہوتا ہے۔ محکمۂ تعلیم کے ذمّے دار لوگ ہر اُس شخص کو جو یہ امتحان پاس کرلے، ڈرائنگ ماسٹر ہونے کے قابل سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ امتحان برائے نام سی چیز ہے۔ ہر کس و ناکس بغیر کسی اسکول میں داخل ہُوئے یہ امتحان دے سکتا ہے۔ ہم نے کئی اشخاص کو جنھیں اس فن سے ذرّہ برابر بھی مس نہیں، اس امتحان میں کامیاب ہوتے دیکھا ہے۔

اِس قابلیت کے ڈرائنگ ماسٹروں سے جب بچّوں کو مدرسے میں سابقہ پڑتا ہے،

تو جوزبوں نتیجہ ظہور میں آتا ہے، لوگ اس واقف ہیں۔ مگر اس کی بھی وضاحت کی ضرورت ہے۔ ہائی اسکولوں میں تیسرے درجے سے انگریزی زبان کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اسی درجے سے لے کر چھٹے درجے تک بچّوں کی ڈرائنگ کی لازمی تعلیم ہے۔ ہر بچّے کو لازمی طور پر ایک چھپی ہوئی ڈرائنگ کی کاپی خریدنا پڑتی ہے (بعض مدرسوں میں چھپے ہوئے نقشے ہوتے ہیں)۔ ماسٹر کی ہدایت کے مطابق بچّے ان چھپی ہوئی شکلوں کی نقل کرتے ہیں۔ اس نقالی کا سلسلہ چار سال تک یعنی چھٹے درجے تک جاری رہتا ہے۔ نیچے درجے کے بچّوں سے آڑی کھڑی ترچھی لکیریں کھنچوائی جاتی ہیں۔ اونچے درجوں میں بچّوں سے علاوہ سیدھی لکیروں کے، بنی ہوئی چیزوں کی دائرہ نما شکلیں بھی بنوائی جاتی ہیں۔ ساتویں درجے سے کچھ طالب علم ڈرائنگ بطور اختیاری مضمون کے لیتے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ جن طالب علموں کو اس فن سے خاص طور پر قدرتی لگاؤ ہو، وہ ڈرائنگ لیں۔ مگر یہاں معاملہ بالکل اس کے برعکس ہوتا ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک درجے میں دس بارہ طالب علم ڈرائنگ لیے ہوئے ہیں، ان میں سے سوائے دو یا تین کے باقی سب ایسے ہونگے، جن کو اس فن سے کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔ وہ محض اس وجہ سے فارسی، عربی یا ہندی کے بجائے اس کو اختیار کرتے ہیں کہ انھیں ڈرائنگ ماسٹر کی مہربانی کے طفیل بہت کم کام کرنا پڑتا ہے۔ اس چار سال کی مدت میں بھی طلبہ سے مندرجہ بالا طریق پر کام لیا جاتا ہے۔ کچھ تو ڈرائنگ ماسٹروں کی ذہنیت کی بدولت ایسا ہوتا ہے اور کچھ نصاب کی غلط ترتیب کی بدولت۔

اب سوال یہ ہے کہ آیا ہم کوئی ایسی صورت اختیار کر سکتے ہیں، جس سے بہتری کی اُمید پیدا ہو۔ یورپ میں جدید تحقیقات کے بعد ماہرین نے جو رائے قائم کی ہے، اُس کا لحاظ رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ یقیناً ایسی صورت اختیار کی جا سکتی ہے۔ سب سے

پہلے تو جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا تھا۔ آرٹ ماسٹروں کی تعلیم کا بہتر انتظام ہونا ضروری ہے۔ دوسرے نصاب میں تبدیلی درکار ہے۔ جہاں تک نصاب کا تعلق ہے، اس کا اوّل اصول یہ ہونا چاہیئے کہ وُہ بچّے کے ساتھ ہم آہنگ ہو، یعنی اُس کی فطری ضرورت کو پورا کرے۔ نہ یہ کہ اس کو مجبور کیا جائے کہ خواہ مخواہ ایک غیر دلچسپ مقررہ نصاب کی تکمیل کرے۔ ہم ہر بچّے کو قبل از وقت ایک معین کیے ہُوئے نصاب کے مواقف تعلیم نہیں دے سکتے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ وُہ اصول (جو اس نصاب میں ہیں) بچّے کی طبیعت کے قدرتی رجحان کے مواقف نہ ہوں۔ ہم اس میں زبردستی کسی خاص قسم کے آرٹ کا جذبہ نہیں پیدا کر سکتے۔ بلکہ جو خواہش اور رغبت بچّے میں پہلے ہی سے موجود ہے، اُس کو اُکسا سکتے ہیں۔ اگر بچّے کی طبیعت کا رجحان فنِ موسیقی، شاعری یا صنعت و حرفت کے کسی شعبے کی طرف ہے اور ہم نے جبر کر کے اُسے نقّاشی ہی میں پھنسا دیا، تو اُس کی طبیعت اُکتا جائیگی اور بجائے فائدے کے اس کی جمالی اور ذہنی نشوونما کو نقصان پہنچیگا۔ لیکن اس اصول سے کہ بچّوں کے رجحان کا خیال رکھنا ضروری ہے، آپ یہ نتیجہ نہ نکال لیے کہ اس رعایت کی وجہ سے بیشتر بچّوں کو آرٹ کی تعلیم سے محروم رکھنا پڑیگا، کیونکہ قدرت کی فیاضی کی بدولت اکثر اور بیشتر بچّوں میں آرٹ کے اظہار کا مادہ کسی نہ کسی شکل میں موجود ہوتا ہے۔ بعض بچّوں میں اس کا اظہار کئی مختلف صورتوں میں بھی ہوتا ہے۔ البتّہ ایسے بہت کم ہوتے ہیں، جو ہر قسم کے آرٹ پر حاوی ہوں۔ بہ حال اُستاد کا فرض یہ ہے کہ وُہ بچّوں کے ابتدائی بے ڈھنگے مگر جیتے جاگتے نقوش اور دیگر شوقوں سے رفتہ رفتہ یہ نتیجہ نکالے کہ ان کی طبیعت کا تقاضا انھیں کس طرف لے جائیگا اور پھر اس خاص سمت میں ان کی قوتوں کی نشوونما کرے۔ میں اس کی تشریح چند مثالوں سے کرونگا۔ فرض کیجیے کہ آپ ایک سات یا آٹھ سالہ بچّے سے کہتے ہیں کہ وُہ آج کی سیدھی لکیر یا

برابر فاصلے سے کھینچے، لیکن بچّہ چاہتا ہے کہ وُہ کوئی اور چیز بنائے، جس میں اس کے کسی تصوّر یا جذبے کا اظہار ہوتا ہے۔ اگر وہ بچّہ آپ کا حکم مانتا ہے، تو وُہ اپنی اس خواہش کو دبائیگا اور اُس کی توجّہ آپ کی بتائی ہُوئی لکیروں کی طرف مبذول ہو جائیگی۔ نتیجہ کیا ہوگا؟ بچّے کے ہاتھ میں سیدھی لکیریں کھینچنے کی قابلیت تو ایک حد تک پیدا ہو جائیگی، مگر اس کے ساتھ یہ قطعی طور پر ہوگا کہ وُہ خواہش اور خوشی، جو بچّے کو اپنی طبیعت کے زور سے کسی چیز کے بنانے میں ہوتی ہے، فنا ہو جائیگی۔ اگر اسی طرح آپ کے احکامات کا سلسلہ جاری رہا اور وہ ایک سبق کے بعد دوسرا سبق آپ کی خواہش کے مطابق سیکھتا رہا، تو سمجھ لیجیے کہ آپ نے اُس کے آرٹ کے رجحانات پر ایک ضرب کاری لگائی۔ جب اس بچّے کی تعلیم کا زمانہ ختم ہو گا، تو آپ مطمئن ہونگے کہ آپ نے ہر اصولی معاملے سے اس بچّے کو واقف کر دیا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس طرح کی تعلیم دے کر آپ نے اُس کی تخلیقی قوّت کو سلب کر لیا اور وُہ زندگی کے کسی کام میں اس کا استعمال نہیں کر سکیگا۔ آپ نے اُس کو کٹھ پتلی تو ضرور بنا دیا، مگر ساتھ ہی اس کے ایک ہونہار ہستی کو اپنے ہاتھ سے کھو دیا۔

برخلاف اس کے آپ یہ کر سکتے ہیں کہ اس بچّے کی فطرت کا مطالعہ کریں۔ اُس فطرت کو اپنا راہبر بنائیں اور یہ معلوم کریں کہ اس کا رجحان کس چیز کی طرف ہے۔ یہ علم ہونے کے بعد آپ اُس چیز کی وضع قطع کے بارے میں اُس سے گفتگو کریں۔ پھر رنگت وغیرہ کا مسئلہ چھیڑیں۔ بہرحال جو جو ضروری سوالات اس ضمن میں پیدا ہو سکتے ہیں اور جن جن صورتوں سے بچّے کے شوق اور ولولے میں اضافہ کیا جا سکتا ہے، وُہ سب آپ اختیار کریں اور اس طرح اُن سب کی یاد بسہولت کے ساتھ بچّے کے دماغ میں تازہ کریں۔ اس کے بعد جو شکل اس بچّے کے ہاتھوں سے معرضِ وجود میں آئیگی، وُہ اُس کے قدرتی تخیّل کا صحیح اظہار ہوگی۔

بے بچے کی نقاشی یا دوسرے کاموں کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ اُس وقت ہوتا ہے
ہ ان کو اپنی خواہش اور ارادے سے بناتا ہے۔ وہ نقوش بنانے میں احتیاط نہیں برتتا۔
ہے کہ وہ انسان کا چہرہ بنائے۔ آنکھیں اصلی جگہ پر نہ ہوں۔ ناک چہرے سے باہر
تو اُس کے اندرونی جذبات ہوتے ہیں، جو بے ساختہ اُبلتے چلے آتے ہیں۔ اگر
آزادی دیدی جائے، تو وہ چیزوں کی محض نقل نہیں کریگا، بلکہ یہ چیزیں اُس کی
شتہ ہونگی۔ اگر مدرس نے اس کے ذاتی خیالات میں تبدیلی پیدا کرنا چاہی اور مشاہدات
ے سے اُس کی توجہ کو ہٹا دیا، تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ اُس نے بچے کو اُس کی تخلیقی
نے جائز حق سے محروم کر دیا اور بجائے اس کے ایک بھونڈی قسم کی نقالی کو جگہ دی
ت تو چاہیے کہ مدرس تحکمانہ طرز کو چھوڑ کر بچے کے ساتھ مل کر کام کرنے والا بن
ور بچہ جو کام کر رہا ہو، اگر وہ بے ربط ہو، تو سیدھے سادے طریقوں سے بچے
نقص کو دور کرانے کی کوشش کرے۔ کیونکہ یہ دماغی حالت جس میں اس قسم کے
اظہار ممکن ہو (یعنی خط و خال کے ظاہر کرنے کی طرف توجہ اور ان میں مناسبت اور
سے دوسری اصل چیزیں نظر میں ہیں، اُس کے اظہار سے بے توجہی) اُستاد کے لیے غیر معمولی اہمیت
ہے اور اُس کی خاص توجہ کی محتاج ہے۔ کیونکہ (اُستاد کی عدم توجہی کی صورت میں)
ہم ہیں اور ممکن ہے کہ تا بہ زندگی بچے کے کاموں میں اسی قسم کی بے ترتیبی قائم رہے
نقطۂ نگاہ اُس کو ہمیشہ اسی طرف کھینچے۔ آرٹ کا مقصد ——— نہیں
ن کا مقصد ایجاد کرنا اور سنوارنا ہے۔ دوسرے الفاظ میں حصوں کو مناسبت
ھ ترتیب دے کر بولتی ہوئی، جیتی جاگتی تصویر بنانا بعض مستقل مزاج، لیکن
پر چلنے والے مدرس اکثر اُن بچوں پر جن کی قوت متخیلہ بہت تیز ہوتی ہے، ایسا

افسردہ کن اثر ڈالتے ہیں کہ اُن کی شگفتگی اور ندرت خیالی بالکل زائل ہو جاتی ہے اور وہ محض ایک اصطلاحی نقاش بن کر رہ جاتے ہیں۔ جن کو روزِ قیامت اپنی بنائی ہوئی تصویروں میں اس وجہ سے جان ڈالنا پڑیگی کہ وہ بالکل بے جان تھیں۔ ہندوستان میں لوگ جو فنِ نقاشی میں کورے ہوتے ہیں، اس کا باعث یہی مدرّس ہیں۔ تقریباً سات سال سے میرا تعلق مسلم یونیورسٹی کے ٹریننگ کالج سے اور اس سے پہلے دوسرے اسکولوں اور کالجوں سے رہا ہے اور میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اکثر طالب علموں یعنی آئندہ ہونے والے مدرسوں میں قوتِ مشاہدہ، تخیّل اور جدّت کا تو کیا ذکر ہے، بعض مرتبہ سیدھی لکیروں کے کھینچنے کی صلاحیت بھی نہیں ہوتی۔ ٹریننگ کالج میں طالب علموں کو ایک یا ڈیڑھ گھنٹہ تختۂ سیاہ پر خاکے بنانے اور خط وغیرہ لگانے (Black Board sketching) میں صرف کرنا پڑتا ہے۔ اس دوران میں سوالات کی بوچھاڑ ہوتی ہے کہ ہم لوگ تو اسکولوں میں بغیر ڈرائنگ کے کام چلائیں گے، پھر ہمارا اتنا وقت اس کام میں کیوں ضائع کیا جاتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب ڈرائنگ سکھانے کا وقت تھا، اُس وقت تو کچھ سکھایا نہیں گیا، اب ہم کیا سیکھ سکتے ہیں۔ یہ بیچارے جو کچھ کہتے ہیں، بالکل صحیح ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اس ذہنیت کے مدرّس اسکولوں میں ہونگے، تو چھوٹے بچّوں کا خدا حافظ ہے۔

گر ہمیں مکتب و ہمیں مُلّا | کارِ طفلاں تمام خواہد شد

مُندرجہ بالا واقعات کا لحاظ کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر بچّے کی ہمّت افزائی اور مدد اُس وقت جو قدرتی طور پر مقرر ہے تخیّل کے سنوارنے میں نہ کی گئی، تو ایک زمانہ ایسا آئیگا کہ اُس کا تخیّل افسردہ ہو چکیگا۔ اگر پودے کے پھولوں کو جبکہ وہ کلیوں کی شکل میں ہوں، ضائع کر دیجیے، تو سوائے خشک پتّیوں کے آپ کے ہاتھ اور کچھ نہ آئیگا۔ پُرانے

طرز کا نصاب جو عام طور سے ہندوستان میں رائج ہے، وہ طالب علموں کی ذہنیت کے لحاظ سے نہیں مرتب کیا گیا ہے۔ ہر بچّے کے لیے ایک ہی طرز تو کسی طرح موزوں نہیں، سب بچّے ایک ساتھ سیکھ تو سکتے ہیں، مگر اُن کی دماغی ترقی کی رفتار اور اسلوب مختلف ہوتا ہے۔ ایک بچّہ ہے، جس کے خیالات کا آلۂ اظہار الفاظ ہیں۔ یہ اس ضمن میں بہ نسبت ڈرائنگ کے زیادہ ترقّی حاصل کریگا۔ علاوہ اس کے ہر بچّے کے آرٹ کے اظہار کا طرز بھی مختلف ہوتا ہے۔ بعض بے حد حُسن پسند ہوتے ہیں، وُہ تصویریں بنانا چاہتے ہیں۔ مگر اُن میں سے بھی بعض قدرتی مناظر کے دلدادہ ہوتے ہیں، بعض انسانی تصاویر کے۔ بعض بچّے ایسے ہوتے ہیں، جو صرف صنعت و حرفت کے سلسلے میں نقوش بناتے ہیں یہ تخیّل پر عمل کو ترجیح دیتے ہیں۔ زیادہ تعداد بچّوں کی ایسی ہوگی، جن کو مشینری کے علاوہ دوسری چیزوں سے دلچسپی ہی نہ ہوگی۔ اُن کے لیے شکلِ ظاہری کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اصلیت ہی ہے، جو کچھ ہے۔ وہ مشین کے ایک سادے ٹکڑے کی صحیح شکل نہ بنا سکیں گے، مگر پوری مشین کی مختلف تراشیں اور نقشے تعجب خیز سچّائی کے ساتھ بنادینگے۔ کسی اسکول کے ایک درجے کو لیجیے، جس میں گیارہ سال اور اس سے زیادہ عمر کے بچّے موجود ہیں۔ ان کے پانچ چھے مختلف قسم کے رجحانات ہونگے۔ رائج الوقت نصاب میں سوائے ایک کے باقی پانچ قسم کے رجحانات والے بچّوں کی تعلیم کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ علاوہ اس کے نصاب میں جو آڑی کھڑی لکیریں اور انھیں لکیروں سے بنی ہوئی مختلف شکلیں رکھی گئی ہیں تاکہ بچّہ ان کے کھینچنے کی مشق کر کے مشکل نقّاشی پر قابو پائے۔ یہ بھی غلط طریقہ ہے۔ بچّے کے نزدیک تو یہ طریقہ کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔ اب جبکہ ہم آرٹ کو بطور زبان کے شمار کرتے ہیں، تو یہ ہونا چاہیے کہ (۱) قبل اس کے کہ بچّے کو کوئی بات کسی خاص

انداز سے کہنے میں دلچسپی ہو، اُس کے ذہن میں کہنے کے لیے کوئی بات بھی تو ہو۔
(۲) بچّہ اس بات کو متعدد بار کہیگا، جب کہیں اُس کو مکمل طور پر کہنا آئیگا۔ زبان سیکھنے کی بابت جو اُصول قائم کیا گیا ہے، وہی صورت حال آرٹ کے سلسلے میں پیش آتی ہے۔ نقاشی میں مندرجۂ ذیل چیزیں بچے کے لیے جاننا ضروری شمار کی جاتی ہیں:۔

(۱) اصول فن (۲) سیدھی اور صاف لکیریں بنانا (۳) وضع اور قطع کے بارے میں جو اصول ہیں، اُن کا علم۔ اُن کو گویا نقاشی کی گرمیر یا قواعد سمجھیے۔ برخلاف اس کے اگر کوئی ایسی تصویر کھینچے جس میں بچّوں کا کوئی کھیل دکھایا ہو یا کوئی اور چیز جس کا تعلق اُس کے ماحول یا تخیل سے ہو، تو وہ گویا زبان میں دلچسپ کہانیوں کے مترادف ہُوئی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پہلے بچّے کو کہانیاں کہنے کی عادت ڈالیے۔ اصول فن آخر میں آجائیں گے اور بقول ایک ماہر فن کے موجودہ نصاب کو جو غلط نفسیات پر مبنی ہے، ردّی کی ٹوکری کے سپرد کیجیے۔

مندرجہ بالا واقعات کے لحاظ سے ہندوستان میں عام طور پر مروّجہ نصاب کا نظام بالکل غیر اطمینان بخش ثابت ہوتا ہے اور ہمیں مجبوراً پورے مسئلے پر از سرِ نو غور و خوض کرنا پڑیگا۔ مگر ایک عمارت جو گر رہی ہو، اس میں ٹیک لگانا اور پھر اُسی میں رہنا بھی خطرے سے خالی نہیں۔ بے ضرر طریقہ تو صرف یہی ہو سکتا ہے کہ اس کو پختہ بنیاد پر از سرِ نو تعمیر کیا جائے۔ مدرّس جو ان نتائج سے متفق ہے، اُس کو یہ ماننا پڑے گا کہ نصاب کے بجائے بچّوں کی فطرت کو اپنی توجہ کا مرکز بنانا ضروری ہے۔ اگر وہ بچّوں کی زبردست قوّتوں سے واقف ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ ان میں نشو و نما کے مخصوص امکانات ہیں، تو وہ ہرگز اُن کو ایک ہی لکڑی سے نہیں ہانکے گا۔ اُس کو واقف ہونا چاہیے کہ کچھ

چیزیں ایسی ہیں، جن کو بچے ایک ساتھ مل کر تکمیل کو پہنچانا چاہیں گے۔ مثال کے طور پر وُہ بہت خوشی کے ساتھ ایک طریقے سے کام شروع کرینگے، بشرطیکہ اُن کو اُمید ہو کہ جس فن کی مختلف شاخوں کو وہ پسند کرتے ہیں، آئندہ اُن کو اُن شاخوں کے اختیار کرنے کا موقع ملیگا، لیکن مدرّس اب شروع سے آخر تک اُن کے لیے بلا امتیاز نصاب نہیں تیار کر سکتا۔ اُستاد اور شاگرد کے جو تعلقات ہوتے ہیں، اُن میں بھی تبدیلی ہو گئی ہے۔ اُستاد اب وُہ اُستاد نہیں رہا۔ اُس کا کام تو اب محض اشارے سے و کنائے سے، ہمت افزائی سے، سوتی ہُوئی جمالی قوتوں کو بیدار کرنے سے اور موقع و محل کے لحاظ سے معاملات کے حسبِ دلخواہ ترتیب دینے سے چلے گا۔ اب اُسے بلند مقام نقّاد کی طرح حقارت آمیز نکتہ چینی نہیں کرنا چاہیے، بلکہ اب تو ان کا شریکِ کار بن کر ہمدردی کے ساتھ اُن کی تخلیقی قوتوں کے سوتوں کو جاری کرنے کی ضرورت ہو گی۔

ذہانت اور اُس کی پیمائش

از

ع۔ ج۔ جمیل علوی، ایم اے، ممبر برٹش سائیکولاجیکل سوسائٹی

(گزشتہ سے پیوستہ)

اجتماعی آزمائشیں

بینے، ٹرمن اور برٹ وغیرہ کی آزمائشیں "انفرادی آزمائشیں" کہلاتی ہیں۔ کیونکہ ان سے بیک وقت صرف ایک ہی شخص کا معائنہ کیا جا سکتا ہے۔ ان آزمائشوں کے لیے کافی وقت درکار ہے۔ ممتحن تمام دن میں ایک قلیل تعداد کا ہی معائنہ کر سکتا ہے۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے "اجتماعی آزمائشیں" کی گئی ہیں۔ اس ایجاد کا سہرا امریکہ والوں کے سر ہے۔ اس سے یہ نہ خیال کر لینا چاہیے کہ اب انفرادی آزمائشیں استعمال میں نہیں آتیں۔ یہ آزمائشیں اپنے طور پر بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ جب کسی بچے کے مکمل ترین معائنے اور ذہانت کے نقص کی صحیح صحیح پیمائش کی ضرورت ہو، تو اس وقت انفرادی آزمائشیں ہی مفید ہوتی ہیں۔

ایک مشہور مثل ہے "ضرورت ایجاد کی ماں ہے"۔ یہ مثل اجتماعی آزمائشوں پر صادق آتی ہے۔ جنگِ عظیم کے دوران میں اہلِ امریکہ نے فوجیوں کی ذہانت کی پیمائش کی سختی سے ضرورت محسوس کی۔ اس ضرورت کا نتیجہ یہ آزمائشیں ہیں۔ اس عظیم الشان تجربے کے متعلق خود امریکہ والے فخریہ کہتے ہیں کہ "یہ ذہنی انجنیری میں نفسیات کا عظیم ترین تجربہ ہے"۔ اتنا عظیم

کہ دُنیا اس کی دوسری مثال پیش نہیں کر سکیگی۔ ۱۹۱۷ء اور ۱۹۱۸ء کے دوران میں ان ذہنی آزمائشوں کا تجربہ تقریبًا ۱۷,۵۰,۰۰۰ اشخاص پر کیا گیا ہے، جن میں ۴۱۰۰۰ اعلیٰ افسر بھی شامل تھے۔ امریکہ کو جب جنگ میں شامل ہونا پڑا، تو اُس نے علمائے نفسیات کے نتائج سے مکمل طور پر بہرہ اندوز ہونے کی کوشش کی علمائے نفسیات کا دعویٰ تھا کہ وُہ ایسے رنگروٹوں کو چھانٹ سکتے ہیں، جن کی ذہانت اتنی کم ہے کہ وہ موزوں سپاہی کبھی بھی نہیں بن سکتے۔ اعلیٰ افسران کے اس دعوے کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اس لیے اُنھوں نے سپاہیوں کی سخت ترین آزمائشیں لیں۔ باقاعدہ فوج میں سے بیشمار آدمیوں کی ترتیب ذہانت کے لحاظ سے علمائے نفسیات نے دی۔ ان کے نتائج کا فوجی افسرانِ بالا نے اپنے نتائج سے مقابلہ کیا۔ دونوں فریقوں کے نتائج آپس میں اتنے ملتے تھے کہ فوجی حکّام کے تمام شکوک رفع ہو گئے۔ یہ اعتراف کیا گیا کہ علمائے نفسیات کا محض دعویٰ ہی درست نہیں، بلکہ وہ اس سے بڑھ کر بھی کام سرانجام دے سکتے ہیں۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایسی آزمائشیں تمام امریکی فوجیوں کو دی جائیں۔ حکومت کی جانب سے اعلان کیا گیا کہ ان آزمائشوں کا مقصد صرف ناقابل رنگروٹوں کو علیحدہ کرنا ہی نہیں، بلکہ اس کا مقصد یہ بھی ہے کہ ان فوجیوں کا پتہ لگایا جائے، جو اعلیٰ ٹریننگ سے قابل افسر بن سکتے ہیں۔ نیز یہ کہ کون کون سے رنگروٹ کو کس خاص شعبے کی تعلیم دلائی جائے۔

اِن آزمائشوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ تقریبًا ۸,۰۰۰ اشخاص کے متعلق سفارش کی گئی کہ ان کو فوج سے خارج کر دیا جائے، کیونکہ ان کی ذہانت اوسط سے بہت ہی کم تھی۔ دس ہزار اشخاص معمولی ذہانت کے باعث مزدوروں کے کام پر لگائے گئے۔ یا اُنھیں ایسے کام پر معمور کیا گیا، جس میں بہت ہی معمولی ذہانت کی ضرورت تھی۔ دس ہزار فوجیوں کے متعلق سفارش کی گئی کہ

ان کو اعلیٰ تعلیم دلائی جائے تمام تعداد کے تقریباً ۲۵٪ افراد لکھنے پڑھنے کے ناقابل تھے یا اتنا معمولی جانتے تھے کہ ان کو یہ آزمائشیں نہیں دی جاسکتی تھیں۔ ان کے لیے ایک اور خاص آزمائش مقرر کی گئی۔

یہ فوجی آزمائش محض مشکل سوالات اور معموں وغیرہ پر ہی مشتمل نہ تھی، بلکہ ان سوالات کو سائنٹیفک طریقے سے ترتیب دیا گیا تھا۔ اپریل ۱۹۱۷ء میں "امریکی مجلس نفسیات" کی جانب سے ایک خاص مجلس مقرر کی گئی، جس کا مقصد یہ تھا کہ ایسا قابل وثوق پیمانہ تیار کیا جائے، جس کی مدد سے بیشمار آدمیوں کا بیک وقت ذہنی معائنہ کیا جاسکے۔ یہ مجلس پانچ ارکان پر مشتمل تھی۔ اس کے صدر پروفیسر "رابرٹ، ایم، یرکس" تھے۔ اس موضوع پر جتنا بھی مواد مل سکتا تھا، تمام کا تمام جمع کیا گیا۔ اس مجلس کا متفقہ فیصلہ یہ تھا کہ ایسی آزمائش میں، جو فوجیوں کے لیے تیار کی جارہی ہے، پانچ ضروریات کو خاص طور پر مدِنظر رکھنا چاہیے۔ ضروریات یہ تھیں :-

۱۔ یہ آزمائش مدرسے کے علوم سے بے نیاز ہونی چاہیے، کیونکہ اس کا مقصد یہ نہیں کہ ایسی لیاقت کی پیمائش کی جائے، جو معمول نے مدرسے میں حاصل کی ہے، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ ایسی جبلّی لیاقت (ذہانت) کی پیمائش کی جائے، جس کا انحصار مدرسے کے پڑھائے ہوئے مضامین پر مطلق نہیں۔

۲۔ اس آزمائش کو بتدریج مشکل بنانا چاہیے۔ یعنی، ایک طرف تو اتنی آسان ہو کہ معمولی ذہانت کا آدمی بھی اس کو حل کرسکے، لیکن دوسری طرف اتنی مشکل ہو کہ اعلیٰ ترین ذہانت کا آدمی بھی اس کو کافی مشکل سے حل کرسکے۔

۳۔ نمبر لگانے کا طریقہ بہت آسان اور ممتحن کی ذاتی رائے سے مبرّا ہونا چاہیے۔

عام امتحانوں میں بالعموم جواب کافی طویل ہوتے ہیں اور اسی لیے نمبر لگانے کے لیے کافی وقت درکار ہوتا ہے۔ اس آزمائش میں علما کی کوشش یہ تھی کہ نمبر لگانے کا طریقہ اتنا صاف اور واضح ہو کہ اس میں ذاتی رائے کا مطلق دخل نہ ہو اور نہ ہی اس میں کسی غلطی کا احتمال ہو سکے، محض ایک نظر ڈالنے سے نمبر لگا دیے جائیں۔

۴۔ اس کے حل کرنے میں بہت ہی کم تحریر کی ضرورت ہو۔ تاکہ یہ آزمائش کم سے کم وقت لے سکے۔ اس تمام پیمانے میں ۲۱۲ سوالات صرف ۲۳ منٹ اور ۱۵ سیکنڈ میں حل کیے جائیں، جن کی اوسط تقریباً ۶½ سیکنڈ فی سوال ہے۔ مختلف آزمائشوں کی رفتار مندرجہ ذیل ہے :-

نمبر آزمائش	آزمائش کا نام	سوالات کی تعداد	وقت منٹ۔سیکنڈ
۱	ہدایات	۱۲	۲ - ۱۵
۲	حسابی مسائل	۲۰	۵ - ۰
۳	اعلیٰ جواب	۱۶	۱ - ۳۰
۴	الفاظ کے معانی	۴۰	۱ - ۳۰
۵	مرکب فقرے	۲۴	۲ - ۰
۶	نمبروں کو جاری رکھنا	۲۰	۳ - ۰
۷	باہمی رشتے کو معلوم کرنا	۴۰	۴ - ۰
۸	اطلاعات	۴۰	۴ - ۰
	میزان	۲۱۲	۲۳ - ۱۵

۵۔ آزمائش کی مختلف صورتیں بتدریج مشکل ہونا چاہییں۔ نیز یہ کہ تمام آزمائشیں

اتنی دلچسپ ہونا چاہییں کہ امتحان دینے والا اس میں مشغول رہے۔

بیشمار تجربات کے بعد بالآخر دو آزمائشیں مقرر کی گئیں۔ایک خواندہ آدمیوں کے لیے اور دوسری ناخواندوں کے لیے۔پہلی آزمائش کا نام الف آزمائش اور دوسری کا نام ب آزمائش رکھا گیا۔ابتدائی کوششوں میں الف آزمائش کا تجربہ ہائی اسکولوں، کالجوں اور دوسری درسگاہوں کے طلبہ پر بھی کیا گیا۔نتائج کا مقابلہ دوسرے طریقوں سے حاصل شدہ نتائج سے کیا گیا۔مثلاً ٹرمن کے اسٹینفورڈ پیمانے اور اساتذہ کے امتحانوں کے نتائج سے،اور سپاہیوں کی صورت میں ان کے افسروں کے اندازے اور ان کے عہدے کی مطابقت سے۔اس آزمائش اور دوسرے مختلف امتحانوں کے نتائج کی باہمی نسبت ۶۵۰+ سے ۶۹۰+ تھی۔جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ آزمائش مکمل طور پر قابلِ اعتبار ہے۔ب آزمائش کی نسبت بھی تقریباً یہی تھی۔اس لیے اس کے نتائج بھی قابلِ وثوق قرار دیے گئے۔اگر کسی شخص کو الف آزمائش کے بعد ب آزمائش دی جاتی، تو ان کا باہمی فرق صرف چار یا پانچ نمبروں کا ہوتا۔

اس آزمائش کی خاص قابلِ صفت بات یہ ہے کہ تمام سوالات کا درست جواب صرف ایک ہی ہوتا ہے۔ممتحن کو بتا دیا جاتا ہے کہ اس کا صحیح جواب یہ ہے۔اس طریقے سے شخصی رائے بالکل دخل نہیں دیتی۔انفرادی آزمائشوں کے لیے خاص مشق اور تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے اس آزمائش کی صورت میں کسی خاص تعلیم کی ضرورت نہیں۔صرف معمولی مشق ہی کافی ہوتی ہے۔ہر ایک استاد معمولی مشق سے ان کا استعمال جلد سیکھ جاتا ہے۔

فوجی الف ذہنی امتحان میں مندرجۂ ذیل آٹھ مختلف آزمائشیں ہیں:۔

(۱) ہدایات کے مطابق عمل کرنا (۲) حسابی مسائل (۳) بہترین جواب یعنی عام فہم سوالات (۴) الفاظ کے معانی (۵) بے ترتیب فقرہ جات کا حل (۶) نمبروں کی زنجیر کو جاری رکھنا (۷) مشابہت معلوم کرنا اور (۸) واقفیتِ عامہ۔

ہر ایک آزمائش میں ہر ایک سوال کو اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ وہ بتدریج مشکل ہوتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہی آزمائش آخر میں جا کر بہت ہی مشکل ہو جاتی ہے وقت اتنا قلیل ہوتا ہے کہ ذہین ترین انسان بھی اس کو اس عرصے میں کامل طور سے ختم نہیں کر سکتا۔ اس احتیاط کی اہمیت کا اندازہ صرف اسی وقت ہی لگایا جا سکتا ہے۔ جب کوئی ذہین آدمی اس کو ختم کر لے اور حل کرنے کے لیے اور مواد موجود نہ ہو۔ اس صورت میں اس کی ذہانت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اور مواد کی موجودگی میں وہ سب کے سب سوالات حل کر سکتا ہے۔ اسی طرح جو شخص صفر نمبر حاصل کرے۔ اس کے متعلق بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس کی ذہانت کی پیمائش نہیں ہوئی، کیونکہ اگر اس سے آسان سوالات ہوتے، تو کچھ نہ کچھ وہ ضرور حل کر لیتا۔ اس مقصد کو مدِنظر رکھتے ہُوئے ایک طرف تو آزمائشیں بہت ہی آسان ہیں اور دوسری طرف بہت ہی مشکل۔

اس پیمانے کی پانچ صورتیں ہیں۔ نمبر ۵ سے لے کر نمبر ۹ تک۔ یہ مختلف صورتیں تمام پہلوؤں سے ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ آزمائشوں کی ترتیب اور ان سوالات کا بتدریج مشکل ہوتے جانا سب ایک ہی اصول پر مبنی ہے۔ صرف مواد ان کا مختلف ہے مثلاً اگر فارم نمبر ۵ میں کہیں ''گیہوں'' کا لفظ ہے، تو نمبر ۹ میں اس کی جگہ ''اون'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ مشکلات کے لحاظ سے یہ تمام آزمائشیں ایک ہی ہیں مختلف صورتوں کا فائدہ بالکل واضح ہے۔

الف ذہنی امتحان کا نمونہ مندرجۂ ذیل ہے :۔(فارم نمبر ۹)

آزمائش (۱) ۔"ہدایات کے مطابق عمل کرنا"۔مثلاً اس آزمائش کے دوسرے سوال میں ۹ دائرے ہیں۔ان سب میں ایک سے لے کر نو تک نمبر لگے ہوتے ہیں۔ ہدایت یہ دی جاتی ہے :۔

"تیار ہو جاؤ۔نمبر ۲ سوال پر غور کرو۔جہاں دائرے میں نمبر لگے ہُوئے ہیں۔جب میں "چلو" کہوں، تو دائرہ نمبر ۱ سے لے کر نمبر ۴ تک ایک ایسا خط کھینچو، جو دائرہ نمبر ۲ کے اوپر سے ہو کر گزرے اور نمبر ۳ کے نیچے سے۔بس، چلو۔"

اس سوال کے حل کرنے کا زیادہ سے زیادہ وقت ۵ سیکنڈ ہے۔اس آزمائش میں ۱۲ سوالات ہیں، جو آخر میں جا کر بہت مشکل ہو جاتے ہیں۔تمام ہدایات باری باری سے صرف ایک ہی مرتبہ سُنائی جاتی ہیں، کیونکہ اس آزمائش کا مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ معمول ہدایات پر کتنی جلدی عمل کرتا ہے۔

آزمائش نمبر (۲)۔"حسابی مسائل"، اس میں زبانی حساب کے بیس سوالات ہیں۔ ان تمام کا مقررہ وقت ۵ منٹ ہے۔سوال نمبر ۱ یہ ہے۔

۱۰۔اگر ۵ آدمیوں کو ۲۰۰ فٹ لمبی خندق کھودنے میں ۴ دن درکار ہوں، تو اسی خندق کو نصف دن میں ختم کرنے کے لیے کتنے آدمی درکار ہونگے؟ جواب (   )۔

۱۶۔اگر ایک ہوائی جہاز دس سکنڈ میں ۳۰۰ گز اُڑے، تو بتاؤ، وہ ⅕ سیکنڈ میں کتنے فٹ اُڑیگا۔جواب (   )۔

آزمائش نمبر (۳)۔"عام فہم سوالات کا بہترین جواب"۔اس آزمائش میں ۱۶ سوالات ہیں۔ہر ایک سوال کے تین تین جوابات درج ہوتے ہیں۔ہدایت یہ لکھی ہوتی ہے

کہ جو جواب صحیح ہو، اس کے پہلے × نشان لگاؤ۔

۱۲۔ ٹیلیفون تار سے زیادہ مفید ہے، کیونکہ :۔

☐ اس سے جواب بہت جلد مل جاتا ہے۔

☐ اس کے لیے تاریں زیادہ استعمال کی جاتی ہیں۔

☐ یہ ایجاد بہت تازہ ہے۔

۱۳۔ موسم گرما میں تقریباً تمام مدرسے بند کر دیے جاتے ہیں، کیونکہ :۔

☐ اُستادوں کو آرام کرنے کا وقت مل جاتا ہے۔

☐ بچّوں کو گرمی کی شدّت میں مدرسے کے اندر نہیں بیٹھنا پڑتا۔

☐ مدرسے کے کمروں کی مرمّت کی جاسکتی ہے۔

آزمائش نمبر (۴)۔ "الفاظ کے معانی"۔ اس آزمائش کا مقصد یہ ہے کہ دو الفاظ کے متعلق کتنی جلدی کہا جا سکتا ہے کہ یہ ہم معنے الفاظ ہیں یا مخالف۔ اِس آزمائش میں کل ۴۰ سوالات ہیں۔ ہر سوال کے سامنے ہم معنی اور مخالف الفاظ درج ہوتے ہیں۔ ہدایت یہ ہوتی ہے کہ اگر یہ دونوں الفاظ ہم معنی ہیں، تو ہم معنی کے نیچے نشان لگاؤ، ورنہ مخالف کے نیچے۔

۲۔ آہستہ ۔ جلدی   ہم معنی ـــــ مخالف

۵۔ اصلی ۔ حقیقی   ہم معنی ـــــ مخالف

آزمائش نمبر (۵)۔ "بے ترتیب فقرہ جات کا حل"۔ اس میں فقروں کی ترتیب اُلٹ پلٹ ہوتی ہے۔ امتحان دینے والے نے اس ترتیب کو زبانی درست کر کے یہ دیکھنا ہے کہ یہ فقرہ معنوں کے لحاظ سے درست ہے یا غلط ہے۔ اگر درست ہے، تو اُسے ہدایت کی جاتی ہے

کہ درست کے نیچے نشان لگائیے، ورنہ غلط کے نیچے۔

۲۔ "یہ ہے کہ بیٹھنے کرسی لیے ہوتی" صحیح ... غلط ۲

۱۲۔ "کے پھول گلاب درخت اور سمندر میں اُگتے ہیں" صحیح ... غلط ۱۲

آزمائش نمبر (۶)۔ "نمبروں کی زنجیروں کو جاری رکھنا"۔ اس کا مقصد غور و فکر کی پیمائش ہے۔ چھے نمبر دیے ہوتے ہیں اور اس میں دو اور نمبروں کا اسی ترتیب کے موافق اضافہ کرنا ہوتا ہے۔

۱۳ - ۱۲ - ۱۴ - ۱۳ - ۱۵ - ۱۴ - ۱۶ - ...... - ......

۱۴ - ۱۶ - ۸ - ۴ - ۲ - ۱ - $\frac{۱}{۲}$ - ...... - ......

آزمائش نمبر (۷)۔ اس آزمائش کا مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ امتحان دینے والا کتنی جلدی باہمی رشتوں کو معلوم کر لیتا ہے۔ اُس لفظ کے نیچے نشان لگانا ہوتا ہے، جو پہلے لفظ سے کسی نہ کسی طرح وابستہ ہو۔ اس میں ۴۰ سوالات ہوتے ہیں اور وقت ۴ منٹ۔

۱۷۔ سردی۔ گرمی : برف۔ "یخ"، "کریم"، "بھاپ"، "مشین"۔

۳۱۔ مرکّب۔ سادہ : سخت۔ "روپیہ"، "آسان"، "کام"، "عجیب"۔

آزمائش نمبر (۸)۔ "واقفیتِ عامہ"۔ اس آزمائش سے یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ امتحان دینے والے نے اپنے ماحول سے کیا کچھ سیکھا ہے۔

اس آزمائش کے متعلق یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کا انحصار ذہنی لیاقت کے بجائے تجربات اور تحصیلی علم پر ہے، لیکن تجربے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ ذہانت کی پیمائش کی ایک نہایت اعلیٰ آزمائش ہے۔ اس میں چالیس سوالات ہیں۔ ہر ایک سوال کا فقرہ

نامکمل چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس کو مکمل کرنے کے لیے چار دیے ہُوئے الفاظ میں سے ایک لو چُننا پڑتا ہے۔ درست الفاظ کے نیچے نشان لگانا پڑتا ہے۔

۲۶۔ بانگِ درا کا مصنّف غالبؔ، حالیؔ، اقبالؔ، حفیظ ہے۔

۲۰۔ دیودار ایک مشین، درخت، خوراک، کپڑے کا نام ہے۔

ہر ایک آزمائش کے حل کرنے کا نمونہ پہلے دیا ہوتا ہے۔ اس نمونے کے مطابق تمام آزمائشیں حل کی جاتی ہیں۔ کل میزان تمام آزمائشوں کے حل کیے ہُوئے نمبروں کے جمع کرنے سے حاصل کی جاتی ہے۔ ۲۱۲ کل میزان ہے۔ میزانوں کو سات مندرجۂ ذیل درجات میں تقسیم کیا گیا ہے:-

درجات	ا	ب	ج+	ج	ج-	د	د- تا ہ
میزان	۲۱۲ -	۱۳۴ -	۱۰۴ -	۷۴ -	۴۴ -	۲۴ -	۱۴ -
شرح فیصدی میزان	۱۳۵	۱۰۵	۷۵	۴۵	۲۵	۱۵	۰
جو سپاہیوں نے حاصل کی	۴	۸	۱۵	۲۵	۲۴	۱۷	۷

اس آزمائش کے متعلق یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں صرف وہی اشخاص ہی زیادہ نمبر حاصل کر سکتے ہیں، جو سوچنے میں تعجیل کریں۔ تجربے سے یہ معلوم کیا گیا ہے کہ اکثر اعلیٰ ذہانت والے بہت آہستہ غور و فکر کرتے ہیں۔ بیشتر مشہور و معروف فلاسفہ اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ آزمائش ایسے لوگوں کی ذہانت کی صحیح صحیح پیمائش کرنے سے قاصر ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ ناخواندہ اشخاص الفؔ آزمائش سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کی ذہنی پیمائش کے لیے ایسے پیمانے کی ضرورت تھی، جو زباندانی سے بالکل مبرا ہو۔ فوج میں بیشتر سپاہی انگریزی زبان سے نابلد تھے۔ ان کی پیمائش

کے لیے بھی یہی ب آزمائش ہی استعمال ہو سکتی تھی۔ ہدایات و اشارات وغیرہ کی تشریح سب کے سامنے تختہء سیاہ پر کی جاتی ہے۔

پہلی آزمائش میں امتحان دینے والے کو منحنی خطوط میں سے باہر نکلنے کا مختصر ترین راستہ تلاش کرنا پڑتا ہے۔ شکل کاغذ پر کھینچی ہوتی ہے۔ معمول کو پنسل سے نشان لگا کر راستہ دکھانا ہوتا ہے۔ اس آزمائش میں کل پانچ مختلف اقسام کی اشکال ہوتی ہیں، جو بتدریج مشکل ہوتی چلی جاتی ہیں۔

دوسری آزمائش چھوٹے چھوٹے مکعبوں کے ڈھیر پر مشتمل ہے۔ ہر ایک شکل میں جتنے مکعب ہوں، ان کی تعداد نیچے مربع شکل میں تحریر کرنی ہوتی ہے۔ اس قسم کی کل ۱۶ اشکال ہوتی ہیں۔

تیسری آزمائش میں بہت سے خانے بنے ہوتے ہیں۔ کچھ خانے خالی چھوڑ کر باقی سب میں o اور x نشان ایک ترتیب سے لگائے ہوتے ہیں۔ امتحان دینے والے نے خالی خانوں کو اسی ترتیب سے پُر کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً

۸-

X	X	o	o	o	X	X	o	o	o	X	X	o	o	o					

۹-

X	o	X		X	o	X		X	o	X		X	o	X					

چوتھی آزمائش میں سب سے اوپر ۹ تک کے ہندسوں کی علامات دی ہوتی ہیں۔ معمول نے دیے ہوئے ہندسوں کے نیچے ان کی مقررہ علامات درج کرنی ہوتی ہیں۔ اس میں کل چھے اشکال ہوتی ہیں۔

پانچویں آزمائش ہیلی کی اس آزمائش پر مبنی ہے، جس میں اشکال کے مٹے ہوئے عناصر کا نام بتانا ہوتا ہے۔ اس آزمائش میں بیس چھوٹی چھوٹی اشکال ہوتی ہیں۔

جن کا کوئی نہ کوئی عنصر مفقود ہوتا ہے ۔

چھٹی آزمائش میں پچاس نمبروں کے جوڑوں کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ اگر دونوں جوڑے بالکل ایک جیسے ہوں، تو اُن کے سامنے × نشان لگانا ہوتا ہے۔ مثلاً

۶۵۰ – ۶۵۰

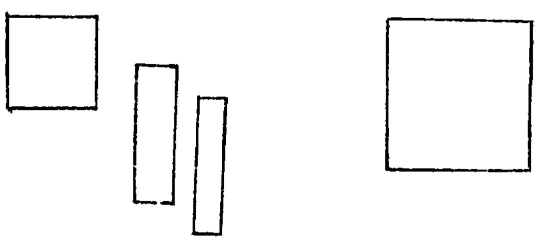
۰۴۴ – ۰۴۱

۴۱۱۸۱۹۰۰۷۲۶ – ۴۱۱۸۱۹۰۰۷۲۶

۶۵۴۳۹۲۰۸۱۷ – ۶۵۴۳۹۲۰۸۷۱

آخری آزمائش دس مربع اشکال پر مشتمل ہے۔ ہر ایک مربع شکل سے چند اور شکلیں جو ان کے ساتھ موجود ہوتی ہیں، بن سکتی ہیں۔ پنسل سے اس مربع شکل پر اس طرح خط کھینچنے ہوتے ہیں کہ بعینہٖ وہی اشکال بن سکیں۔ مثلاً

۹-



ان تمام آزمائشوں کے حل کرنے کا وقت ۲ - ۲½ - ۱¾ - ۲ - ۳ - ۳ اور ۲½ منٹ علی الترتیب ہے۔

ناخواندہ اشخاص میں ہم دس سال تک کے بچے بھی شامل کر سکتے ہیں۔ اگرچہ آٹھ اور نو سال کے اکثر بچے لکھ پڑھ سکتے ہیں، لیکن یہ اتنی آسانی سے تحریر شدہ ہدایات پر عمل نہیں کر سکتے۔ ب آزمائش مدرسے کے چھوٹے بچوں کے لیے بہت ہی مفید ثابت

ہوئی ہے اس اصول کی بنا پر اور بھی بہت سی آزمائشیں مقرر کی گئی ہیں۔ "آٹس" کی پرائمری امتحان کی آزمائش خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ایسا کاغذ جس پر بہت سی تصاویر کھنچی ہوئی ہوتی ہیں، بچوں کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔ کسی تصویر کے نیچے نشان لگانے کے لیے کہا جاتا ہے اور کسی کو کاٹنے کے لیے، کسی کا مٹا ہوا حصہ ظاہر کرنے کے لیے اور کسی ایک تصویر کو خط کے ذریعے دوسری تصویر سے ملانے کے لیے کہا جاتا ہے۔

آزمائش نمبر (۱) کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ اس میں چھے مختلف اشکال ہوتی ہیں۔ ریچھ، سورج، گڑیا، خرگوش، گلدستہ اور موم بتی۔

۱۔ تصویروں کی اس قطار کی طرف دیکھو اور گڑیا کے گرد نشان لگاؤ۔ (وقفہ ۵ سکنڈ)۔

۲۔ اب ایسی چیز کی شکل تلاش کرو، جو دوڑ سکتی ہے۔ اس کے نیچے نشان لگاؤ۔

۳۔ اب ایسی تصویر کو تلاش کرو، جو موم بتی اور گڑیا کے درمیان ہے۔ اس کے نیچے × نشان لگاؤ۔ (وقفہ ۵ سکنڈ)۔

فرانس کا نظامِ تعلیم

از

بشیر احمد ڈار، ایم اے، بی ٹی

(گزشتہ سے پیوستہ)

درجۂ ثانوی اس درجے میں فرانس کے دو مختلف ادارے ہیں۔ لائسی (Lycee) اور کالج۔ چند اہم تعلیمی نظری مشابہتوں کے علاوہ دونوں کا راستہ الگ اور دونوں کی منزلِ مقصود جداگانہ ہے۔ اوّل الذکر چونکہ حکومت کی مشین چلانے کے لیے اعلیٰ درجے کے کارکن پیدا کرتا ہے، اس لیے حکومت کا خزانہ ان کیلیے پورے طور پر کھلا رہتا ہے اس کا معیارِ تعلیم کالجوں سے کافی بلند ہے اور کالج تو غریب طبقے کے مزدور کو تعلیم دینے کے لیے وقف ہیں۔ اس لیے ان کے اخراجات کا بار مقامی بلدیات کے ناتجربے کار اور شکستہ کندھوں پر ڈالا گیا ہے۔ لائسی درحقیقت اعلیٰ معاشری حیثیت کے لوگوں کی اولاد کے لیے مخصوص ہے، جیسے کہ انگلستان کے نام نہاد عوام کے مدارس۔

درجۂ ثانوی فرانس کے دیگر تمام تعلیمی درجات پر حاوی ہے اور اس کا اثر ہر جگہ نمایاں ہے اور یہی حال تقریباً انگلستان میں بھی ہے۔ اگرچہ وہ وجوہ جن کی بنا پر اس درجے نے دونوں ملکوں میں زیادہ اہمیت حاصل کی ہے، بالکل متضاد ہیں انگریزی مدارسِ عوام شاندار اوقاف رکھنے کے علاوہ مقابلتاً زیادہ فیس وصول کرتے ہیں۔ اپنے انتظام اور حکومت میں بالکل خود مختار ہیں۔ ہیڈ ماسٹر تمام اساتذہ کا عملی طور پر تقرر کرنے کا مجاز ہے اور نصابِ تعلیم کا فیصلہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے

برعکس فرانسیسی لائسی کے پاس کوئی اوقاف نہیں اور مالی ضروریات اور انتظام کے لیے مرکزی حکومت کے ماتحت ہے۔ ان کا ڈائرکٹر حکومت کی مشین کا ایک پرزہ ہے اور نصاب سب مدارس کے لیے یکساں ہیں کھیلوں کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی۔ اگر انگلستان کے مدارسِ عوام اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ وہ بچّوں کی سیرت کی تعمیر کرتے ہیں، تو فرانسیسی مدرسے اس پر نازاں ہیں کہ وہ علم و تہذیب کی درسگاہیں ہیں۔ شاید دونوں کا عادِ مشترک پابندیِ روایات ہے۔ دونوں ملک اس بات پر خوش ہیں کہ وہ اپنی پرانی تاریخی روایات کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔

ان مدارس کا صحیح اثر معلوم کرنے کے لیے لازمی ہے کہ ناظرین کو چند تاریخی حقائق سے واقف کیا جائے، جن کے مطالعے سے یہ چیز روشن ہوسکیگی کہ کس طرح ان مدارس نے فرانس کی تمام تعلیمی زندگی کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ فرانس کی تعلیمی تاریخ کو تین حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا دور شارلیمن سے شروع ہوتا ہے۔ دوسرا گیارھویں صدی کے اختتام سے اور تیسرا پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی کے نشاۃ ثانیہ سے شروع ہوتا ہے۔ یہاں پہلے دور کا مطالعہ ہمیں اپنے مقصد سے بہت دور لے جائیگا، کیونکہ اُن زمانوں کی کوئی خاص روایت ایسی نہیں، جو موجودہ تعلیم کے کسی شعبے میں نمایاں ہو۔ اگرچہ فرانس کے بیشتر تعلیمی ادارے دوسرے دور کی پیداوار ہیں، لیکن تیسرا دور ہمارے نفس مضمون سے بہت زیادہ تعلق رکھتا ہے۔ چونکہ یہی وہ عہد ہے، جس میں چند ایک ایسی تعلیمی تحریکات رُونما ہوئیں، جو اگرچہ آجکل اُسی شدّت کے ساتھ برسرِکار نہیں، لیکن ان کا اثر موجودہ دور میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

کسی ملک کی تعلیم درحقیقت اُس کی تمام پرانی تاریخی روایات اور تمدّنی رجحانات کا

نتیجہ ہوتی ہے اور اس لحاظ سے فرنگ کے مختلف ملکوں کا نظامِ تعلیم تمدنی نقطۂ نگاہ سے ایک ہے۔ اگرچہ فروعی تفصیلات میں کافی اختلاف موجود ہے، جو کسی حد تک تو طبعی ماحول کا نتیجہ ہیں اور کچھ نسلی اثرات کا باعث۔ یورپ میں تین مختلف نسلیں آباد ہیں۔ جنوبی یورپ میں بحرِ روم کے ساتھ ساتھ ایک خاص نسل کی اکثریت ہے، جس کو بحرِ روم کی نسل کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ بحیرۂ شمالی اور بالٹک کے کنارے ایک دوسری نسل آباد ہے، جو نارڈک کہلاتی ہے۔ ان دونوں جغرافیائی خطوں کے درمیان وسطی فرانس سے لیکر کوہ یورال تک ایک تیسری نسل ہے، جس کو الپائن کہتے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ فرنگی ممالک میں سے کوئی ایسا ملک نہیں، جہاں کوئی نسل بالتخصیص پائی جاتی ہو۔ انسانی ضروریات نے مختلف نسلوں میں ایک ایسی ہم آہنگی پیدا کر دی ہے کہ تقریباً ہر گوشے میں سب نسلوں کے لوگ آباد نظر آتے ہیں۔ مختلف انسانی گروہوں کی تشکیل میں اس نسلی تقسیم کو بہت دخل ہے۔ اس کی مثال عیسائیت کے مختلف فرقوں کی تقسیم سے دی جا سکتی ہے۔ مثلاً پروٹسٹنٹ فرقے کے اصول کو تسلیم کرنے والے نارڈک نسل اور رومی طلبہ کے متبعین الپائن یا بحرِ روم کی نسل تک محدود ہیں۔

نسلی اختلافات کے علاوہ مذہبی روایات نے بھی تعلیم کے نظام کو ایک امتیازی رنگ دیا ہے اور آخری صدی تک تقریباً تمام فرنگی ملکوں میں تعلیم کا انتظام بالکل مذہبی گروہ کے ہاتھ میں تھا۔ نہ صرف تعلیم کے مقاصد ہی بلکہ تعلیمی انتظامات اور اخراجات کے عملی معاملات بھی مذہبی روایات کے مطابق تھے۔ فرنگی ممالک کے انتظاماتِ تعلیم کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان تمام مذہبی گروہوں اور ان کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے۔ چونکہ اس جگہ ہمیں فرانس کے نظامِ تعلیم پر بحث کرنی ہے۔ اس لیے ہماری تمام تر کوشش صرف

رومی کلیسا اور خاص کر فرقۂ یعقوبی کی تعلیمی کوششوں تک محدود ہوگی ۔

رومی کلیسا صحیح معنوں میں سامراجی روایات کا حامل تھا اور اس کا غلبہ زیادہ تر ان ممالک پر نمایاں تھا، جہاں لاطینی زبان یعنی دوسرے لفظوں میں رومی تمدّن خوب پھلا پھولا تھا۔ دوسرے ممالک میں (مثلاً جرمنی) مقامی روایات اور ادبی بیداری نے بڑی حد تک ان کے اثر کو زائل کر دیا۔ تحریک تجدید مذہب اور تجدید علوم نے جہاں موٴخر الذکر ملکوں میں بڑی بیداری پیدا کر دی، وہاں رومی ممالک کو رومی کلیسا نے بڑے زور سے ان تحریکوں سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی اور ان کوششوں میں کامیابی کا سہرا فرقۂ یعقوبی کے سر ہے، جس نے تحریک تجدید مذہب کے بنیادی خیالات سے استفادہ کرتے ہوئے رومی کلیسا میں نئی رُوح پھونک دی۔ چنانچہ دو صدیوں تک وُہ ان ملکوں پر پوری طاقت سے حکمران رہے۔ فرانس کے اونچے طبقے کے لوگوں کی تعلیم ان کے سپرد تھی۔ پُرانے جامعات ان کے حوالے کیے گئے اور بلدیات اور کئی رئیسوں نے ان کے لیے کئی مدارس کھول دیے چنانچہ ایک مرکزی نظامِ تعلیم قائم کیا گیا اور تمام تعلیم کلیسا کے روحانی مقاصد کے موافق ڈھالی گئی۔ یہاں ایک بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس فرقے نے عوام کی تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ نہ صرف اس لیے کہ وُہ ایسی تعلیم دینے کے اہل نہیں تھے، بلکہ اس لیے کہ عوام اپنے مذہبی تعصبات کی وجہ سے ان کے قابو میں ہی تھے۔ کلیسا کے خلاف اگر کوئی گروہ برسرِ پیکار ہو سکتا تھا، تو وہ درمیانی یا اُوپر کا طبقہ تھا، جو اعلیٰ تعلیم کے باعث کلیسائی غلط کاریوں کو آسانی سے سمجھ سکتا تھا۔ اس فرقے کا مقصد محض ایسے چند لوگوں کو تعلیم دینا تھا، جو بہترین دماغ کے مالک تھے۔ انھیں چند در چند وجوہ کے باعث اس فرقے نے کبھی بھی عوام کے لیے ابتدائی مدارس نہیں کھولے اور اسی لیے فرانس میں ابتدائی تعلیم کی تاریخ ۱۸۳۳ء

سے شروع ہوتی ہے۔ جب مذہبی گروہ کا اقتدار ختم ہو گیا اور حکومت نے ہر چیز اپنے ہاتھ میں لے لی، تو اس نے بھی اسی نقش قدم پر چلنا پسند کیا۔ فرقۂ یعقوبی اٹھارھویں صدی کے اواخر میں ناپید ہو گیا، لیکن تعلیم کے متعلق جس گروہ نے بھی آواز اٹھائی، اس کے اصولوں کو برقرار رکھا اور اُسے صرف ثانوی درجے کی اصلاح تک محدود رکھا۔ صرف ایک گروہ ایسا تھا، جس نے غریب کسانوں کی تعلیم کا بیڑا اُٹھایا۔ ان کا نام "عیسائی اخوان" تھا، جو سترھویں صدی کے اختتام پر ظاہر ہوئے۔ ۱۸۰۳ء کے قانون نے تمام ابتدائی مدارس کا انتظام ان کے سپرد کر دیا، لیکن ۱۹۰۵ء میں سیاسی (Secular) قانون کے نافذ ہونے سے یہ گروہ بھی ختم ہو گیا۔

اُنیسویں صدی میں جب تمام فرنگ میں سیاسی (Secular) خیالات نے قوت پکڑی، تو رومی کلیسا نے اپنے بچاؤ کی پوری کوشش کی، لیکن آہستہ آہستہ ان کا اقتدار کم ہوتا چلا گیا۔ جب تعلیم کی اجارہ داری ان کے ہاتھ سے نکل اور حکومت کی طرف سے مالی امداد بند کر دی گئی، تو اُس وقت کلیسا نے مقامی خود اختیاری حکومت اور آزادانہ حکمت عملی کی حمایت شروع کی۔ سرکاری مدارس کے عمدہ انتظامات نے ان کو مجبور کر دیا کہ وہ ابتدائی اور نسوانی تعلیم کی طرف توجہ دیں، جو ابھی تک پرانے کلیسائی اصول کے مطابق ناقابلِ اعتنا تھیں۔ نصاب اور طریقۂ تعلیم بھی زمانے کی ضروریات کے موافق تبدیل کر دیا گیا۔

جب زمانے کا رنگ بدلا، تو لوگوں کے دلوں سے کلیسا کا پرانا رعب آہستہ آہستہ کم ہونا شروع ہوا۔ رومی کلیسا کی مرکزیت قومی حدود سے بالاتر تھی اور اس لیے فرانس میں جب ملکی کلیسا کی تحریک کا آغاز ہوا، تو یہی تحریک آخرکار اٹھارھویں صدی کے دوران میں رومی کلیسا کے خلاف جنگ آزما ہوئی اور پارلیمان میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ ایسا

قومی نظامِ تعلیم قائم کیا جائے، جو کلیسائی اثر اور مرکزیت سے بے نیاز ہو۔ اس کے علاوہ بعض اور وجوہ بھی تھے، جن کے باعث حکومت مذہبی تعلیمگاہوں میں دخل دینے پر مجبور ہوگئی۔ یورپ کی اقتصادی ترقی نے ہر ملک کے دل میں یہ احساس پیدا کر دیا کہ ان کے لیے حرفتی اور صنعتی تعلیم یافتہ لوگوں کی ضرورت ہے، جس کو کلیسائی مدارس پورا کرنے سے قاصر تھے۔ اس لیے حکومت نے تعلیمی معاملات کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اس تبدیلی میں چند تحریکوں نے بہت زیادہ مدد دی۔ ان کا ذکر کرنا یہاں بے محل نہ ہوگا۔ (۱) تحریک اخوتِ انسانی (Humanism)۔ (۲) انیسویں صدی کی تحریک قومیت، جس نے مظلوم قوموں میں زندگی کا احساس بیدار کیا۔ (۳) اشتراکیت۔

(۱) تحریک اخوتِ انسانی درحقیقت دوسرے لفظوں میں تجدیدِ علوم کا سنگِ بنیاد تھی اور اس کے زیر اثر کئی ایک پوشیدہ انجمنیں قائم ہوئیں۔ ان سب میں سے مشہور Rosierucian انجمن تھی۔ انھوں نے انسانی اخوت کو جغرافیائی اور مذہبی قیود سے چھڑانے کی کوشش کی اور عوام کی تعلیم اس کا اولین مقصد تھا۔ اس گروہ نے اپنے خیالات کی نشر و اشاعت سے تمام فرنگی ممالک میں تعلیمی معاملات کو اہم مسئلہ بنا دیا۔ فرنگ کے مشہور ماہر تعلیمات کومینیس (Comenius)، لائبنیز (Leibnitz) اور جان لاک وغیرہ سب اسی گروہ میں شامل تھے، لیکن کومینیس کی تصانیف درحقیقت اس گروہ کے تعلیمی عقائد کا آئینہ دار ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ہر ملک میں غیر مذہبی مدرسے قائم کیے جائیں، جہاں عام ابتدائی تعلیم دی جائے لیکن ثانوی اور اعلیٰ تعلیم صرف چیدہ اشخاص تک محدود رہنی چاہیے۔ احیاء علوم کے عہد (رینائسانس) کے دیگر مصنفین کے خلاف جو کلاسیکل (دقیانوسی) تعلیم کے حامی تھے، یہ گروہ صنعتی تعلیم کو رائج کرنا چاہتے تھے۔

(۲) دوسرا گروہ فری میسنری تھا۔ تعلیمی معاملات میں ان کی کوشش یہی تھی کہ غیر فرقہ وارانہ (یعنی غیر مذہبی) مدرسے قائم کیے جائیں، جن میں عام ابتدائی تعلیم دی جائے۔ لیکن جہاں ہالینڈ اور برطانیہ میں اس غیر فرقہ وارانہ رجحان کا مطلب عیسائیت تھا جس میں کسی خاص فرقے یا عقیدے کی تخصیص نہ تھی، وہاں رومی ملکوں میں یہی انجمن رومی کلیسا کی دشمن تھی اور مذہب کے مقابلے میں سرکاری اور سیاسی اقتدار کی حامی تھی۔ فرانس کے بہت سے مشہور ماہران تعلیم مثلاً والٹیر، ڈی المبرٹ، مونٹسکیو اور ڈائڈرو وغیرہ سبھی فری میسن تھے اور وہاں کے تمام مختلف تعلیمی منصوبے اسی گروہ کی کوششوں کا نتیجہ تھے۔ جمہوریت دوم کے وزیر تعلیمات عامہ اور دوسرے وزرا (۱۸۵۵ء) اور جمہوریت سوم کے وزرا جیولز سائمن اور جیولز فیری (Ferry ، موجودہ نظام تعلیم کے بانی تھے، سب اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے اور فرانس کی تعلیمی حکمت عملی بہت حد تک اسی گروہ کی مرہون منت ہے۔

۱۹۲۳ء میں فرانسیسی میسن لاج نے یہ قرارداد منظور کی: "ہم مدرسۂ مشترک (Ecole Unique) کے قیام اور تعلیمی معاملات کو سرکاری نظام کے ماتحت دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔ ایسے مدرسوں کے بنیادی اصول انقلاب فرانس (۱۷۸۹-۹۳ء) کی تحریک حریت کے مطابق ہونے چاہییں۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ان مدارس کے دروازے ہمارے معاشرے کے ہر فرد کے لیے کھلے رہنے چاہییں ... " معاشرے کا ہر فرد خواہ وہ کسی طبقے سے ہو، بہ حیثیت انسان ہونے کے ایک ہی حیثیت کا مالک ہے اور یہ رشتۂ اخوت و ہمدردی صرف ایسے ہی مدارس کے قیام سے مضبوط ہو سکتا ہے۔ "ہم دماغی عمومیہ (Democracy) چاہتے ہیں اور اس کی تحصیل کا واحد ذریعہ اس قسم کے مشترک مدارس ہیں، جہاں نہ صرف تعلیم مفت دی جائے، بلکہ طلبہ کا انتخاب محض ذاتی قابلیت پر منحصر ہو۔"

(۴) تحریک قومیت۔ زمانۂ وسطیٰ میں جب لاطینی علوم و فنون کی زبان تھی، قومیت کا تصوّر پیدا ہونا محال تھا۔ مذہبی ادارے اور جاگیرداری رئیس اپنے اپنے مفاد کی خاطر بین الاقوامی خیالات کے پیرو تھے اور غریب کسان اپنی جہالت کے باعث تنظیم کے ناقابل۔ لیکن تحریک تجدید علوم کے بعد جب قومی ادبیات نے اپنا سر اُبھارا، تو اُس وقت قومیت کی بنیاد استوار ہوئی اور اُس کی نشو و نما کے ساتھ لاطینی زبان کی جگہ قومی زبان نے لے لی۔ فرانس میں اگرچہ مدت تک لاطینی زبان پڑھائی جاتی رہی، لیکن آخر کار فرانسیسی زبان غالب آئی اور اب تو لاطینی کی رہی سہی وقعت بھی جاتی رہی۔ جب اس کے مقابلے پر السنۂ مروجہ کا اختیاری مضمون داخل نصاب کر دیا گیا۔

تحریک اخوتِ انسانی پروٹسٹنٹ ملکوں میں مذہب کی رفیق اور مددگار تھی، لیکن رومی ممالک میں اُس نے مذہب دشمنی اپنا شعار بنا لیا۔ اس لیے فرانس میں مدتوں تک دونوں گروہوں میں نبرد آزمائی ہوتی رہی۔ مذہبی اجارہ داری کے زمانے میں ان مخالف تحریکوں نے تعلیمی معاملات میں آزادی کی حمایت میں پورے زور سے نشر و اشاعت کی، لیکن جب مذہبی اقتدار کم ہوا اور تمام نظامِ تعلیم دوسرے گروہ کے ہاتھ میں منتقل ہو گیا، تو اُنھوں نے بھی اسی مرکزیت کو قائم رکھا، جس کی مخالفت اتنی شد و مد سے کی جاتی رہی تھی۔ چنانچہ نپولین نے بالکل وہی نظامِ تعلیم برقرار رکھا، جو فرقہ یعقوبی کا خاصہ تھا۔ اس تبدیل ہیئت نے کلیسائی گروہ کو غیر مرکزیت اور آزادی کا علمبردار بنا دیا۔ چنانچہ اس وقت تمام لاطینی ممالک کے مدرسے دو مختلف حیثیتوں کے ہیں، لیکن ان کی حقیقت ایک ہے۔ ایک طرف تو مذہبی مدارس ہیں، جو حکومت کے اثر سے آزاد ہوتے ہوئے بھی کلیسا کے ماتحت ہیں اور دوسری طرف سرکاری مدارس جو مذہبی اثر سے آزاد ہوتے ہوئے بھی مقامی آزادی اور خود مختاری سے محروم ہیں۔ اس

مسلسل جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۹۰۵ء میں قانون کے ذریعے مذہب اور سیاست کا تعلق منقطع ہو گیا اور مذہبی گروہ کو تعلیمی معاملات سے بالکل بے دخل کر دیا گیا۔ لیکن اس بظاہر فیصلہ کن شکست کے بعد بھی کلیسا نے اپنی کوشش جاری رکھی اور جنگِ عظیم کے مختصر وقفے کے علاوہ یہ کشمکش اب تک جاری ہے۔

ان تمام جدید خیالات کی نشر و اشاعت کی موجودگی میں مذہبی گروہ کی مخالفت یقیناً صدا بصحرا ثابت ہوتی، اگر بعض دیگر وجوہ کارفرما نہ ہوتے۔ ایک طرف ثانوی مدارس لوگوں میں ہر دلعزیز ہیں، کیونکہ ان کا طرزِ تعلیم ملک کی پرانی مقدس روایات سے وابستہ ہے اور اس لئے قابلِ احترام۔ محض تحصیلِ علم پر اکتفا کرنا خواہ موجودہ تعلیمی نظریات کی روشنی میں وہ کتنا ہی غلط کیوں نہ ہو، ان مدارس کا مطمعِ نظر ہے۔ لیکن اس محدود دائرے میں جو کچھ بھی کیا جاتا ہے، ضرور قابلِ رشک ہے۔ ماہرانِ تعلیم جنہیں ان مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ سے ملنے کا موقع ملا ہے، ان کے شوقِ تعلیم اور حصولِ علم میں رطب اللسان ہیں۔ ان شاندار نتائج کو دیکھتے ہوئے ان مدارس میں کسی قسم کی تبدیلی آسان نہ تھی۔ اگرچہ جنگِ عظیم کے دوران میں جلی اعلانات کے ذریعے جمہوری طرزِ حکومت کی حفاظت ہی کو شرکتِ جنگ کی وجہ جواز قرار دیا گیا لیکن افسوس ہے کہ اس وقت انگلستان اور فرانس دونوں ملکوں میں صحیح جمہوری نظام کے بجائے سرمایہ دار اکثریت ملک پر حکمرانی کر رہی ہے۔ کم از کم فرانس میں جو گروہ حکومت پر قبضہ کیے ہوئے ہے، وہ تعلیمی نظام میں کسی قسم کی اہم تبدیلی کرنے کے لیے تیار نہیں، جس سے اس نظام میں غریبوں کے لیے بھی کوئی گنجائش نکل سکے۔ لاسی (Lycee) کا نظام اور نصاب صحیح جمہوری روح پیدا کرنے کے منافی ہیں۔ اول تو ان مدارس میں طلبہ سے فیس لی جاتی ہے۔ اس آمدنی سے ادارے کی مالی مدد تو جو کچھ ہوتی ہوگی، وہ

ہمیں معلوم ہی ہے، البتہ نیچے طبقے کے لوگوں کے لیے یہ راستہ بالکل بند کر دیا گیا ہے اگرچہ غریبوں کے لیے وظائف مقرر کیے گئے ہیں، لیکن ان سے اس طبقے کو شاید ہی کوئی فائدہ پہنچتا ہو۔ انگلستان کی طرح فرانس میں بھی جو کچھ زبانی طور پر غریبوں کے لیے کیا جاتا ہے، درمیانی اور اعلیٰ طبقے کے افراد وہ بھی ان سے کسی نہ کسی طرح چھین ہی لیتے ہیں۔ دوسرے تمام نصاب السنۂ قدیمہ پر مبنی ہے۔ طریقۂ تعلیم نصاب اور مدرسے کا ماحول موجود زندگی سے اتنا دور ہے کہ غریب افراد جن کے بچوں کے لیے کسی کسب کا سیکھنا شاید تعلیم سے کہیں زیادہ ضروری ہے، ان اداروں سے پرہیز کرتے ہیں۔ اصلاح کے راستے میں تیسری بڑی رکاوٹ کلیسیائی ذہنیت ہے، جو لاطینی زبان کو برقرار رکھنے پر مُصر ہے تاکہ لوگوں کو بند جہالت سے کسی طرح چھٹکارا حاصل نہ ہو سکے۔

لیکن ان سب حوصلہ شکن حالات اور پرانی مذہبی یا غیر مذہبی تاریخی روایات کے باوجود فرانس میں چند ایسے آثار آہستہ آہستہ پیدا ہوتے جا رہے ہیں، جن سے صاف ظاہر ہے کہ حکومت ایک دن مجبور ہو جائیگی کہ نظامِ تعلیم میں مناسب اصلاح کرے۔ شاید اس متوقع اصلاح کی طرف ایک یا دو قدم اُٹھائے بھی جا چکے ہیں۔ جس کا مختصر سا خاکہ نیچے درج کیا جاتا ہے۔

فری مین مدت سے "مدارس مشترکہ" (Ecole Unique) کی ترویج کے حامی تھے، لیکن اس وقت فرانس کے سربرآوردہ حکیم اور مفکر اس کو عملی جامہ پہنانے پر تُلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ۱۹۲۷ء میں انھوں نے اپنی تعلیمی سکیم پیش کی۔ یہ سکیم ۶، ۳، ۴ پر مبنی ہے۔ یعنی پہلے چھے سال سب بچوں کے لیے لازمی ابتدائی تعلیم۔ دوسرا درجہ ثانوی تعلیم جس میں تین مختلف کورسس ہوں اور تیسرا درجۂ لائسی (Lycee) جن میں آٹھ مخصوص خواندگیاں

ہوں۔ فرانسیسی نظام میں جو متوازیت ہے، اُس کو ختم کر دینا چاہیے اور مدارس ثانوی کو ابتدائی مدرسوں سے زیادہ نزدیک ہونا چاہیے۔ چونکہ اس سکیم کے مطابق ابتدائی اور ثانوی دونوں درجوں میں مفت تعلیم کا اصول تسلیم کیا گیا تھا، اس لیے یقینی ہے کہ اس اسکیم پر عملدرآمد کرنے سے تمام تعلیمی ادارے حکومت کے زیر اثر ہونگے اور اسی وجہ سے رومی کلیسا کے حامی اس تجویز کے دشمن ہیں، کیونکہ اس میں کلیسائی مدارس کی موت ہے۔ اگرچہ مدارس مشترکہ کی ترویج سے یہ ضروری نہیں کہ تمام مدارس بلا واسطہ حکومت کے ماتحت آجائیں، لیکن یہ واضح رہے کہ کلیسائی مدارس سرکاری مدارس کا مقابلہ کرنے سے قاصر رہیں گے۔ خاص کر جب حکومت کی طرف سے مفت تعلیم کا اعلان ہو جائے۔ اس مخالفت کی وجہ سے حکومت اس اصلاح کو مکمل طور پر نافذ نہیں کر سکی۔ لیکن کوشش کی گئی ہے کہ درجہ بدرجہ یہ مقصد حاصل ہو جائے۔ مثلاً ۱۹۲۸ء میں وزیر تعلیمات نے مشترک ادارات کے تمام درجوں میں مفت تعلیم کا اعلان کر دیا۔ لڑکوں کے مدرسوں میں لڑکیوں کے داخلے کی پابندیاں بھی کم کر دی گئیں۔ اپریل ۱۹۳۰ء میں ایک قانون پاس کیا گیا، جس کے رو سے سرکاری ثانوی مدرسوں میں بھی مفت تعلیم جاری ہوئی اور ۱۹۳۳ء میں یہ سکیم مکمل ہو گئی۔ اس قانون کی وجہ سے لوگوں کا رجحان کلیسائی مدارس سے ہٹ کر سرکاری مدرسوں کی طرف ہو گیا۔ اس طرح ابتدائی اور ثانوی مدرسوں میں جو متوازیت تھی، وہ سرکاری مدارس کی حالت میں تو ختم ہو گئی۔ لیکن یہ کامیابی کچھ تسلی بخش نہیں، چونکہ اب تک بھی ۵۰ فیصدی طالب علم کلیسائی مدارس میں تعلیم پا رہے ہیں۔

(باقی آئندہ)

جرمنی کا نظامِ تعلیم

از

فیّاض احمد بی اے، بی ٹی

(گزشتہ سے پیوستہ)

اس مقالے کی پچھلی قسط میں تحریکِ شباب کا ذکر آچکا ہے اور یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ اگر چند خاص اسباب پیدا نہ ہو جاتے تو یہ تحریک عالمگیر ہو جاتی۔ کم از کم اس میں عالمگیر اور ہمہ گیر تحریک ثابت ہونے کی صلاحیت موجود تھی۔ جنگِ عظیم کے بعد جرمنی کا سیاسی ماحول سرے سے بدل گیا۔ شخصی حکومت کا خاتمہ ہوا اور اس کی جگہ سلطنتِ جمہوریہ نے لی۔ جمہوری طرزِ حکومت میں ذات پات کے امتیازات قائم نہیں رہ سکتے تھے۔ اس لیے سب سے اوّل تین قسم کے ادارے جو تین مختلف طبقوں کے لیے مخصوص تھے، بند کر دیے گئے اور اس طرح سماج کی یہ سہ گونہ تقسیم جو تعلیمی اور اقتصادی وجوہ پر مبنی تھی مٹا دی گئی۔ حکومت کی نظر میں سب طلبہ اور طالبات خواہ وہ کسی طبقے سے متعلق کیوں نہ ہوں برابر قرار دیے گئے۔ ان امتیازات کے اثرات کو بالکل ہی مٹا دینے کی غرض سے عین ایک ہی طرز کے ابتدائی مدرسے کھول دیے گئے۔ جن میں ہر طبقے کے لوگ خواہ وہ امیر ہوں یا غریب اپنے بچوں کو بھیجنے کے لیے مجبور کر دیے گئے۔ اس لیے قطع نظر اقتصادی امتیازات کے تعلیمی نقطۂ نگاہ سے سب طلبہ ایک ہی سطح پر آ گئے۔

ثانوی تعلیم

ثانوی تعلیم کو عام کرنے کی غرض سے بچوں کے لیے اسکول چھوڑنے کی عمر اٹھارہ برس

کر دی گئی۔ ۱۴ برس سے ۱۸ برس تک کی عمر کے بچّے بچّے عموماً صنعتی یا تجارتی اداروں میں بھیجے جاتے تھے تاکہ وہ اپنے اپنے میلانِ طبع کے موافق اپنی آئندہ زندگی کے لیے پیشے تجویز کر لیں۔

جرمنی میں جنگ سے بیشتر جس قدر ادارے اعلیٰ تعلیم کے لیے وقف تھے، انتہا درجہ کے قدامت پرست تھے اور جتنے وہ اُونچے درجے کے ہوتے تھے اُسی قدر زیادہ قدامت پرست بھی ہوتے تھے۔ اگرچہ ابتدائی مدرسوں میں مساوات ضرور قائم کر دی گئی تھی، لیکن یہ مساوات ثانوی اور اعلیٰ درجے کے اداروں میں اسی نسبت سے رواج نہ دی جا سکی۔ پانچ مختلف قسم کے ثانوی ادارے جاری کیے گئے جن میں مختلف قسم کے مضمونوں کی تدریس ہونے لگی۔ مثلاً ایک قسم کے ثانوی اداروں میں یونان اور روما کی تہذیب کے اصولوں پر تعلیم دی جاتی تھی۔ دوسری قسم کے ثانوی اداروں میں تدریس کے بنیادی اصول یورپ کے تمدن پر مبنی تھے اور تیسری قسم کے مدرسوں میں زیادہ حساب اور سائنس پر زور دیا جاتا۔ چوتھی قسم کے اسکولوں میں صرف جرمن تہذیب و تمدن کی تعلیم دی جاتی تھی اور پانچویں قسم کے ادارے محض دیہاتی علاقوں کے لیے مخصوص کر دیے گئے تھے جن میں زیادہ تر زراعتی نقطۂ نگاہ سے تعلیم دی جاتی تھی۔

مخلوط تعلیم

جرمنی میں ابتدائی تعلیم جبری تو تھی ہی۔ جنگِ عظیم کے بعد مخلوط تعلیم بھی جاری کر دی گئی۔ اس سے مراد یہ نہیں کہ جنگ سے پہلے جرمنی میں مخلوط تعلیم سرے سے تھی ہی نہیں بہر حال عام نہ تھی۔ جنگ سے پہلے جرمنی کے ماہرینِ تعلیم کا خیال تھا کہ لڑکے اور لڑکیوں میں جسمانی اور دماغی اعتبار سے بہت فرق ہے۔ اس لیے انھیں ایک جگہ تعلیم دینا دونوں کیلئے

نقصان دہ ہے۔ کیونکہ لڑکیوں کی جسمانی اور ذہنی نشو و نما اپنے بھائیوں کی نسبت تیز ہوتی ہے۔ چنانچہ او سط درجے کی دس سے اٹھارہ برس کی عمر کی ایک لڑکی اُسی عمر کے لڑکے سے ذہنی اعتبار سے بڑھی ہُوئی ہوتی ہے۔ اوّل الذکر کا شعور بھی مؤخرالذکر سے کہیں بڑھا ہُوا ہوتا ہے۔ اس لیے لڑکے اور لڑکیوں کو یکجا تعلیم دینا بیل اور گھوڑے کو ایک ہی گاڑی میں جوت دینے کے مُرادف ہے۔ مزید برآں چونکہ دونوں جنسوں کو آئندہ زندگی میں مختلف قسم کے کام سرانجام دینا ہیں۔ اس لیے اُن کے مضامین اور طریقِ تعلیم بھی مختلف ہونا چاہییں۔ تاہم جنگ کے بعد مخلوط تعلیم ابتدائی درجے میں عام کر دی گئی۔ ثانوی درجے میں اسے کوئی دخل نہ تھا لیکن پھر بھی جرمنی میں کہیں کہیں ایسے ثانوی مدرسے بھی کھولے گئے، جہاں مخلوط تعلیم مروّج کی گئی اور یہ سلسلہ اُن اداروں میں کامیابی سے چل رہا ہے۔

جرمنی میں مخلوط تعلیم یورپ کے باقی ملکوں کی طرح مقبول عام نہ ہو سکی۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ جرمن سماج میں ہندوستانی سماج کی طرح مرد کی حیثیت غالب ہے اور عورت کی حیثیت ایک محکوم کی سی ہے۔ وہاں کی عورت امریکہ یا یورپ کے باقی ملکوں کی طرح آزاد نہیں۔ عام طور پر اس ملک میں اس کا درجہ خانہ دار سے زیادہ نہیں۔ چنانچہ برلن یونیورسٹی کے ڈاکٹر ہبنر (Dr. Hubner) نے ایک تقریر کے دوران میں کہا۔ "ہم اصولی طور پر مخلوط تعلیم کے خلاف ہیں۔ اگرچہ عملاً ہماری درسگاہوں میں اسے دخل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی جگہوں اور خصوصاً دیہات میں دو قسم کے مدرسے کھولنے مشکل ہیں۔ اس لیے ابتدائی تعلیم مخلوط ہے اور اس کے علاوہ یونیورسٹیوں، اعلٰے درجے کے صنعتی اداروں اور ٹریننگ کالجوں میں بھی مخلوط تعلیم کو رواج دے دیا گیا ہے۔"

... کی وجہ یہ ہے کہ ماہرینِ تعلیم اقتصادی نقطۂ نگاہ سے مجبور ہیں کہ مخلوط تعلیم کو ... دیں۔

اب سوال ثانوی اداروں کا باقی رہ جاتا ہے۔ کیونکہ اہلِ جرمن کی قدامت پسندی ... تعلیم کے راستے میں حائل ہے۔ اس لیے ثانوی درجے کے اداروں میں یہ تجربہ وسیع پیمانے پر ابھی تک نہیں کیا گیا۔ اگرچہ اب کہیں کہیں ان مدرسوں میں بھی اس تجربے کو آزمایا جا رہا ہے۔ لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں بیسویں صدی کے شروع میں قواعد بنائے گئے تھے۔ اس لیے یہ اُن جملہ عیوب سے پاک تھے، جو قبل از جنگ لڑکوں کے مدرسوں میں کثرت کے ساتھ موجود تھے۔ اس لیے جمہوری سلطنت کے قیام کے بعد اس سلسلے میں صرف چند ایک تبدیلیاں اور اصلاحات جاری کی گئیں۔ جنگ کا ایک بہت ہی اہم اثر یہ ہُوا کہ یورپ بھر میں عورت آزاد ہو گئی۔ جرمنی کی عورت بھی آزادی کی اس رَو سے بہت متاثر ہُوئی۔ اس سلسلے میں طبقۂ اناث کے متعلق اعلیٰ تعلیم کے نظریے میں بھی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جنگ سے پیشتر اہلِ جرمن کا عورت کے متعلق یہ خیال تھا کہ عورت کو اس قسم کی تعلیم دی جائے کہ وہ ایک بہترین ماں، محبت اور خدمت کرنے والی بیوی اور اعلیٰ درجے کی نگرانِ خانہ بن سکے۔ جنگ کے بعد جرمنی کی اقتصادی حالت بہت خراب ہو گئی۔ اس لیے عورتیں بھی گھروں سے باہر نکل کر مردوں کے دوش بدوش کام کرنے اور روزی کمانے پر مجبور ہو گئیں۔ چنانچہ انھیں دکانوں، کارخانوں، بنکوں، غرض زندگی کے ہر شعبے میں ہر حیثیت سے کام کرنا پڑا۔ آخر عورت جب اقتصادی طور پر مرد کی دستگیری سے بے نیاز ہو گئی، تو اس میں ہمسری، برابری اور آزادی کے خیالات پیدا ہونے شروع ہوئے۔ ان حالات کے ماتحت لڑکیوں کے لیے جدید قسم کے اداروں

کی ضرورت شدت سے محسوس ہوئی۔ اس لیے یہ نئی قسم کے ادارے، جو لڑکیوں کے لیے کھولے گئے۔ لڑکوں کے مدرسوں کی طرز پر تھے۔ چونکہ اب لڑکیوں کو بھی اپنی روزی آپ کمانی تھی، اس لیے انھیں بھی وہی مضامین پڑھنے کی ضرورت محسوس ہوئی، جو پہلے جزئی میں لڑکوں کے لیے مخصوص ہوتے تھے۔ انہی حالات کے پیشِ نظر روز بروز ثانوی اداروں میں بھی مخلوط تعلیم عام ہو رہی ہے۔ عورتوں کے ٹریننگ کالجوں میں بھی انھیں مضامین کی تدریس کے اصول سکھائے جاتے ہیں، جو مردوں کے ٹریننگ کالجوں میں رائج ہیں۔ فرق صرف جزئی مضامین میں ہے۔ عورتوں کو سینا پرونا اور کشیدہ کاری سکھائی جاتی ہے اور مردوں کو بڑھئی اور لوہار کا کام وغیرہم دستکاریاں سکھائی جاتی ہیں۔

کتب لائبریری

برائے پرائمری و لوئر مڈل کلاسز

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت	نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱	کہانیوں کی پہلی پروفیسر رام سروپ کوشل	۴ر۱۱ پائی	۲۰	دلچسپ تاریخی کہانیاں حصہ سوم	۷ر
			۲۱	کام کی باتیں حصہ اوّل	۳ر۹ پائی
۲	〃 〃 دوسری 〃	۱ر۶ 〃	۲۲	〃 〃 〃 〃 دوم	۲ر۳ 〃
۳	〃 〃 تیسری 〃	۷ر۶ 〃	۲۳	قصصِ ہند حصۂ اوّل	۳ر۲ 〃
۴	پیاری کہانیاں اوّل	۶ر	۲۴	〃 〃 〃 دوم	۲ر۸ 〃
۵	〃 〃 دوم	۵ر	۲۵	قصصِ ہند کا مجموعہ زنانہ	۱۱ر
۶	〃 〃 سوم	۷ر	۲۶	حسینہ اور وحشی	۱ر۵ پائی
۷	میٹھی کہانیاں اوّل	۲ر	۲۷	شہزادہ مہربان	۱۰ر۲ 〃
۸	〃 〃 دوم	۵ر	۲۸	راما سیتا	۱۰ر۱ 〃
۹	〃 〃 سوم	۷ر	۲۹	جادو کا مٹکا مسٹر دیا رام	۳ر
۱۰	〃 〃 چہارم	زیرِ طبع	۳۰	دروپدی	۱ر۸ 〃
۱۱	〃 〃 پنجم		۳۱	مہاراجہ رنجیت سنگھ	۴ر۶ 〃
۱۲	امرت کہانیاں نمبر ۱	۲ر۹ پائی	۳۲	خلیفہ ہارون الرشید	۴ر
۱۳	〃 〃 نمبر ۲	۳ر۱۰ 〃	۳۳	راجہ اشوک	۵ر
۱۴	〃 〃 نمبر ۳	۲ر۵ 〃	۳۴	مہارانا پرتاپ	۲ر۱۰ پائی
۱۵	انوارِ سہیلی کے انمول موتی	۲ر۸ 〃	۳۵	شیر شاہ سوری	۲ر۱۱ 〃
	〃 〃 حصہ ۱ 〃 〃		۳۶	شہاب الدین شاہجہان	۲ر۱۰ 〃
۱۶	〃 〃 حصہ ۲ 〃 〃	۴ر۱۰ 〃	۳۷	نصیر الدین ہمایوں	۲ر۱۰ 〃
۱۷	〃 〃 حصہ ۳ 〃 〃	۲ر۵ 〃	۳۸	اورنگ زیب عالمگیر	۲ر۹ 〃
۱۸	دلچسپ تاریخی کہانیاں حصہ اوّل	۷ر 〃	۳۹	نور الدین جہانگیر ..	۲ر۳ 〃
	〃 〃 〃 دوم	۸ر۱۱ 〃	۴۰	شہاب الدین غوری ..	۲ر۸ 〃

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۴۱	سلطان علاؤ الدین خلجی . .	۲ر۱۱ پائی
۴۲	فیروز الدین تغلق . . .	۳ر
۴۳	امیر تیمور	۲ر۷ //
۴۴	پرتھوی راج	۲ر۸ //
۴۵	محمود غزنوی	۲ر۶ //
۴۶	مصر کی داستان . . .	۳ر
۴۷	جاپان کی کہانی . . .	۴ر
۴۸	چین کی کہانی . . .	۳ر۶ پائی
۴۹	مستورات چین وجاپان . .	۴ر
۵۰	ایران کی کہانی . . .	۲ر
۵۱	ایشیائی روم	۲ر۷ پائی
۵۲	ٹرکی (یورپی روم) . . .	۲ر۸ //
۵۳	لنکا	۱ر۱۱ //
۵۴	بصرہ وبغداد	۵ر
۵۵	یونان	۲ر
۵۶	تین سوال	۲ر۷ پائی
۵۷	امرت ورشا . . .	۳ر۱۰ //
۵۸	زمانہ سلف کے قصے کہانیاں نمبر ا داؤد بادشاہ	۲ر۶ //
۵۹	کہانیاں بتیس پتلیاں حصہ اول	۲ر۹ //
۶۰	" دوم "	۴ر۵ //
۶۱	خوفناک خواب	۲ر
۶۲	ہیرا لال	۲ر۶ //
۶۳	دولت کی پٹاری . .	۲ر۱ //
۶۴	سادھو کی چٹکی	۲ر
۶۵	نیلا باز	۲ر۱۱ //

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۶۶	بہادر شہزادہ	۲ر۱ پائی
۶۷	جوتی موتی	۲ر۱۰ //
۶۸	جواہرات کا خزانہ . .	۳ر۷ //
۶۹	چھوا اور سونا ہوا باتصویر	۲ر
۷۰	علی بابا چالیس چور .	۴ر
۷۱	علاؤ الدین و عجیب وغریب لیمپ	۴ر۶ پائی
۷۲	ملا دو پیازے کا سفر	۳ر
۷۳	سادھو کنور سدھارتھ یعنی مہاتما بدھ کا دھرم گیان	۳ر
۷۴	نیشاپور کا سوداگر . . .	۲ر۱۱ پائی
۷۵	پرستان کا موچی . . .	۳ر
۷۶	سندر پیاری . . .	۳ر
۷۷	چاندی کی کنجی . . .	۳ر
۷۸	سلک جواہر نمبر ا (حکمرانی کا گر)	۲ر۶ پائی
۷۹	" " نمبر ۲ (اوج قسمت)	۱ر۱۱ //
۸۰	" " نمبر ۳ (شہید الفت)	۱ر۶ //
۸۱	سلک جواہر۔ مرد میدان	۱ر۶ //
۸۲	" " نیک وبد	۱ر۹ //
۸۳	" " عیب وہنر	۱ر۴ //
۸۴	" " جہاں گرد	۱ر۹ //
۸۵	" " جواب باصواب	۱ر۱۰ //
۸۶	" " سخاوت کی انتہا	۱ر۲ //
۸۷	" " حسن تدبیر	۱ر۶ //
۸۸	ڈرامہ نئی بستی یعنی شہرت . . .	۱ر۳ پائی
۸۹	ڈرامہ غم خوار عالم . . .	۱ر۷ //

نمبرشمار	نام کتاب	قیمت
۹۰	مہاراجہ بکرماجیت اور اس کا تخت	۱/۶ پائی
۹۱	سنہری گیت حصہ اوّل	۲/۴ 〃
۹۲	〃 〃 〃 دوم	۲/۴ 〃
۹۳	〃 〃 〃 سوم	۲/۷ 〃
۹۴	جو مانگو	۳/
۹۵	اسرارِ دل . . .	۵/
۹۶	جارج واشنگٹن . .	۱/۶ پائی
۹۷	سکاؤٹوں کا بادشاہ . .	۱/۸ 〃
۹۸	لوہے کا بادشاہ . .	۱/۹ 〃
۹۹	صابن کا بادشاہ . .	۱/۱ 〃
۱۰۰	آزادی کا بادشاہ . .	۱/۱۱ 〃
۱۰۱	ڈاکو کی مرمت	۲/۶ 〃
۱۰۲	چھو منتر	۴/۵ 〃
۱۰۳	فرصت کے کام	۳/۴ 〃
۱۰۴	دنیا کے کام کاج . .	۵/۵ 〃
۱۰۵	آداب و اخلاق . . .	۱۰/
۱۰۶	موقعہ	۵/۴ 〃
۱۰۷	نیک اطوار	۲/
۱۰۸	خوشی کا کھیل . . .	۳/۱ پائی
۱۰۹	بہادر محمود	۱/۷ 〃
۱۱۰	سہراب و رستم . . .	۲/۱ 〃
۱۱۱	دھوپ چھاؤں . . .	۳/
۱۱۲	راجہ ہریش چندر . .	۲/

نمبرشمار	نام کتاب	قیمت
۱۱۳	سنہری پرندہ	۲/۱ پائی
۱۱۴	گورو کے پانچ بچن . . .	۱/۸ 〃
۱۱۵	کرشن جی کا بچپن . . .	۱/۴ 〃
۱۱۶	تبدیل قسمت	۱/۹ 〃
۱۱۷	جادو کا قلعہ	۳/
۱۱۸	راجہ گوپی چند . . .	۱/۷ 〃
۱۱۹	بندر کی ہوشیاری .	۱/۶ 〃
۱۲۰	بارہ بھائی	۱/۱۰ 〃
۱۲۱	مشاہیرِ عالم حصہ اوّل .	۳/
۱۲۲	〃 〃 〃 دوم .	۳/
۱۲۳	〃 〃 〃 سوم .	۳/

کتب لائبریری

برائے لوئر و اپر مڈل سکولز

نمبرشمار	نام کتاب	قیمت
۱	رسوم ہند حصہ اوّل	۲/۶ پائی
۲	〃 〃 〃 دوم	۷/۴ 〃
۳	تخت سلیمانی . . .	۸/۷ 〃
۴	الٰہ دین چراغ . . .	۴/۶ 〃
۵	راماین کی کہانی . . .	۸/۲ 〃
۶	مہابھارت کی کہانی . . .	۵/۶ 〃
۷	پیارا گورو نانک . .	۳/۷ 〃
۸	سید انشاء اللہ خاں انشا	۴/۱ 〃
۹	سوانح عمری نواب مرزا خان داغ	۴/۲ 〃

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز ایجوکیشنل پبلشرز لاہور

Printed and published by L. Moti Ram, Manager, for Messrs. R.S.M. GULAB SINGH & SONS, at the Mufid-i-Am Press, Chatterji Road, Lahore.

نمبر ۲

رجسٹرڈ نمبر ایل ۳۷۹۷

منظور کردہ جناب ڈائرکٹر صاحب بہادر سررشتہ تعلیم پنجاب
بموجب سی ایم نمبرہ ۳۵۴ ۱۱ سی مورخہ ۲۲ رمئی سنہ ۱۹۳۶ء

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اردو ایڈیشن

زیر ادارت
خان بہادر شیخ نور الٰہی، ایم اے، آئی ای ایس
بشیر احمد ہاشمی ایم اے - ایم - ای - ڈی پی ای - ایس
پروفیسر گوپال داس کھنہ، ایم اے، بی ٹی

Vol. 5. May. 1938. No. 2.

سالانہ چندہ : چار روپے

مفید اللغات اُردو

منظور کردہ جناب ڈائرکٹر صاحب پبلک انسٹرکشن پنجاب
بموجب سرکلر نمبر G-25307 مورخہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۳۶ء

یہ کتاب محکمۂ تعلیم پنجاب کے منظور شدہ مدارس و دیگر مکاتب کی ضروریات اور عام طلبہ و شائقین کی سہولت کے لئے نہایت کوشش، محنت اور عرقریزی سے تیار کی گئی ہے۔

اس کتاب میں ہزاروں الفاظ عربی، فارسی، پنجابی، ترکی، انگریزی وغیرہ زبانوں میں جلی قلم سے مع ان کے اعرابوں کے نہایت صحت اور صفائی سے دئیے گئے ہیں اور ہر لفظ کے مقابلے میں اس کے معنی نہایت خوبی اور صفائی سے پیش کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب عمدہ سفید کاغذ پر نہایت خوشخط چھپی ہے اور کپڑے کی خوبصورت سنہری جلد سے مزین ہے۔

قیمت فی جلد دو روپے (عہ)

المشتہران

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز

ایجوکیشنل پبلشرز، لاہور

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اُردو ایڈیشن

جلد (۵) | مئی ۱۹۳۸ء | نمبر (۲)

فہرستِ مضامین

ایڈیٹوریل

لفظِ تعلیم علم سے مشتق ہے اور علم کے معنی ہیں جاننا۔ اس لیے تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ بچّے کو ہر پیش آنے والے معاملے سے آگاہی دی جائے اور چونکہ زندگی بے انتہا گوناگوں ہوگئی ہے، اس لیے معلّم کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وُہ متعلّم کو ہر آنے والے قضیے سے آگاہ کر سکے۔ لیکن یہ ضرور ممکن ہے کہ ایسے جسمانی اور دماغی خصائص متعلّم میں پیدا کر دیے جائیں، جو اُس کی بقائے حیات اور ارتقائے حیات کا کفیل ہو سکیں۔ معلم حقیقتاً ایک نگہبان ہے، جو ایک نشو و نما پانے والی شخصیت کو بڑی احتیاط کے ساتھ زیرِ نظر رکھتا ہے۔ چونکہ اس کے متعلّم کے لیے قدم قدم پر حفاظت، مدد اور ہدایت کی ضرورت رونما ہوتی رہتی ہے۔ جسمانی اور دماغی پرورش اور تربیت حقیقی معنوں میں ماں باپ کے آغوش اور گھر ہی سے شروع ہو جاتی ہے۔ یہ مضغۂ گوشت یہیں وجود میں آیا ہے اور یہی مناسب جگہ ہے، جہاں اس کی اخلاقی تربیت بھی کی جائے۔ جیسے کہ مادری زبان کی ابتدا چند ٹوٹے پھوٹے کلمات اور غوں غاں سے شروع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اخلاقی تربیت کی ابتدا گھر کے ماحول اور والدین کے طرزِ معاشرت اور طریقۂ زندگی کی ناقص نقل سے شروع ہو جاتی ہے۔ بچّے کی ابتدائی فطری خواہشات اس کی جسمانی ضروریات کی طرح والدین کے مطالعہ، مشاہدہ اور تربیت و تہذیب کی محتاج ہوتی ہیں۔ بُری خواہشات اور

بیجا ضروریات کی بیخ کنی کرنا۔ عمدہ، مناسب اور نیک فطری خواہشات کو ترقّی دینا اور انھیں بچّے کے جذباتی ہیولیٰ میں حل اور پیوست کر دینا۔ نیک و بد، کذب و راستی میں تفریق، اور پھر خذ ما صفا اور دع ما کدر کی صلاحیت پیدا کرنا ابتدائی تعلیم کا مقصد ہے۔

بچّہ اپنی ادنیٰ سی ادنیٰ ضروریات کے لیے بھی اپنے والدین کی توجہ کا محتاج ہوتا ہے اور یہ احتیاج ہی ابتداً اسے اپنے سے بڑوں کے احکامات کی تعمیل پر مجبور کرتی ہے۔ ہم میں سے یہ کسی نے نہیں دیکھا کہ وہ ناسمجھ بچّہ جس کی ضرورت محض حصولِ غذا ہے، اوروں کے مقابلے میں اپنی ماں کے یا انّا کے احکامات کی تعمیل اور خواہشات کا لحاظ زیادہ کرتا ہے، لیکن ممکن ہے بعض والدین اسے پسند نہ کریں کہ بچّے پر کسی قسم کا استبداد روا رکھا جائے۔ میں خود شدّت سے اس کے خلاف ہوں۔ مگر اس ابتدائی تربیت کو مستبدانہ نہیں سمجھتا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ایک خاص عمر تک بچّہ خود مناسب فیصلہ کرنے کی قوت نہیں رکھتا، تو والدین اور معلّم کا یہ فرض ہے کہ وہ دخل انداز ہوں، لیکن اس طرح کہ جب بچّہ سنِ شعور کو پہنچ جائے اور جوں جوں شعور کے مدارج طے کرتا جائے، وہ ان تمام ابتدائی احکامات کو صرف احکامات سمجھ کر ہی نہیں، بلکہ احسن اور مناسب طرزِ عمل سمجھ کر اختیار کرے۔

ہیئتِ اجتماعی کی منظم تقسیم خدمات پر مبنی ہے اور غالباً انسانی زندگی کی تاریخ میں کوئی دور بھی ایسا نہیں آیا کہ جب انسان بحیثیت مجموعی اپنی تمام ضروریات کا بذاتِ خود کفیل رہا ہو۔ ابتدائی زندگی میں شاید چند ضروریات کے ماتحت چند پیشہ ور ہی اپنے اپنے فن میں اکتساب کرتے تھے، لیکن جوں جوں ہماری ضروریاتِ زندگی بڑھتی گئیں، اُسی قدر نئے نئے پیشہ ور وجود میں آتے گئے۔ یقین کے ساتھ نہیں بتایا جا سکتا کہ کون سا پیشہ سب سے پہلے وجود میں آیا۔ مگر یہ یقینی امر ہے کہ معلّمی کا پیشہ دنیا کے سب سے

پُرانے پیشوں میں سے ایک ہے۔ اس کی ظاہر وجہ تو انسان کی سہل انگاری معلوم ہوتی ہے کہ وُہ اپنی اولاد کی خود تربیت کرنے کے عوض معلّم کی خدمات حاصل کر لیتا تھا، لیکن واقعہ یہ نہیں۔ ایک نوعمر بچّے کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ ایک جوان شخص کے وقت کا صحیح مصرف کر سکے۔ اس بچّے کو صرف اطلاعات حاصل کرنے اور موقع عمل پانے کی ضرورت ہوتی ہے اور اس لیے اگر ہر ایک شخص ایک یا دو بچوّں کی تعلیم میں مصروف ہو جائے، تو حقیقتہً دنیا کا نصف سے زیادہ حصّہ اپنی زندگی بمصداق کوہ کندن اور کاہ برآوردن گزارتا نظر آئے، اس لیے معلّم کی ضرورت درپیش آئی۔ قطع نظر اس کے یہ امر بھی غور طلب ہے کہ معلّمی کے لیے فن تعلیم کے اصول و قواعد سے شناسائی بے حد ضروری ہے اور اگرچہ اصول و قواعد جانے بغیر بھی ایک شخص اطفال کو تعلیم کر سکتا ہے، مگر اس معلّم کی حیثیت میری نگاہ میں اس طبیب سے زیادہ نہیں، جو صرف اللہ کے بھروسے پر بغیر کسی طبّی تعلیم کے مریضوں کو بہکانے کے لیے آمادۂ علاج ہو جاتا ہے۔ اگر اس طبیب کے علاج سے مریض شفا پا جائے، تو سخت جان ہے اور اگر مر جائے، تو بالکل حق بجانب ہے۔ یہ افسوسناک امر ہے کہ ہندوستان میں اب تک جاہل معلّموں اور مردم کش طبیبوں کی روک تھام کے لیے کوئی انتظامات نہیں کیے گئے۔ لیکن یہ وقت بعید نہیں کہ جلد ہی ہمیں احساس نقصان ہو جائے اور ہم ان ہر دو جماعتوں کی مشق ستم سے آزاد ہو جائیں۔ اب تک انگریزی حکومت کے ماتحت معلّم کی حیثیت اور رُتبے میں کوئی نمایاں ترقی نہیں ہُوئی اور وُہ عزّت، جو کچھ صدی پہلے ہندوستان میں معلّم کو میسّر تھی، ابھی کچھ اور زمانے تک معلّم کو حاصل نہ ہو گی۔ مَیں اس کساد بازاری کے متعلق کچھ عرض کرنا نہیں چاہتا۔ اس کے مختلف

اور بیشمار وجوہ ہیں۔ مَیں صرف یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ معلّم میں چند خصوصیات بالضرور موجود ہونی چاہییں۔ والدین اور ان اصحاب کو جو معلّمین کو اپنے بچّوں کا سرپرست بنانا چاہتے ہیں، اس امر کا یقین کر لینا چاہیے کہ معلّم اپنے علم میں مکمل ہونے کے علاوہ اعلیٰ اخلاق سے متّصف ہے۔ وُہ بچّے کے جسمانی اور دماغی حالات دونوں کی بہتری مدِ نظر رکھتا ہے اور بچّے کی فطرت کا گہرا مطالعہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

وار دھا کمیٹی کی رپورٹ کا ضمیمہ

از

مقبول بیگ بدخشانی، بی اے، سنٹرل ماڈل اسکول، لاہور

کاتنے اور بننے کی بنیادی اور مفصّل اسکیم

سات سال کا نصاب

نصاب کا خاکہ

۱ - نصاب کو دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے :-

ا - کاتنے کا کورس

ب - بننے کا کورس

۲ - ابتدائی تعلیم کے پہلے پانچ سال سوت کاتنے میں صرف ہونا چاہییں اور آخری دو سال سوت بننے میں۔ اس میں طلبہ کو بڑھئی اور لوہار کا ابتدائی کام بھی سکھانا چاہیے۔

۳ - ہر سال چھے چھے ماہ کی دو ٹرموں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اس صورت سے طلبہ کی ترقی کا زیادہ صحیح اندازہ ہو سکیگا۔

۴ - سوت کاتنے اور سوت کو صاف کرنے کا کام اسکولوں میں صرف عملی مشق کے طور سے جاری کیا جائے۔ اُس روئی کے سوائے جو کتائی اور بنائی میں مشق کے طور سے استعمال کی جائے، تمام روئی دستی بیلنے میں بیلی گئی ہو۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہوگا کہ کھیتوں سے صاف صاف کپاس چُنی جائے، جو پتّیوں کے ریزوں اور

کرموں کی ملاوٹ سے پاک ہو۔

۵ ۔ جو طلبہ اُونچے درجے میں تعلیم پاتے ہوں، انھیں چاہیے کہ نچلے درجے کے طلبہ کے لیے پونیاں تیار کریں، چونکہ وہ پونیاں بنانے کے لیے روئی کی تہیں اپنے لیے نہیں لگا سکتے ۔

۶ ۔ معلّموں کو اس بات پر خاص توجہ دینا چاہیے کہ سوت کاتنے کے ابتدائی درجے سے آخری درجے تک تاگا بالکل ہی ضائع نہ ہو۔ نہ تکلی پر اور نہ چرخے پر۔ کاتنے اور دُھنتے وقت اگر دس فیصدی ضائع ہو جائے، تو اعتراض کی بات نہیں۔ تاگے کی قیمت مقرر کرتے وقت اس امر کا لحاظ رکھ لیا جاتا ہے۔ بہرحال اس مقدار سے زیادہ روئی کسی صورت میں بھی ضائع نہ ہونا چاہیے ۔

۷ ۔ اگر آٹھ سے بارہ نمبر تک کا سوت کاتنا مقصود ہو، تو "روزیم" سے کم درجے کی روئی استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ تیرہ نمبر کا سوت تیار کرنا ہو یا اس سے زیادہ نمبر کا تو اس صورت میں لمبے لمبے ریشوں کی روئی مثلاً ورنام، سورتی، کمبو دیا، سجے دنت اور پنجابی امریکن استعمال کرنا چاہیے ۔

۸ ۔ دستکاری سکھانے کے لیے جو وقت مقرر کیا جائے، وہ دن بھر میں تین گھنٹے اور بیس منٹ سے کم نہ ہونا چاہیے۔ سال بھر میں کام کرنے کے دن ۲۸۸ ہونگے یا یوں سمجھیے کہ مہینے میں چوبیس دن اوسطاً ۔

۹ ۔ نصف سالہ ٹرم کے خاتمے پر جو مال کسی خاص مقرر کیے ہوئے عرصے میں نکاس ہوگا، وہی آزمائش کا معیار سمجھا جائیگا۔ روزانہ مال نکاس کا اندازہ اس مال سے کیا جائیگا، جو اوسطاً تین گھنٹے اور بیس منٹ کے حساب سے نکاس ہوگا۔

۱۰ - بیماری یا اس قسم کی دوسری وجہ پیدا ہو جانے سے غیر حاضریاں بھی ہو جاتی ہیں۔ ان غیر حاضریوں کا لحاظ رکھتے ہوئے کل مقررہ نکاس مال کا ۲۵٪ وضع کر لیا گیا ہے۔

پہلا سال ——— پہلی ٹرم

سوت کاتنا

۱ - کورس کے پہلے وقفے میں نیچے لکھے ہوئے طریق سکھانا چاہییں :-

(ا) کپاس کو صاف کرنا۔

(ب) دُھنی ہوئی کپاس کی پونیاں بنانا۔

(ج) جوڑ لگانا۔

(د) انگلیوں کے ساتھ دائیں ہاتھ سے تکلی پر کاتنا۔

گھٹنوں سے اُوپر رانوں پر

گھٹنوں سے نیچے ٹانگوں پر

(ہ) بائیں ہاتھ سے تکلی پر کاتنا لیکن بٹ دائیں ہاتھ ہی سے دینا۔

وہی تین طریقے جن کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے۔

(و) چرخے سے تاگے کو بٹنا۔ نلیاں تیار کرنا۔

۲ - کتائی دائیں اور بائیں ہاتھ سے باری باری سکھانا۔

۳ - چھے مہینے کی ٹرم کے آخر میں مقدار نکاس (اس میں نلیاں بھی خود تیار کی جائینگی) ڈیڑھ لٹی ہونا چاہیے، یعنی، ایک بند (hank.) جس میں ایک سو ساٹھ پھیرے ہوں۔

۴ - چھے مہینے تک روزانہ مال نکاس کا اوسط نمبر ۱ سوت کی ۳/۴ لٹی ہونا چاہیے۔ گویا

۴۴ادنوں کا کل نکاس مال ۷۰ گنڈیاں ہوگا، یعنی ۶۴۰ پھیروں کا ایک بند جس کا وزن ایک سیر ڈیڑھ پاؤ ہوگا۔ شرح اُجرت فی سیر ۱۲ ار ہوگی۔ اس میں دھنائی کی اُجرت شامل نہ ہو، تو یہ اُجرت ایک روپیہ ۶ پائی ہوگی۔

پہلا سال ـــــــ دوسری ٹرم

۱ ۔ اِس ٹرم میں دھنائی سکھانا چاہیے۔

۲ ۔ چھے مہینے کے آخر میں دھنائی کا نکاس (پونیاں بھی خود ہی بنائی جائینگی) ۲½ تولے فی گھنٹہ تک ہونا چاہیے۔

۳ ۔ چھے مہینے کے آخر میں کتائی کی رفتار (اس میں نلیاں بنانا بھی شامل ہے) اتنی ہونا چاہیے کہ تین گھنٹوں میں ۱۰ سوت کی دو لٹیاں تیار ہوسکیں۔

اس میں تکلی پر کتائی کا اوسط نکاس (دھنائی سمیت) اتنا ہونا چاہیے کہ تین گھنٹوں میں ۱۰ سوت کی ۱¼ الٹی کاتی جائے۔ کل نکاس مال سینتالیس گنڈیاں ہوگا۔ جس کا وزن ۲¼ سیر ہوگا۔ اُجرت (دھنائی سمیت) ارروپیہ ۶ آنے فی سیر کے حساب سے ۲ روپیہ ۸ آنے ۶ پائی ہوگی۔

دوسرا سال ـــــــ پہلی ٹرم

۱ ۔ اس ٹرم میں کپاس بیلنا سکھایا جانا چاہیے۔

۲ ۔ پہلے پہل ایک چوبی تختے اور لوہے کے ڈنڈے کے ذریعے کپاس بیلنا سکھایا جائے۔ اس صورت میں نکاس اگر نصف گھنٹے میں ایک چھٹانک تک پہنچ جائے، تو پھر طلبہ کو استعمال کے لیے دیہات کے عام رائج الوقت چرخے دیے جائیں۔

۳ ۔ چھے مہینے کے آخر میں نکاس مال نصف گھنٹے میں بیس تولے تک ہونا چاہیے۔

۴ ۔ اس ٹرم کے آخر میں دھنائی کا نکاس (پونیاں بھی خود ہی بنائی جائینگی) تین تولے فی گھنٹہ تک ہونا چاہیے ۔

۵ ۔ ٹرم کے آخر میں تکلی کی کتائی (اس میں نلیاں بنانا بھی شامل ہے) اتنی ہونا چاہیئے کہ تین گھنٹوں میں نکاس ۱۰ سوت کی ۲ ½ لٹیوں تک پہنچ جائے ۔

۶ ۔ ٹرم کے آخر میں تکلی سے کتائی کا نکاس (دھنائی سمیت) تین گھنٹوں میں ۱۲ سوت کی ۲ ¾ لٹی تک ہونا چاہیے ۔ کل نکاس مال ۴۶ گنڈیاں ہوگا جن کا وزن ۲ سیر ۱۰ چھٹانک ہوگا ۔ اُجرت ۱ روپیہ ۶ آنے فی سیر کے حساب سے (دھنائی سمیت) ۳ روپے ۹ آنے ۹ پائی ہوگی ۔ اس میں ۴ ربیلائی کی اُجرت شامل کر لی جائے، تو کل اُجرت ۳ روپے ۱۳ آنے ۹ پائی ہوگی ۔

دوسرا سال ــــــ دوسری ٹرم

۱ ۔ اس ٹرم میں طلبہ کو ویراودا چرخے پر کتائی سکھائی جائے ۔ جس میں دو رُخہ تکلا لگا ہُوا ہو ۔

۲ ۔ اس چرخے پر باری باری دائیں اور بائیں ہاتھ سے کتائی سکھانا چاہیے ۔

۳ ۔ ٹرم کے آخر میں دھنائی کا نکاس (جس میں پونیاں بنانا بھی شامل ہے) ۲ ½ تولے فی گھنٹہ تک ہونا چاہیے ۔

۴ ۔ ٹرم کے آخر میں تکلی سے کتائی کا نکاس (اس میں نلیاں بنانا بھی شامل ہے) تین گھنٹوں میں ۱۲ سوت کی ۲ ½ لٹیاں ہونا چاہییں ۔

۵ ۔ ٹرم کے آخر میں چرخے سے کتائی کا نکاس (اس میں نلیاں تیار کرنا بھی شامل ہے) اتنا ہو جائے کہ تین گھنٹوں میں ۱۶ سوت کی ۳ ¾ لٹیاں تیار ہو سکیں ۔

۶ - اس ٹرم میں کتے ہوئے تاگے کے نمبروں کا اندازہ لگانے کا طریق سکھایا جائے طلبہ کو اس قابل بنایا جائے کہ وُہ عملی طور سے اور پوری سمجھ کے ساتھ کام چلا سکیں۔

۷ - اس ٹرم میں چرخے سے کتائی کا روزانہ اوسط نکاس (اس میں دھنائی بھی شامل ہے) نمبر ۱۲ سوت کی ۲½ لٹیاں ہونا چاہییں۔ کل نکاس مال ۹۰ گنڈیاں ہوگا۔ جن کا وزن ۳ سیر ۳½ چھٹانک ہوگا۔ اُجرت (دھنائی سمیت) ا روپیہ ۶ آنے فی سیر کے حساب سے ۵ روپے ۳ آنے ۶ پائی ہوگی۔ اس میں ۴ آنے بیلنے کی اُجرت شامل کرلی جائے، تو کل آمدنی ۵ روپے ۷ آنے ۶ پائی ہوگی۔

تیسرا سال ——— پہلی ٹرم

سوت کاتنا

۱ - اس ٹرم میں طلبہ اس قابل ہو جائیں کہ وُہ روئی کی مختلف قسموں کو پہچان سکیں۔ ریشوں کی لمبائی کا اندازہ کرلیں اور یہ معلوم کرسکیں کہ خاص خاص قسموں کی روئی سے کون کون سے نمبر کا سوت تیار ہوگا۔

۲ - اس ٹرم کے آخر میں دھنائی کا نکاس (اس میں پونیاں بنانا بھی شامل ہے) ۴ تولے فی گھنٹہ تک ہونا چاہیے۔

۳ - اِس ٹرم میں تکلی سے کتائی کا نکاس (نلیاں بھی خود تیار کی جائینگی) اتنا ہونا چاہیے کہ تین گھنٹوں میں نمبر ۱۲ سوت کی ۲½ لٹیاں تیار ہو جائیں۔

۴ - ٹرم کے آخر میں تکلی سے کتائی کا نکاس (اس میں نلیاں تیار کرنا بھی شامل ہے) اتنا ہونا چاہیے کہ تین گھنٹوں میں نمبر ۲۰ سوت کی ۳¾ لٹیاں تیار ہو جائیں۔

۵ - اس ٹرم کی کتائی کا روزانہ اوسط نکاس (دھنائی سمیت) تین گھنٹوں میں نمبر ۲۰

سوت کی ۲ ۱/۲ لٹیاں ہوگا۔ کل نکاس مال ۹۰ گنڈیاں ہوگا۔ جن کا وزن ۲ ۱/۴ سیر ہوگا۔ اُجرت (دھنائی سمیت) ۲ روپے ۴ آنے فی سیر کے حساب سے ۵ روپے ۱ آنہ ہوگی۔

تیسرا سال ——— دوسری ٹرم

۱۔ ٹرم کے آخر میں تکلی سے کتائی کا نکاس (اس میں نلیاں بنانا بھی شامل ہے) اتنا ہونا چاہیے کہ تین گھنٹوں میں نمبر ۲۰ سوت کی ۴ ۱/۲ لٹیاں تیار ہوجائیں۔

۲۔ ٹرم کے آخر میں چرخے سے کتائی کا نکاس (اس میں نلیاں بنانا بھی شامل ہے) اتنا ہونا چاہیے کہ تین گھنٹوں میں نمبر ۲۰ سوت کی ۴ ۱/۲ لٹیاں تیار ہوجائیں۔

۳۔ کتائی کا روزانہ اوسط نکاس (دھنائی سمیت) تین گھنٹوں میں نمبر ۲۰ سوت کی ۳ ۱/۴ لٹیاں ہوگا۔ کل نکاس مال ۱۷ گنڈیاں ہوگا۔ جن کا وزن ۱۴ ۱/۲ چھٹانک ہوگا۔ کل اُجرت (دھنائی سمیت) ۲ روپے ۴ آنے کے حساب سے ۶ روپے ۸ آنے ۹ پائی ہوگا۔

چوتھا سال ——— پہلی ٹرم

۱۔ اس ٹرم میں طلبہ کو نیچے لکھے ہوئے مضمون سکھانا چاہییں اور اس طرح کہ ان کا آپس میں ربط و تعلق بھی ہو۔

(ا) تاگے کی مضبوطی اور صفائی کیوں کر معلوم کی جائیگی۔

(ب) نکاس مال کا اندازہ ن/س کے گُر کے ذریعے کیوں کر کیا جائیگا۔ یہاں "ن" سے نکاس مال مراد ہے اور "س" سے سوت کا نمبر مراد ہے۔

۲۔ اِس ٹرم میں طالب علم اس قابل ہوجانا چاہیے کہ بیلنے کی مشین اور دُھننے کی کمان کی خود مرمّت کر سکے۔

۳ - چھے مہینے کے آخر میں چرخے سے کتائی کا نکاس (اس میں نلیاں تیار کرنا بھی شامل ہے) اتنا ہونا چاہیے کہ تین گھنٹوں میں ۲۴ سوت کی ۴½ لٹیاں تیار ہو جائیں

۴ - کتائی کا روزانہ اوسط نکاس (دھنائی سمیت) اتنا ہوگا کہ ۲۴ سوت کی ۳½ لٹیاں تیار ہو سکیں۔ کل نکاس مال ۱۲۶ اگنڈیاں ہوگا۔ جن کا وزن ۲ سیر ۱۰ چھٹانک ہوگا۔ کل اُجرت (دھنائی سمیت) ۲ روپے ۱۴ آنے فی سیر کے حساب سے ۷ روپے ۸ آنے ۹ پائی ہوگی۔

چوتھا سال ——— دوسری ٹرم

۱ - اِس ٹرم میں طلبہ کو نیچے لکھے ہُوئے مضمون سکھانا چاہییں۔

(ا) ویراودا چرخے کے مختلف جزوں کا علم اور ان کی مرمت وغیرہ۔

(ب) بانس کی لکڑی سے تکلی تیار کرنا۔

۲ - ٹرم کے آخر میں تکلی سے کتائی کا نکاس (اس میں نلیاں تیار کرنا بھی شامل ہے) اتنا ہونا چاہیے کہ تین گھنٹوں میں ۱۴ سوت کی ۳ لٹیاں تیار ہو سکیں۔

۳ - ٹرم کے آخر میں چرخے سے کتائی کا نکاس (اس میں نلیاں تیار کرنا بھی شامل ہے) اتنا ہونا چاہیے کہ تین گھنٹوں میں ۲۸ سوت کی ۵ لٹیاں تیار ہو سکیں۔

۴ - کتائی کا روزانہ اوسط نکاس (دھنائی سمیت) تین گھنٹوں میں ۲۸ سوت کی ۳½ لٹیاں ہونا چاہییں۔ کل نکاس مال ۱۲۶ اگنڈیاں ہوگا۔ جن کا وزن ۲¼ سیر ہوگا۔ اُجرت ۳ روپے ۱۰ آنے فی سیر کے حساب سے ۸ روپے ۲ آنے ۶ پائی ہوگی۔

پانچواں سال ——— پہلی ٹرم

سوت کاتنا

۱ ۔ اِس ٹرم میں طلبہ کو اندھرا کے طریق پر کپاس بیلنا اور کپاس دھننا سکھایا جائے۔ کتائی اس حد تک سکھانا چاہیے کہ طلبہ نمبر ۱۲ کا سوت کات سکیں لیکن کتائی ویراودا چرخے کے ذریعے ہی سے ہوگی ۔

۲ ۔ ٹرم کے آخر میں کتائی کا نکاس (نلیاں تیار کرنا بھی اس میں شامل ہے) اتنا ہونا چاہیے کہ دو گھنٹوں میں نمبر ۱۴ سوت کی دو لٹیاں تیار ہو سکیں ۔

۳ ۔ اس ٹرم میں طلبہ کو ماگان چرخے پر بھی سوت کاتنا سکھانا چاہیے ۔

۴ ۔ ٹرم کے آخر میں ماگان چرخے سے کتائی کا نکاس (نلیاں بنانا بھی شامل ہے) اتنا ہونا چاہیے کہ ایک گھنٹے میں نمبر ۲۴ سوت کی ۲½ لٹیاں تیار ہو سکیں ۔

۵ ۔ کتائی کا روزانہ اوسط نکاس (بیلائی اور دھنائی سمیت) ویراودا چرخے کے ذریعے اتنا ہونا چاہیے کہ تین گھنٹوں میں نمبر ۱۴ سوت کی ۱½ الٹی اور ماگان چرخے پر دُھنائی سمیت نمبر ۲۴ سوت کی ۱½ الٹی تیار ہو سکے ۔

۶ ۔ چھے مہینے کا کل مال نکاس نمبر ۱۴ سوت کی ۵۴ گنڈیاں ہوگا۔ ان گنڈیوں کا وزن نصف سیر ایک چھٹانک ہوگا اور ۵۴ گنڈیاں نمبر ۲۴ سوت کی ہونگی۔ جن کا وزن ایک سیر دو چھٹانک ہوگا ۔

۷ ۔ نمبر ۱۴ سوت کی اُجرت ۶ روپے ۴ آنے فی سیر کے حساب سے ۳ روپے ۸ آنے ۳ پائی ہوگی اور نمبر ۲۴ کی اُجرت ۲ روپے ۴ آنے فی سیر کے حساب سے (دھنائی سمیت) ۳ روپے ۳ آنے ۹ پائی ہوگی ۔ اس وقفے کی کل آمدنی ۶ روپے ۱۲ آنے ہوگی۔

پانچواں سال ــــــ دوسری ٹرم

۱ ۔ اس ٹرم میں طلبہ کو نمبر ۱۶ سوت کاتنا سکھایا جائے ۔

۲ - نیچے لکھے ہوئے مضمون علمی طریق سے پڑھائے جائیں اور اس صورت میں کہ ان کا آپس میں ربط و تعلق بھی ہو۔

(ا) تاگے کی لمبائی، جو ایک گز کپڑا بننے کے لیے کافی ہو۔

(ب) کسی خاص نمبر کا سوت کاتنے کے لیے ایک انچ میں کتنے بٹ دیے جائیں گے۔

(ج) چرخے کے چکّر اور تکلے کے پھیروں کی باہمی نسبت۔

۳ - اس ٹرم میں طلبہ کو یہ بھی جاننا چاہیے کہ تکلا سیدھا کیونکر کیا جائیگا۔

۴ - اس ٹرم میں طلبہ کو مختلف قسم کے چرخوں مثلاً ویراودا، ماگان اور ساولی وغیرہ سے پوری پوری واقفیت ہونا چاہیے۔

۵ - اس میعاد کے آخر میں تکلی سے کتائی کا نکاس (دھنائی سمیت) اتنا ہونا چاہیے کہ تین گھنٹوں میں ۱۶ سوت کی ۳ لٹیاں تیار ہو سکیں۔

۶ - ٹرم کے آخر میں کتائی کا نکاس (بیلائی اور دھنائی سمیت) اتنا ہونا چاہیے کہ ۲۰ سوت کی دو گھنٹوں میں دو لٹیاں تیار ہو سکیں۔ کتائی کا نکاس (دھنائی سمیت) اتنا ہو کہ گھنٹے بھر میں ۲۸ کے سوت کی تین لٹیوں تک پہنچ جائے۔

۷ - اس ٹرم میں کتائی کا روزانہ اوسط نکاس اتنا ہو گا کہ ۲۰ سوت کی ۱/۴ ۱ لٹیاں تیار ہو جائیں اور دو لٹیاں ۲۸ کے سوت کی کل نکاس مال ۲۰ سوت کی ۴۵ گنڈیاں ہو گا۔ ان کا وزن ۶ چھٹانک ہو گا اور ۲۷ گنڈیاں ۲۸ سوت کی ہونگی جن کا وزن ایک سیر ۱/۴ ۴ چھٹانک ہو گا۔

۸ - ۱۰ سوت کی اُجرت ۱۱ روپے ۴ آنے فی سیر کے حساب سے ۴ روپے ۳ آنے ۶ پائی اور ۲۸ کے سوت کی اُجرت ۳ روپے ۱۰ آنے فی سیر کے حساب سے ۴ روپے

۱۰ آنے ۳ پائی ہوگی۔ کل آمدنی ۸ روپے ۱۳ آنے ۹ پائی ہوگی۔

پانچ سال کے لیے ہر ایک طالب علم کی کل آمدنی

پہلا سال	۳ روپے ۹ آنے
دوسرا سال	۹ روپے ۵ آنے ۳ پائی
تیسرا سال	۱۱ روپے ۹ آنے ۹ پائی
چوتھا سال	۱۵ روپے ۱۱ آنے ۳ پائی
پانچواں سال	۱۵ روپے ۹ آنے ۹ پائی
کل آمدنی	۵۵ روپے ۱۳ آنے

اس میں سے ۲۵ فیصدی وضع کرلی جائے، تو پانچ سال کی کل آمدنی ۴۱ روپے ۱۳ آنے ۹ پائی رہ جاتی ہے۔

کپڑا بُننے کا باب

۱۔ کپڑا بُننے کی دستکاری کچھ اتنی وسیع ہے کہ دو سال کے عرصے میں طلبہ کو اس کی پوری پوری تربیت نہیں دی جاسکتی۔ اس کے لیے دو مختلف طریق تجویز کیے گئے ہیں۔ اسکول چاہیں تو ہر دو کے لیے سامان مہیّا کردیں اور طلبہ کو اختیار دیں کہ جونسا وہ چاہیں اختیار کرلیں۔ بہرحال یہ دو سالہ کورس ان ہر دو میں ابتدائی مشق کا کام دے گا۔ جو طلبہ اس دستکاری میں پوری پوری واقفیت حاصل کرنا چاہیں، وُہ اس میعاد کے بعد یہ کام جاری رکھ سکتے ہیں۔

۲۔ اس منزل کو پہنچتے تک طالب علم کی عمر صرف تیرہ چودہ سال ہی کی ہوگی۔ اس لیے وہ کورس جس کا تذکرہ کیا گیا ہے، ابتدائی سی قسم کا ہے۔

۳ - پانچ سال کی تعلیم کے بعد طلبہ کو سوت کاتنے کی اچھی خاصی مہارت ہو جائیگی، اس لیے اسے اسکول کے ٹائم ٹیبل میں شامل نہیں کیا گیا۔ لیکن طلبہ کو چاہیے کہ اپنے اپنے گھروں میں کتائی کو جاری رکھیں۔ اسکول کے ذریعے کوئی ایسا انتظام ہو جانا چاہیے کہ طلبہ اس سوت کی قیمت وصول کر سکیں، جو وہ اپنے اپنے گھروں میں تیار کرینگے۔ یہ قیمت چاہے نقدی کی صورت میں ہو، چاہے کپڑے کی صورت میں۔

پہلا سال

۱۔ کپڑا بُننے کا کورس، کتائی کی طرح چھے چھے مہینوں کی ٹرموں میں تقسیم نہیں کیا گیا، بلکہ بننے کی دستکاری کی خاصیت کو نظر کے سامنے رکھتے ہُوے سال سال کی ٹرموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۲ - پہلے سال میں طلبہ کو نیچے لکھے ہُوے طریق سکھانا چاہییں۔

(ا) نلیاں تیار کرنا۔

(ب) ریلنگ۔

(ج) تاگوں کو جوڑنا

(د) تانے کی مشین پر تانا بنانا۔

(ہ) ۱۔ سوت کو پھیلانا اور بکھیرنا۔
۲۔ ماڑی لگانا۔

(و) دستی کھڈّی پر دوہرا تانا بُننا۔

۳ - سال کے آخر میں اُوپر لکھے ہُوے طریقوں کے ذریعے نکاس مال حسب ذیل ہوگا۔

ا۔ بٹنا	ایک گھنٹے میں پانچ گنڈیاں ۔
ب ۔	ایک گھنٹے میں تین گنڈیاں ۔
ج ۔ تاگوں کو جوڑنا	ایک گھنٹے میں ۲½ پنجام (۶۰ سوراخوں والی کنگی میں)
د ۔ تانا بننا	〃 〃 〃 〃 〃 (〃 〃 〃 〃)
ہ ۔ (۱) سوت پھیلانا اور بکھیرنا (۲) ماڑی لگانا	دونوں ہی تین گھنٹوں میں۔
و ۔ تیار شدہ نلیوں سے بننا۔	تین گھنٹوں میں دو گز ۔

۴ ۔ اِن طریقوں سے ہر ایک طالب علم کے بُنے ہُوئے کپڑے کی کل لمبائی ۱۰۸ گز ہوگی۔

۵ ۔ اُجرت ۱۲ آنے ۶ پائی فی دس گز کے حساب سے ۸ روپے ۷ آنے ہوگی ۔

دوسرا سال

۱ ۔ اِس سال میں بھی طلبہ دوہرے تانے سے بُننے کی مشق جاری رکھیں لیکن نمونے کے کپڑے مثلاً شہد کی چھتوں کی طرح کے تولیے اور رنگدار کوٹوں کے کپڑے بُننا سکھائے جائیں ۔

۲ ۔ اس سال میں طلبہ کو سکھایا جائے کہ کسی خاص قسم کے پنجام کی تیاری کے لیے جس نمبر کا سوت درکار ہو، اُس کا اندازہ کیونکر کیا جائیگا۔

۳ ۔ سال کے آخر میں (جاپانی کھڈی پر تیار شدہ نلیوں سے) تین گھنٹوں میں ۳½ گز بنائی کا نکاس ہونا چاہیے ۔

۴ ۔ سال بھر کے عرصے میں ہر ایک طالب علم ۲۱۶ گز کپڑا بنے گا شرح اُجرت ایک آنہ ۳ پائی فی گز ہوگی۔ کل اُجرت ۱۶ روپے ۱۴ آنے ہوگی ۔

دو سال کے لیے ہر ایک طالب علم کی آمدنی

پہلا سال .. .. ۸ روپے ۷ آنے

دوسرا سال - .. .. .. - ۱۶ روپے ۱۴ آنے

میزان - .. .. - .. ۲۵ روپے ۵ آنے

۲۵ فیصدی آمدنی وضع کرلی جائے، تو دو سال کی کل آمدنی ۱۸ روپے ۱۵ آنے ۹ پائی ہوگی -

نواڑ اور دری بُننا ــــ پہلا سال

۱ - اِس شعبے میں طلبہ کو نیچے لکھے ہُوئے مضمون سکھانا چاہییں -

تاگے کو بٹ دینا -

رسّی بنانا -

تانا بنانا -

اڈّے تیار کرنا -

نواڑ، دری، آسن اور مختلف قسم کی چٹائیاں بنانا -

۲ - پہلے سال میں طلبہ کو سفید، رنگدار دریاں، نواڑ، فیتے، سفید اور رنگدار آسن اور سفید دریاں بُننا سکھائی جائیں -

۳ - نواڑ، آسن اور دریاں بُننے کی اُجرتیں مختلف ہوں گی - یہ اُجرتیں عام کپڑے کی بُنائی سے زیادہ ہونگی - ایک طالب علم کی سال بھر کی اُجرت اندازاً ۸ روپے ۱۳ آنے ۹ پائی شمار کی گئی ہے -

دوسرا سال

۱ - اس سال میں طلبہ کو رنگدار دریاں اور چٹائیاں بُننا سکھائی جائیں۔ چونکہ یہ دریاں اور چٹائیاں مختلف قسم کی ہونگی، اس لیے سارا سال انہی دستکاریوں پر صرف کیا جائیگا۔

۲ - اِن کی اُجرت وہی ہوگی، جو عام بُنائی کی ہے، یعنی ۱۶ روپے ۱۴ آنے۔

سات سال کی کل آمدنی

کتائی	۴۱ روپے ۱۳ آنے ۹ پائی
بُنائی	۱۸ روپے ۱۵ آنے ۹ پائی
کل آمدنی	۶۰ روپے ۱۳ آنے ۶ پائی

معلّموں کی تنخواہیں ۲۵ روپے ماہانہ کے حساب سے شمار کی گئی ہیں۔

معلّموں کی کل تنخواہ ۲۱۰۰ روپے

۳۰ طالب علم ایک معلّم کی نگرانی میں ہونگے۔ ان کی سات سال کی کل آمدنی ۱۸۵۰ روپے ہوگی۔

عام تجویزیں

۱ - یہ اسکیم اگرچہ خاص تفصیل کے ساتھ دی گئی ہے، لیکن اسے آخری اور مکمل اسکیم نہیں کہا جاسکتا۔ اس میں اصلاح اور ترمیم کی گنجائش ہے۔ نیچے لکھی ہوئی ضروری باتوں پر خاص توجہ دینا چاہیے۔

۲ - یہ اسکیم معلّموں کی تنخواہوں کی مشکل کو بڑی حد تک حل کر دیتی ہے۔

۳ - کام کرنے کے کل دنوں میں ۲۵ فی صدی وضع کر لیے گئے ہیں۔

۴ - ہمارا مقصد یہ ہے کہ ان دستکاریوں کو تعلیم دینے کا وسیلہ بنایا جائے۔ یہ مقصد

ہرگز نہیں کہ طلبہ کو یہ دستکاریاں سکھا دی جائیں اور بس۔ اس لیے نکاس کا اندازہ کم سے کم لگایا گیا ہے۔

۵۔ اُجرتیں "آل انڈیا کاتک سبھا" کی مہاراشٹر برانچ کی اُجرتوں کے حساب سے مقرر کی گئی ہیں۔

۶۔ یہ ہوسکتا ہے کہ جو آمدنی یہاں درج کی گئی ہے، اصل آمدنی سے بھی زیادہ ہو، لیکن یہ کسی صورت میں ممکن نہیں کہ اس سے کم ہو۔ اگر اس سے کم ہو، تو سمجھنا چاہیے کہ سکھانے والے اچھے نہیں یا اوزاروں میں کوئی عیب ہے۔

۷۔ اوزار وغیرہ جو نیچے کی فہرست میں درج کیے گئے ہیں۔ عام تعلیم کے لیے اس طور سے استعمال کرنا چاہییں کہ وُہ طلبہ کی دلچسپیوں کے مرکز بن جائیں۔

۸۔ یہ بات دیکھنے کے لیے کہ طالب علم نے مطلوبہ مہارت حاصل کرلی یا نہیں۔ اس کی اُجرت دیکھی جائیگی، جو اُس نے آٹھ گھنٹے روزانہ کام کرکے دو مہینوں میں یعنی ۴۸ دنوں میں حاصل کی ہے۔ اگر ۴ آنے فی یوم کے حساب سے اُس نے ۱۲ روپے کما لیے، تو وُہ آزمایش پر پورا اتر گیا ورنہ نہیں۔

۹۔ کورس پورا کرلینے کے بعد یہ اسکیم طلبہ کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وُہ اپنی ضرورتیں آپ پوری کرسکیں۔

۱۰۔ پہلے سال میں تکلی پر کتائی سارے طلبہ کو ایک ساتھ سکھانا چاہیے۔

۱۱۔ موسیقی، تکلی یا چرخے کی زیر و بم کے ساتھ ساتھ سکھانا چاہیے۔ اس سے کام خوشگوار ہو جائیگا اور نکاس مال بھی زیادہ ہوگا۔

۱۲۔ اُمید کی جاتی ہے کہ پہلے سات سالوں کی نسبت دوسرے سات سالوں میں اور

زیادہ کامیابی ہوگی ۔

۱۳۔ طلبہ اگر چاہیں کہ اپنا نصاب پورا کرنے کے بعد اسکول میں کچھ اور عرصے کے لیے ٹھیر جائیں، تو انھیں اجازت ہوگی، لیکن شرط یہ ہوگی کہ گھر والوں کو مالی امداد دیں۔ اسکول کی طرف سے کچھ ایسا انتظام بھی ہوجانا چاہیے کہ وہ اپنے اپنے گھروں میں کتائی کا کام جاری رکھ سکیں اور محنت کا معاوضہ حاصل کرسکیں ۔

متعلّقہ ضروری اشیا کی فہرست

سوت کاتنے کا شعبہ

تکلی	ایک آنہ ۹ پائی
نلی	ایک آنہ
جس میں تکلی چڑھائی جاتی ہے ۔	۲ آنہ
یرادوا چرخہ	۲ روپے ۸ آنے
چرخے کی نلی	۲ آنے
تیل کی کپی	ا آنہ
متفرقات	ایک آنہ ۳ پائی
میزان	۳ روپے ا آنہ

کپاس بیلنا

چوبی تختہ	۲ × ۶ × ۱	ایک آنہ
سوٹی		۴ آنے
دیہاتی بیلنا		ا روپیہ ۱۰ آنے

مچھلی کا کانٹا	۴ آنے
میزان	۲ روپے ۳ آنے

کپاس دھننا:

درمیانی کمان	۸ آنے
ضرب لگانے والا	۲ آنے
پونیاں بنانے کے لیے چوبی تختہ	۴ آنے
دستہ	۳ آنے
پونیاں بنانے کی کائی	۱ آنہ
تندی وغیرہ	۷ آنے
چٹائی	۲ آنے
اندھرا کمان	۵ آنے
میزان	۲ روپے

اوزار:

ہتھوڑا	۷ آنے
آئرن	۸ آنے
ریتی	۱ روپیہ
چورسی	۹ آنے
چھوٹی آری	۸ آنے
رندا	۱ روپیہ

برما .. .. ۲ روپے ۱۲ آنے

چاقو .. .. ۴ آنے

قینچی .. .. ۶ آنے

پیچ کس .. .. ۶ آنے

ترازو (چھوٹا) $\frac{1}{16}$ تولہ سے ۲ تولے تک ۲ روپے

ترازو (بڑا) چھٹانک سے ایک سیر تک ۳ روپے

میزان .. .. ۱۲ روپے ۱۲ آنے

میزان کل .. .. ۲۰ روپے

نوٹ: متعلقہ اشیا اور اوزاروں کی قیمتیں اندازے سے ہی لگائی گئی ہیں، اس لیے ممکن ہے کہ اصل قیمتوں سے کچھ کم و بیش ہوں۔

کپڑا، دری اور نواڑ بننے کے لیے متعلقہ اشیا کی فہرست

نواڑ:

بٹ دینے والا چکر .. .. ۱ روپیہ ۸ آنے

اڈا .. .. ۸ آنے

ضرب لگانے والا پنجہ .. .. ۱ روپیہ

میزان .. .. ۲ روپے ایک آنہ

آسن اور دریاں:

بُننے کا اڈا .. .. ۱۲ آنے

پنجہ .. .. ۸ آنے

نشست . . . . . . ۱۲ آنے

میزان . . . . . ۲ روپے

تانا:

چکری .. .. ۴ آنے

نلی . . .. ۱ آنہ

سپول .. .. ۶ پائی

ٹین کی نلیاں .. .. ۱۲ آنے

تانا بُننے کا چکّر .. .. ۱ روپیہ ۸ آنے

تانا بُننے کا فریم .. .. ۲ روپے

ٹوکریاں .. .. ۷ آنے

رسیاں .. .. ۷ آنے ۶ پائی

میزان .. .. .. ۵ روپے ۸ آنے

ماڑی لگانا:

ساگوان کے پول .. .. ۳ روپے ۴ آنے

بانس کے پول ۸ آنے

دو برش ۵ روپے

میزان .. .. ۸ روپے ۱۲ آنے

بُننا:

کنگھیاں .. .. ۳ روپے

دستی کھڈی	۱ روپیہ ۸ آنے
جاپانی کھڈی	۷ روپے
تانا لپیٹنے کا رول	۱ روپیہ ۸ آنے
گیلی	۲ روپے ۸ آنے
ہموار کرنے کی شیشی	۱۲ آنے
گز	۳ آنے
پول وغیرہ	۱ روپیہ
موٹے رستے	۱ روپیہ ۸ آنے
میزان	۱۹ روپے ۱۱ آنے

اڈّے بنانا:

ریل	۱ روپیہ
لکڑی کی مینخیں وغیرہ	۴ آنے
متفرقات	۱۲ آنے
میزان	دو روپے
کل میزان	۴۰ روپے

قیمتیں اندازے سے ہی لگائی گئی ہیں، ممکن ہے خاص خاص مقامی حالات میں یہ قیمتیں اصل قیمتوں سے مختلف ہوں ۔

سات درجوں کے اسکول کے لیے کتائی، دھنائی اور بُنائی کے ضروری سامان کی فہرست:

	شرح فی عدد	قیمت خرید
(۱) ۱۲۵ بند ہوجانے والے چرخے	۲ روپیہ ۸ آنے	۳۱۲ روپے ۸ آنے
(۲) ۲۵ دھنائی کے سٹ مع ضروری اشیا (اندھرا کمان اس میں شامل نہیں)	۱ روپیہ ۱۱ آنے	۴۲ روپے ۳ آنے
(۳) ۵۰ تکلی اور ۵۰ نلیاں	۲ آنے ۹ پائی	۸ روپے ۹/۶ پائی
(۴) ۵ دستی بیلنے	۱ روپیہ ۱۰ آنے	۸ روپے ۲ آنے
(۵) ۱۵ چوبی تختے اور تانبے کی میخیں	۵ آنے	۴ روپے ۱۱ آنے
(۶) ۵ ماگان چرخے	۶ روپے	۳۰ روپے
(۷) ۵ ساولی چرخے	۱ روپیہ ۴ آنے	۶ روپے ۴ آنے
(۸) بڑھئی کے کام کے اوزار	۲۵ روپے	
(۹) ۲۰ کھڈیاں مع دیگر ضروری اشیا	۲۵ روپے	۵۰۰ روپے
(۱۰) متفرقات		۶۲ روپے ۱۰/۶ پائی
میزان	۱۰۰۰ روپے	

قیمتیں اندازے سے لگائی گئی ہیں مختلف جگہوں پر یہ قیمتیں مختلف ہوتی ہیں۔ اور بدلتی بھی رہتی ہیں ۔

سرمایہ :

روئی	۳۰۰ روپے
کتائی کے چرخے اور ضروری اشیاء	۱۰۰ روپے
پونیاں اور بنائی کے جملہ اسباب کا سٹاک	۱۰۰ روپے
میزان	۵۰۰

چین کی جمہوری حکومت کے دور میں ثانوی تعلیم

از

احباب اللہ ایم۔ ایس۔ سی۔ بی۔ ٹی علیگ مسلم یونیورسٹی

چین ایک وسیع ملک ہے جس کا رقبہ ۸۱۵،۳۲۲،۴۱۵ مربع میل ہے۔ اور آبادی ½۴۴ کروڑ ہے۔ ہندوستان کی طرح یہ بھی ایک زراعتی ملک ہے۔ اور اس کی آبادی تمام رقبے پر پھیلی ہوئی ہے ✦

جمہوری حکومت کے قائم ہونے سے افسران حکومت اس کوشش میں رہے ہیں کہ تمام ملک کے باشندوں میں تعلیم پھیل جائے۔ اِس مضمون میں ہم چین میں ثانوی تعلیم کے مسائل اور اُن کے حل کرنے کی تدابیر پر بحث کرینگے ✦

دسمبر ۱۹۳۲ء میں قومی حکومت نے مڈل اور نارمل مدارس کے متعلق قوانین نافذ کئے جن قوانین کی رو سے مڈل نارمل اور صنعتی مدارس کے جداگانہ قیام کے اصول کو تسلیم کرلیا گیا۔ مارچ ۱۹۳۲ء میں وزارت تعلیم نے ثانوی تعلیم کے متعلق مفصل قوانین وضع کئے جن پر جون ۱۹۳۵ء میں نظر ثانی کی گئی۔ سال ۱۹۳۲ء کے قوانین اور سال ۱۹۳۵ء کے قواعد ہی وہ بنیاد ہیں جن پر چین کی ثانوی تعلیم کا دارومدار ہے ✦

مڈل اسکول

مڈل اسکول کی غرض و غایت ایسی ابتدائی تربیت کا تسلسل ہے جس سے قوم کے بچوں کے جسم و دماغ کی تربیت اور اُن کا نشوونما ہو اور جو نیک اور قوم پرور شہری

پیدا کرے اور اس کے ساتھ ہی وہ اعلےٰ اور مخصوص تعلیم کے لئے ایک ابتدائی مرحلے کا کام بھی دے ۔ مڈل سکول جونیئر اور سینیر درجوں پر مشتمل ہے ۔ جو ایک ساتھ یا علیحدہ علیحدہ قائم کئے جا سکتے ہیں ۔ جونیر مڈل سکول میں ابتدائی مدارس کے پاس شدہ طلبہ اور وہ طلبہ جو تعلیم میں ان کے برابر ہوں داخل کئے جاتے ہیں ۔ مگر دوسری صورت میں تعداد، داخل شدہ طلبہ کے مجموعے سے تیس فیصدی سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے ۔ اور سینیر مڈل اسکول میں صرف جونیر مڈل اسکول کے فارغ التحصیل طلباء داخل کئے جاتے ہیں ۔ اگرچہ جونیر مڈل اسکول کے برابر کا کوئی امتحان پاس کرکے بھی بعض طلبہ داخل کر لئے جاتے ہیں لیکن ان کی تعداد کل کی بیس فیصدی تک محدود ہے تمام ملک میں مڈل اور ابتدائی مدارس بکثرت کھولے جا رہے ہیں جس کی وجہ سے ان درجوں کے برابر باہر کے تعلیم یافتہ طلباء کی تعداد قانون کی معین کردہ تعداد سے کم ہوتی جا رہی ہے ۔ جونیر مڈل اسکول کے طلبہ کی عمر ۱۲ سے ۱۵ سال تک اور سینیر مڈل سکول کے طلبہ کی عمر ۱۵ سے ۱۸ تک مقرر کی گئی ہے ۔ کسی ایک جماعت میں پچاس سے زائد یا پچیس سے کم طلبہ نہیں رکھے جاتے ۔

مذہبی تعلیم

جونیر مڈل سکول کے نصاب میں چینی اور انگریزی زبانیں ۔ تواریخ ۔ جغرافیہ ۔ ریاضی ۔ طبعیات ۔ کیمیا ۔ حیوانیات ۔ دینیات ۔ حفظانِ صحت ۔ مصوری ۔ موسیقی ۔ دستکاریاں اور جسمانی تربیت شامل ہیں اور سینیر مڈل اسکول کے نصاب میں مدنیت (Civics) چینی اور انگریزی زبانیں ۔

تواریخ۔ جغرافیہ۔ ریاضی۔ طبعیات۔ کیمیا۔ حیوانیات ونباتات منطق۔ حفظانِ صحت۔ مصوری۔ موسیقی۔ تربیت جسم اور فوجی تعلیم شامل ہیں۔ لڑکیوں کے لئے فوجی تعلیم کے بجائے فوجی ابتدائی طبی امداد Military First Aid) ہے۔ مگر سینیر مڈل اسکول میں خاص خاص حالات کے ماتحت منطق۔ حفظانِ صحت۔ مصوری اور موسیقی کے بجائے ملکی زبانیں مثلاً منگولی۔ تبتی یا غیر ملکی زبانیں مثلاً فرانسیسی۔ جرمن۔ روسی یا جاپانی لی جاسکتی ہیں۔

جونیر مڈل اسکول میں تعلیمی گوشوارے کے مطابق ہفتے میں ۴۸ گھنٹے رکھے گئے ہیں۔ جن میں ۳۴ سے ۳۶ گھنٹے تو جماعت میں کام کے لئے اور ۱۲ سے ۱۴ گھنٹے طلبہ کے ذاتی مطالعے کے لئے تھے۔ اسی طرح سینیر مڈل سکول میں ہفتے کے ۶۰ گھنٹے مقرر تھے جن میں ۳۱ سے ۳۶ گھنٹے تو جماعت میں حاضری کے لئے اور ۲۴ سے ۲۹ طلبہ کے ذاتی مطالعے کے لئے رکھے گئے تھے لیکن یہ اوقات بچوں کے لئے ایک غیر معمولی بوجھ کا باعث ثابت ہوئے چنانچہ اس مسئلے پر غور کرنے کے لئے وزیر تعلیم نے ماہرین فن تعلیم کی ایک کانفرنس منعقد کی جس میں طویل بحث وتمحیص کے بعد فروری ۱۹۳۶ء میں اوقات بندی کا ایک نیا گوشوارہ تیار کیا گیا۔ جس کی رو سے جونیر مڈل اسکول کی جماعتوں میں تعلیم کے لئے ۲۵ سے ۳۱ گھنٹے اور سینیر مڈل اسکول کی جماعتوں میں کام کے لئے ۲۴ سے ۳۰ گھنٹے مقرر کیے گئے فن تعلیم کے ماہرین نے محسوس کیا کہ تعلیمی اوقات کی اس کمی سے جو

وقت بچے اُسے طلبہ کی آزادانہ نشوونما کے لئے صرف کرنا چاہیے۔

نارمل اسکول

سال ۳۲ء کے نارمل اسکولوں کے قوانین اور ان سے متعلقہ سال ۳۵ء کے جاری کردہ قواعد کے موافق نارمل اسکولوں کا مقصد ابتدائی مدارس کے لئے ایسے معلّم تیار کرنا ہے جن کی جسمانی اور روحانی تربیت خاص نظم وضبط کے ماتحت ہوئی ہو۔ نارمل اسکول کے طلبہ کو جونیئر مڈل اسکول کا سند یافتہ ہونا ضروری ہے۔ اور اس کا نصاب تین سال کا ہے کسی ایک جماعت میں طلبہ کی تعداد زیادہ سے زیادہ ۵۰ اور کم سے کم ۲۵ رکھی گئی ہے۔ اس میں مدنیت۔ حیوانیات و نباتات چینی زبان، تواریخ، جغرافیہ ریاضی، طبعیات، کیمیا، حفظانِ صحت، جسمانی تربیت پڑھائے اور سکھلائے جاتے ہیں۔ لڑکیوں کے لئے فوجی تعلیم کے بجائے ابتدائی فوجی طبی امداد رکھی گئی ہے اس کے ساتھ ساتھ انہیں فنون لطیفہ منطق۔ علم تعلیم کے ابتدائی اصول۔ تعلیمی نفسیات تعلیمی پیمائش اور اعداد و شمار و ابتدائی مدارس کے مضامین اور دستکاریاں وغیرہ ہم پڑھائے اور سکھلائے جاتے ہیں۔ تدریس کی مشق اور تعلیمی تجربوں پر خاص طور سے زور دیا جاتا ہے۔ طلبہ کو پڑھانے کی مشق میں آسانیاں بہم پہنچانے کی غرض سے نارمل اسکولوں کے ساتھ ابتدائی مدارس اور کنڈرگارٹنز کا الحاق کیا گیا ہے تعلیم کو عام کرنے کے لئے مقامی اضلاع نے کم نصاب کے نارمل سکول قائم کر رکھے ہیں۔ ان نارمل سکولوں کا نصاب چار سال کا ہے۔ اور ان میں ابتدائی مدارس کے فارغ التحصیل

طلبہ داخل کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح دیہاتی علاقوں کے ابتدائی مدارس کے معلموں کی تربیت کے لئے دیہاتی نارمل اسکول کھولے گئے ہیں۔

صنعتی اسکول

صنعتی مدارس کے لئے سنہ ۳۲ء میں قانون وضع کیا گیا اور ان کے متعلق مزید قواعد سنہ ۳۳ء میں نافذ کئے گئے جن پر سنہ ۳۵ء میں نظر ثانی کی گئی۔ صنعتی مدارس دو قسم کے ہیں۔ جونیئر اور سینئر۔ جونیئر صنعتی مدارس کا مقصد ملک کے نوجوانوں کو پیشوں کی معمولی تعلیم دینا ہے۔ تاکہ ان میں مختلف پیشوں کو اختیار کرنے کی صلاحیت اُبھرے اور سینئر صنعتی اسکولوں کا مقصد انہیں صنعت اور کاروبار سمبھالنے کا علم و کسب سکھلانا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی مستقبل کے لئے طلبہ کی ذہنی نشو و نما کی داغ بیل ڈالنا ہے جونیئر صنعتی اسکول میں داخل ہونے کے لئے ۱۲ سے ۱۸ سال اور سینئر صنعتی اسکول میں داخل ہونے کے لئے ۱۵ سے ۲۲ سال کی عمریں مقرر کیگئی ہیں۔

جونیئر اور سینئر صنعتی اسکولوں کی تقسیم مندرجہ ذیل طریق پر کی گئی ہے:۔

(۱) زراعتی اسکول۔ جن میں کھیتی باڑی کرنا۔ ریشم کے کیڑے پالنا۔ جنگلات کا کام۔ باغبانی، مچھلیوں اور چوپاؤں کی پرورش وغیرہم شامل ہیں۔

(۲) صنعت و حرفت کے سکول، جن میں لکڑی کا کام۔ دھات کا کام۔ معمولی الیکٹرک۔ مکنیکل اور کیمیکل انجنیئرنگ وغیرہ شامل ہیں۔

(۳) تجارتی یا منیمی کے اسکول۔ جن میں بیوپار و دیگر کاروبار۔ بک کیپنگ۔

اکاؤنٹنسی، آڈٹنگ، شارٹ ہینڈ، ٹائپ کرنا، اشتہار نویسی - اور بیمہ کا کام شامل ہیں -

(۴) امور خانہ داری کے اسکول - جن میں کھانا پکانا - سینا پرونا، کشیدہ کاڑھنا، بچوں اور بیماروں کی نگہداشت و دیگر امور خانہ داری زچگی (دایہ کا کام) وغیرہ شامل ہیں - (یہ اسکول صرف لڑکیوں کے لئے مخصوص ہیں) -

ان اسکولوں میں تعلیم کے لئے ۴۰ سے ۴۸ گھنٹے مقرر کئے گئے ہیں - جن میں ۳۰ فیصدی صنعتی مضامین کے سیکھنے میں ۲۰ فیصدی عام مضامین کی تدریس میں اور ۵۰ فیصدی عملی کام میں صرف ہوتے ہیں - چونکہ عملی کام ہر سکول کے نصاب کا ایک ضروری جزو ہے - اسلئے اسکولوں میں صنعتی معمل (یا ورکشاپ) تجربی فارم اور ایسی ہی دوسری آسانیوں کا مہیا کرنا بھی لازمی قرار دیا گیا ہے - عملی کام اسکول کے باہر کے کمپنوں اور کارخانوں میں ہوتا ہے بیوپاری فرموں کے تعاون سے بھی بہت کچھ مدد مل سکتی ہے - نصاب مضامین کا عام خاکہ اور مختلف صنعتی اسکولوں کے سازو سامان کی فہرستیں وزیر تعلیم کے جاری کردہ قواعد کی رو سے تیار کی گئی ہیں -

---

(باقی آئندہ)

ذہانت اور اُس کی پیمائش

از

اے ایچ۔ جمیل علوی، ایم۔ اے، ایم۔ بی۔ پی۔ ایس۔

(۳)

فوج میں جتنے آدمیوں کا معائنہ ہوا، اُنہیں یہ ہدایت کی گئی تھی کہ وہ امتحانی کاغذ پر اپنا پیشہ بھی تحریر کریں۔ اس طریقے سے ذہانت اور مختلف پیشوں کے باہمی تعلق کے متعلق ایک دلچسپ اور مفید حقیقت کا اظہار ہؤا۔ الف آزمائش میں آ اور بؔ درجے حاصل کرنے والے صرف وہی اشخاص تھے، جو سول انجینرنگ، اطبا، وکلا اور معلّمین کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ جؔ + میں وُہ اشخاص تھے جن کے پیشے سٹینوگرافی، کتب فروشی، محرری اور مصوری وغیرہم تھے۔ جؔ درجہ میں بڑھئی، پولیس کے سپاہی، درزی، قصاب، چھاپنے والے اور معمولی معمولی دکانوں والے لوگ شامل تھے بہشتی، باورچی، ماہی گیر، حجام اور مزدور، سب سے نچلے گروہوں (جؔ۔ دؔ) سے تعلق رکھتے تھے۔ عوام کا اندازہ بھی یہی ہے کہ ذہانت کا مختلف پیشوں سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے۔ الف آزمائش کے نتائج بھی اسی کے مطابق ہیں لیکن کسی شخص کے پیشے سے اس کی ذہانت کا اندازہ لگانے سے قبل ابتدائی تعلیم، ماحول، موقع، مزاج اور دوسرے معاشرتی اسباب کی طرف خاص توجہ دینی چاہیے۔ لیکن یہ تمام اسباب ان نتائج پر اثر انداز نہیں ہوتے، جو پیشے اور ذہانت کے باہمی رشتے کے متعلق دریافت کیے گئے ہیں۔

فوجی افسروں نے مجموعۃً الف آزمائش میں بہت ہی اعلیٰ نمبر حاصل کئے، اس حقیقت کا بھی انکشاف ہُوا کہ ایسے افسر نسبتاً زیادہ ذہین ہیں جنہیں ٹکنیکل ٹریننگ کی ضرورت ہے محکمہ انجینیری اور توپ خانے سے تعلق رکھنے والے افسر فیلڈ سگنل بٹالین سے زیادہ ذہین تھے۔ اور موخرالذکر شعبہ کے افسر کوارٹر ماسٹروں سے بہتر تھے اس آزمائش کا ایک حیران کن نتیجہ یہ تھا۔ کہ محکمہ طب کے افسروں کی میزانوں کا مجموعہ اوسطاً کم تھا۔ دوسرے وجوہ کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جہاں شعبۂ طب میں ایسی ایسی مایۂ ناز ہستیاں بھی تھیں۔ جو اعلیٰ ترین ذہانت کی مالک تھیں۔ وہاں ایسے اطبا بیشتر تھے۔ جو اس پیشے میں بالکل نکمے تھے۔ اسی وجہ سے اس گروہ کی اوسط نسبتاً کم رہی۔

فوجی الف آزمائش کے استعمال سے یہ بھی دریافت کیا گیا کہ ذہانت کا وراثت کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ اس موضوع پر ونگفیلڈ نے بھی کافی روشنی ڈالی ہے۔ ان کے نتائج سے پتہ چلتا ہے کہ جوڑوں کی صورت میں ان کا مشترک تناسب ۹۰ء ہے۔ معمولی بہن بھائیوں کی صورت میں یہ تناسب ۵۰ء ہے۔ اور چچا زاد بہن بھائیوں میں ۲۷ء ہے بعض علماء کا خیال ہے۔ کہ ایک ہی خاندان کے مختلف افراد کے مشترک تناسب کا باعث ایک ہی ماحول کا اثر ہوتا ہے لیکن چند ایک حقائق اس خیال کو باطل کر دیتے ہیں۔ اوّل یہ کہ دوسرے بہن بھائیوں کی نسبت جوڑے ایک دوسرے کے بہت زیادہ مشابہ ہوتے ہیں۔ ان دونوں کو مختلف ماحول میں رکھ کر بھی یہی ظاہر ہوا ہے کہ باہمی مشابہت میں کوئی فرق نہیں پڑا، دوسرے یہ کہ بچے پانچ سال کی عمر میں ذہانت کے لحاظ سے ایک دوسرے کے اتنے ہی مشابہ ہوتے ہیں۔ جتنے کہ سولہ سال کی عمر میں تیسرے یہ کہ ایسے مختلف خاندانوں کے بچے جن کی پرورش ایک

مدت تک ایک ہی ماحول میں کی گئی ہو۔ اکثر مختلف ہوتے ہیں ۔

برٹ نے دو مختلف مدرسوں میں ذہانت کی آزمائشیں دیں۔ ایک مدرسے کے تقریباً تمام طلبہ ایسے والدین کے بیٹے تھے۔ جو کسی نہ کسی شعبے میں اپنا نام پیدا کر چکے تھے۔ دوسرے مدرسے کے طلبہ معمولی تاجروں اور دکانداروں کے بیٹے تھے۔ دونوں مدرسے صرف لحاظ سے یا مخصوص تعلیمی پہلو سے بالکل ایک جیسے تھے لیکن پہلے مدرسے کے طلبہ کی ذہنی سطحیں دوسرے طلبہ سے بہت بلند تھیں۔ پرتیبی اور رنیسٹن نے بھی اسی قسم کی تحقیقات کی ہیں۔ انہوں نے پانچ سو سے زیادہ طلبہ کا ذہنی معائنہ کیا۔ ان کے نتائج کا ان کے آبائی پیشے سے مقابلہ کیا گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جن کے والد اعلیٰ پیشوں سے تعلق رکھتے تھے۔ (مثلاً طبیب، وکیل، انجنیئر، پروفیسر وغیرہ) ان کے گروہ کا اوسط اس گروہ کے بچوں سے زیادہ تھا۔ جن کے باپ دستکاری یا کاشتکاری کرتے تھے۔ یہی نتائج بچوں کے ایک اور گروہ سے بھی حاصل کئے گئے ہیں جن کی تعداد چھ ہزار تھی ۔

لیکن مندرجہ بالا نتائج کو استعمال کرنے میں کافی احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔ یہ درست ہے کہ بچوں کی ذہانت کا ان کے آبائی پیشے سے گہرا تعلق ہوتا ہے لیکن ذہانت پر معاشرتی ماحول کے اختلافات کے اثر کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے۔ ہمیں یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ امیر اور تعلیم یافتہ والدین کے ہاں بچے کی ذہانت کو نشوونما کا زیادہ اچھا موقع ملتا ہے +

مختلف قوموں کے نتائج کا باہمی مقابلہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ امریکہ کی افواج میں ایسے سپاہی بھی تھے۔ جو پیدائشاً کسی اور ملک کے باشندے تھے۔ ان

مختلف قوموں کے گروہوں کی ذہنی آزمائش ایک مرکّب پیمانے سے کی گئی۔ جو آٹھ الف آزمائشوں سٹینفورڈ بینے کی آزمائشوں اور چار ب آزمائشوں پر مشتمل تھا۔ اس مرکب پیمانے کی زیادہ سے زیادہ میزان ۲۵ تھی۔ اجنبی ممالک سے تعلق رکھنے والوں کے اوسط نتائج مندرجہ ذیل ہیں :-

پیدائش کا ملک	آدمیوں کی تعداد	میزانوں کا اوسط	پیدائش کا ملک	آدمیوں کی تعداد	میزانوں کا اوسط
انگلستان	۴۱۱	۱۴٫۸۷	بلجیم	۱۲۹	۱۲٫۷۹
اسکاٹلینڈ	۱۴۶	۱۴٫۳۴	آئرلینڈ	۶۵۸	۱۲٫۳۲
ہالینڈ	۱۴۰	۱۴٫۳۲	آسٹریا	۳۰۱	۱۲٫۲۷
جرمنی	۳۰۸	۱۳٫۸۸	ٹرکی	۴۲۳	۱۲٫۲۰
ڈنمارک	۳۲۵	۱۳٫۶۹	یونان	۵۷۲	۱۱٫۹۰
کینیڈا	۹۷۲	۱۳٫۶۶	روس	۲۳۴۰	۱۱٫۳۴
سویڈن	۶۹۱	۱۳٫۳۰	اٹلی	۴۰۰۹	۱۱٫۰۱
ناروے	۶۱۱	۱۲٫۹۸	پولینڈ	۳۸۲	۱۰٫۷۴

اس نقشے پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ شمالی یورپ کے ممالک کے باشندے جنوبی یورپ کے ممالک سے نسبتاً زیادہ ذہین ہیں۔ ان نتائج کو قطعی قرار دینے کے لئے کافی احتیاط کی ضرورت ہے۔ بعض علما یہ اعتراض کرتے

ہیں کہ مختلف قوموں کی ذہانت کے فرق کا باعث مختلف زبانیں اور مختلف تعلیم ہے۔ لیکن برائیگھم اس اعتراض کا جواب یہ دیتے ہیں۔ کہ تمام رنگروٹ انگریزی زبان سمجھ سکتے تھے۔ زبان کا نظریہ اس حقیقت سے بھی باطل ہو جاتا ہے کہ صرف انگلینڈ۔ سکاٹ لینڈ اور کینیڈا کے باشندے ہی اعلیٰ نہیں۔ بلکہ جرمنی، ڈنمارک، ہالینڈ، سویڈن اور ناروے کے رہنے والے بھی دوسروں کی نسبت زیادہ ذہین ہیں۔ علاوہ ازیں، بیری جنہوں نے دس ہزار امریکہ کے طلبہ پر تجربہ کیا ہے، اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سفید اقوام کے درمیان بھی ذہانت میں واضح جبلی اور قومی فرق موجود ہیں۔ ٹرمن اور دوسرے علما کے نتائج بھی اسی کے موافق ہیں +

جنگ عظیم کے بعد امریکہ میں الف آزمائش کا تجربہ ہزارہا کالج اور یونیورسٹی کے طلبہ پر کیا گیا۔ ان سے حاصل شدہ نتائج کا فوجی نتائج سے مقابلہ کیا گیا۔ عام کلیہ یہ تھا۔ کہ جتنی اعلیٰ تعلیم ہوگی۔ ذہنی کیفیت بھی اتنی ہی اعلیٰ ہوگی۔ اس کی وجہ اغلباً یہ ہے۔ کہ تعلیم بذات خود ایک انتخابی عمل ہے۔ کند ذہن اور ضعیف العقل طلبہ کالج میں شاذ و نادر ہی پہنچتے ہیں۔ اگر اعلیٰ تعلیم تک پہنچ بھی جائیں۔ تو اپنی لیاقت کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ بعض اور اسباب کی بنا پر۔ فلپس تحریر کرتے ہیں۔ "کہ ایک ہزار طلبا میں سے، جو ابتدائی درجوں میں داخل ہوتے ہیں، اوسطاً صرف چھ سو طلبا مڈل کے درجے تک پہنچتے ہیں۔ تقریباً ۱۴ طلبہ میٹرکولیشن کے درجہ تک۔ اور صرف بیس طلبا کالج کی تعلیم ختم کرتے ہیں"۔ اس میں شک نہیں کہ معاشیاتی اسباب کا تعلیم میں بہت حصہ ہوتا ہے لیکن اس کا ایک اہم اور واضح ترین سبب یہ بھی ہے۔ کہ اکثر طلبہ کا مدرسے کا کام تسلی بخش نہیں ہوتا۔

اور اسی لئے وہ اپنے کام میں دلچسپی نہ لینے کے باعث مایوس ہو جاتے ہیں۔

اس دریافت سے کہ اعلیٰ تعلیم کا اعلیٰ ذہانت کے ساتھ تعلق ہوتا ہے۔ یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ الف آزمائش صحیح معنی میں ذہانت کی پیمائش نہیں کرتی بلکہ محض مدرسے سے حاصل کی ہوئی واقفیت کی پیمائش کرتی ہے۔ ایسے افراد جو کالج کی تعلیم ختم کر چکے ہیں۔ ان کا انتخاب اسی تکمیل کی بنا پر ہی کیا گیا ہے، اور ان سے توقع بھی یہی کی جاتی تھی۔ کہ وہ اعلیٰ ترین ذہانت کا ثبوت دیں۔ الف آزمائش صحیح معنی میں ذہانت کی پیمائش کرتی ہے اور تحصیلی علوم کے اثر سے مبرا ہے۔

کالج کے طلبہ کا اوسط میزان ۱۴۰ سے ۱۷۰ تھا۔ ایک مشہور یونیورسٹی کے بعض طلبہ کی میزان ۱۵۴ تھی۔ ان سے کم معاشیات کے طلبہ کی میزان تھی۔ اور ان سے کم فن تعلیم اور زراعت کے طلبہ کی۔ اس آزمائش کے موافق اگر کالج کے کسی طالب علم کے نمبروں کی میزان ۱۰۰ سے کم ہو تو اس کا شمار کالج کے نکمے طلبہ میں ہے۔ اس سے ترقی کی امید رکھنا عبث ہے۔ وظیفہ خوار طلبہ اور الف آزمائش کا مشترک تناسب تقریباً ۶۵ء ہے۔

ذہنی آزمائشیں انفرادی ہوں یا اجتماعی، ان سب کا مقصد ایسی ذہانت کی پیمائش کرنا ہے۔ جو محض جبلی ہو۔ اور تعلیم و تربیت سے کافی حد تک بے نیاز ہو۔ ان کو تیار کرنے میں مندرجہ ذیل چار باتوں کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے۔

۱۔ ہر ایک آزمائش کا پہلے اچھی طرح امتحان کر لینا چاہئے۔ آزمائش کے نقائص تلاش کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرنا چاہئے۔ ان کا رفع کرنا

ہمارا اولین فرض ہے - مختلف مسائل کی مشکلات کی جانب خاص توجہ دینی چاہیئے۔وقت کو کافی مشق کی بنا پر مقرر کرنا چاہیئے -

۲ - ہر ایک آزمائش کا تعلق اس خاص عمر کی ذہانت سے ہونا چاہیئے ، جس کی پیمائش کے لئے کوئی ذہانت مخصوص کی گئی ہے - امیدواروں کے لئے نہ تو یہ آزمائش کافی مشکل ہونی چاہیئے۔اور نہ ہی زیادہ آسان - آزمائش کا صحیح معنی میں آزمائش ہونا ضروری ہے - اگر اس میں یہ صفت نہ ہو - تو اسے ذہنی آزمائش کہنا غلطی ہے +

۳ - آزمائش کے علیحدہ علیحدہ مسائل کو صاف اور واضح طور پر تحریر کرنا چاہیے - اگر ہدایات زبانی دینا ہوں - تو ہر ایک گروہ یا ہر ایک فرد کو ایک ہی قسم کی ہدایات دینی چاہئیں - اور ان میں الفاظ وغیرہ کا فرق بھی نہ ہونا چاہیئے -

۴ - آزمائش کے نمبر لگانے کا طریق ممتحن کی ذاتی رائے سے مبرا ہونا چاہیئے - ہر ایک سوال کا صرف ایک ہی صحیح جواب ہونا چاہیئے - تاکہ ممتحن کی اپنی رائے کا اس میں کچھ دخل نہ رہے +

ذہانت اور عمر کا ضمناً انفرادی آزمائشوں میں ذکر کیا جا چکا ہے - اجتماعی آزمائشوں کے نتائج اسی حقیقت کے موافق ہیں - کہ ذہانت کا نشو و نما ایک خاص عمر تک ہوتا ہے لیکن اس کے بعد رک جاتا ہے - اکثر آزمائشوں کے نتائج کے مواقف ذہانت کے بڑھنے کی عمر سولہ سال ہے - جہاں پہنچ کر ذہانت تو رک جاتی ہے - لیکن آدمی کے تجربات کا دائرہ بدستور وسیع ہوتا جاتا ہے - اس عمر کے مخصوص کرنے کے متعلق مختلف آرا ہیں - بعض علمائے نفسیات یہ عمر چودہ سال بتاتے

ہیں۔ بینے یہ عمر ۱۵ سال مقرر کرتے ہیں۔ آٹس اور منرو ۱۸ سال بتاتے ہیں۔
لیکن بیشتر علماء نفسیات متفق ہیں، کہ یہ عمر سولہ سال ہی ہے ۔

ڈاکٹر بیلرڈ نے دو ہزار مختلف عمروں کے اشخاص کا ذہنی معائنہ کیا۔
اس آزمائش کے زیادہ سے زیادہ نمبر ۲۴ تھے۔ مندرجہ ذیل اوسط نتائج سے یہی
معلوم ہوتا ہے کہ سولہ سال کے بعد ذہانت میں کوئی ترقی نہیں ہوتی :-

عمر	اوسط میزان	عمر	اوسط میزان
۱۱	۱۳ء۱	۱۵	۱۸ء۵
۱۲	۱۴ء۴	۱۶	۱۸ء۹
۱۳	۱۵ء۱	۱۷	۱۸ء۹
۱۴	۱۷ء۴	-	-

پروفیسر طامسن کے نتائج یہ ہیں :-

عمر	اوسط میزان	عمر	اوسط میزان
۱۰	۵۵	۱۷	۱۲۷
۱۱	۶۸	۱۸	۱۳۰
۱۲	۸۰	۱۹	۱۳۰
۱۳	۹۰	۲۰	۱۳۰
۱۴	۱۰۰	۲۱	۱۳۰
۱۵	۱۱۰	۲۲	۱۳۰
۱۶	۱۲۰	۲۳	۱۳۰

یہ دو نتائج اگرچہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن یہ حقیقت واضح ہے کہ ۱۶ اور ۱۸ سال کے درمیان ذہانت کی ترقی رک جاتی ہے۔ ذہانت کے بڑھنے کے متعلق خواہ مختلف آرا ہی کیوں نہ ہوں۔ ذن کے متعلق سب کا متفقہ فیصلہ یہی ہے کہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اگر کسی بچے کا ذن پانچ سال کی عمر میں ۱۲۰ ہے۔ تو ۱۶ سال کی عمر میں بھی اس کا ذن ۱۲۰ ہی رہیگا۔ اس لئے ذن کا تصور ہر لحاظ سے قابل اعتماد ہے۔

ذہانت کے متعلق ایک اور قابل غور سوال یہ ہے۔ کہ کیا ذہانت عروج تک پہنچ کر کم ہونا شروع ہو جاتی ہے؟ یہاں بھی علما کا آپس میں اتفاق نہیں۔ فاسٹر اور ٹیلر نے ایسے ۷۳۷ اشخاص کی ذہنی پیمائش کی ہے۔ جن کی عمر ۱۰ سال سے لیکر ۸۴ سال تک تھی نتیجہ یہ نکلا ہے۔ کہ کم از کم بڑھاپا شروع ہونے تک ذہانت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ ان کے نتائج سے یہ بھی ظاہر ہوا ہے کہ بوڑھے اشخاص غور و فکر میں ناکام نہیں رہے، بلکہ قوت حافظہ میں۔ لیکن برعکس ان نتائج کے جو تجربات امریکی افواج میں ۱۵،۰۰۰ افسروں پر کئے گئے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ افسر بیس سال کے بعد ساٹھ سال تک جوں جوں بوڑھے ہوتے جاتے ہیں۔ ان کی ذہانت میں بتدریج فرق پڑتا جاتا ہے لیکن اغلباً یہ نتائج اعتبار کے قابل نہیں مختلف عمروں کے افسروں کی اوسط میزانوں کا باہم فرق ایک ہی عمر کے علیحدہ علیحدہ افسروں کی میزانوں کے باہمی فرق سے بھی کم ہے۔ یہ بھی ممکن ہے۔ کہ مختلف عمروں کے منتخب شدہ افسر اپنی عمر کے گروہ کے اعلیٰ اور صحیح نمائندے نہ ہوں۔ اور یہ بھی ممکن ہے۔ کہ بوڑھے افسر

اپنی خوشی سے اس آزمائش میں شامل نہ ہونے کے باعث دلچسپی نہ لے رہے ہوں۔ بلکہ وہ محض مجبور ہو کر بے دلی سے یہ امتحان دے رہے ہوں۔ پروفیسر سپیرمین کا بھی یہی خیال ہے کہ مفصل حالات کا مطالعہ کیے بغیر ہم ان نتائج کی بنا پر یہ نہیں کہ سکتے کہ ذہانت عمر کی رفتار کے ساتھ ساتھ کم ہوتی جاتی ہے ایسے ہی ایک اور تجربہ سے جو ایسے ہی ۸۲۳ اشخاص پر کیا گیا تھا۔ جن کی عمر ۵ سال سے ۹۵ سال تک تھی۔ یہ نتیجہ نکلا ہے کہ ۲۹ سال تک ذہانت بدستور قائم رہتی ہے۔ لیکن اس کے بعد بتدریج کم ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اس تجربے سے یہ بھی پتہ چلا ہے۔ کہ جن اشخاص کی ذہانت بہت اعلےٰ ہے۔ ان میں ذہانت کے کم ہونے کی رفتار بہت ہی سست ہے۔ لیکن اوسط یا اوسط سے کچھ کم اشخاص کی ذہانت بہت جلد گرنے لگ جاتی ہے۔ لیکن ان تمام کو قطعی نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس موضوع پر فی الحال کافی تحقیق کی ضرورت ہے۔

اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے۔ کہ مرد عورتوں کی نسبت زیادہ ذہین ہوتے ہیں۔ لیکن ذہنی آزمائشوں سے یہ پتا چلتا ہے۔ کہ دونوں صنفوں کی ذہانت میں چنداں فرق نہیں ہوتا۔ برٹ نے لندن کے تین ہزار بچوں پر تجربہ کرنے سے یہ نتیجہ نکالا ہے۔ کہ تین سے چودہ سال تک کی عمر کی لڑکیاں لڑکوں سے قدرے زیادہ ذہین ہوتی ہیں۔ لیکن اس عمر کے بعد لڑکے ان سے ذہانت میں بڑھ جاتے ہیں۔ چھ سال کی عمر تک لڑکیاں بالخصوص زیادہ ذہین ہوتی ہیں۔ یہاں سے یہ پتہ بھی چلتا ہے۔ کہ لڑکیاں جسمانی اور ذہنی دونوں لحاظ سے جلد بالغ ہو جاتی ہیں۔ لیکن ان دونوں صنفوں کی ذہانت کا باہمی فرق بہت ہی کم ہوتا ہے۔ اتنا کم۔ کہ اسے تعلیمی معاملات

ہیں بے کھٹکے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ ٹرمن اور پرسی کے تجربات کے نتائج بھی یہی ہیں۔ بہر صورت دونوں صنفوں کی میزانیں قریب قریب ایک دوسرے کے مطابق ہیں۔

ذہانت اور سیرت کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ برٹ کے انکشافات کا نتیجہ یہ ہے کہ تقریباً ۸۰ فیصدی جرائم پیشہ اقوام سے تعلق رکھنے والے ذہانت کے لحاظ سے اوسط سے کم ہیں۔ کم از کم ۸ فیصدی ضعیف العقل ہیں۔ ماہرین نفسیات تسلیم کرتے ہیں کہ مجرمانہ زندگی بسر کرنے والوں میں ضعیف العقلی بہت ضروری حصّہ لیتی ہے۔ جرم اور کند ذہنی کے باہمی تعلق کی دریافت کچھ عجیب نہیں۔ کیونکہ جس انسان میں ذہانت موجود نہیں اس سے اعلےٰ اور اچھے کردار کی توقع رکھنا محض فضول ہے۔ ضعیف العقل بچے میں اتنی صلاحیت نہیں ہوتی۔ کہ وہ اپنی ذات کے متعلق غور و فکر کر سکے۔

ذہانت اور سیرت کے باہمی تعلق کی ایک اور عمدہ مثال یہ بھی ہے۔ کہ بالعموم کسی ایک شعبے میں ذہین آدمی زیادہ کامیابی سے قوم کی نمائندگی کر سکتا ہے۔ ذہین آدمی کی سیرت کے تمام آدمی ہی مدّاح ہوتے ہیں۔ ایسے انسان اپنی ذہانت کی وجہ سے ہر ماحول کے موافق اپنے آپ کو آسانی سے ڈھال لیتے ہیں۔ اور مشکل سے مشکل کام زیادہ مستعدی سے کر سکتے ہیں۔ آپ نے بھی اکثر ملاحظہ کیا ہوگا۔ کہ شریر بچہ بالعموم ذہین ہوتا ہے۔ سُست اور ڈھیلا بچہ اکثر کند ذہن ہوتا ہے۔ شرارت کے لئے چُستی اور ذہانت کا ہونا ضروری ہے۔ یہی بچے ایسے ہیں کہ اگر ان کو نفسیاتی اصول کے مطابق تعلیم دلائی جائے تو یہ بڑے ہو کر نام پیدا کر سکیں گے۔

اس حصے کے آخر میں کچھ اپنے ملک کے متعلق بھی تحریر کرنا ضروری ہے
افسوس ہے کہ اس موضوع پر کسی عالم نے روشنی ڈالنے کی زحمت برداشت نہیں
کی ہماری تعلیم کے ناقص ہونے کا ایک بہت بڑا سبب یہ بھی ہے کہ نہ تو بچے
کی ذہانت کی صحیح صحیح پیمائش کی جاتی ہے۔ اور نہ ہی اسے اس کی ذہانت کے موافق
تعلیم دلائی جاتی ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں پہلے سال کے طلبہ کا ذہنی معائنہ
کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ سب آزمائشیں انگریزی زبان میں ہیں۔ اور ان کا معیار بھی
امریکہ کے معیار کے موافق ہے۔ یہاں ابھی تک کسی نے کوشش نہیں کی کہ اسے
ہندوستان کے لئے یا کم از کم ہندوستانی زبان جاننے والوں کے لئے معیاری
قرار دیا جائے۔ سنٹرل ماڈل سکول لاہور میں بھی ایسی آزمائشیں استعمال کی جاتی ہیں
لیکن وہ بھی انگریزی ہی کا ترجمہ ہیں جن کو معیاری نہیں قرار دیا گیا۔ ظاہر ہے۔
کہ ایسی آزمائشوں سے کیا فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

تعلیم اپنے جدید مفہوم میں

از

محمد شریف صاحب، ہیڈ ماسٹر، مڈل اسکول بلھڑوال

(گزشتہ سے پیوستہ)

بیرونی تحریکات نے اصل تعلیم کو بہت نقصان پہنچایا ہے تعلیم پہلے ہی سے کتابی واقفیت کا نام تھا۔ ان امور نے اس واقفیت علمی میں بھی بہت کمی کر دی۔ حقیقتاً آج ملک کو ایسے مضامین کی ضرورت نہیں ہے جو صرف علمی مواد طالب علم کے دماغ میں بھر دیں کیونکہ یہ بات اس وقت تک کے لئے کسی قدر مفید تھی جب تعلیم صرف حصولِ ملازمت کے لئے تھی۔ اب یہ مقصد خواب وخیال بنکر رہ گیا ہے۔ اور وقت آگیا ہے کہ تعلیم اور طریقۂ تعلیم کو مدعا و مفہوم تعلیم کے مطابق ترمیم کر دیا جائے۔ اب کتابی واقفیت میں وقت ضائع کرنا ایسی غفلت کا مترادف ہے۔ جس کا اثر ہندوستان آئندہ کی نسل پر بُرا پڑ رہا ہے۔ یاد رکھو! محض نسخہ کسی کو اچھا نہیں کر سکتا۔ جب تک باقاعدہ اس کا استعمال نہ ہو۔ آج تک ہم نسخہ پڑھکر توقع کرتے رہے ہیں کہ بیماری نسخہ پڑھنے سے رفع ہو جائیگی یہ طریق کامیاب ثابت نہیں ہُوا۔ اس لئے اب نسخہ کو پڑھنا بھی ہے۔ اور اس کا موزوں و مناسب استعمال کرنا بھی ہے۔ اس لئے جو علم کتابوں کے ذریعہ دیا جاتا ہے، چاہیے کہ اُسے تجربہ اور عمل کی کسوٹی پر بھی رکھا جائے۔ اور جو کچھ طلبہ کو پڑھایا جائے۔

اسے حالاتِ روزمرہ اور مقامی ماحول سے مطابق کرکے دکھا دیا جائے۔ اور طالب علم کو آزادی دی جائے کہ وہ سوال کرے۔ آج تک مدرس سوال کرتا چلا آیا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ طالب علم کو اتنی جرأت ہو کہ وہ مدرسین پر سوال کرے جس اسکول کے طالب علم مدرس پر سوال نہیں کرتے، اپنے شکوک و شبہات رفع نہیں کرتے بہت دشوار ہے کہ اسکول کی تعلیم اپنے اصل مدعائے مقصود کی حامل ہو سکے۔ اب ہمیں طلبہ کو امتحانات کے تیار کرنے کے بجائے آئندہ زندگی کے لئے طیار کرنا ہے ؂

جب ہمارے اور طلبہ کے تعلقات میں اس قسم کی مفید آزادی آجائیگی۔ تو قدرتاً حکام معائنہ اور مدرسین کے تعلقات بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکینگے۔ ان کا کام بھی تنقید و تنقیص کے بجائے مربیانہ اور دوستانہ مشورہ ہو جائیگا۔ آج اگر آپ معائنے کے لفظ سے گھبراتے اور پریشان رہتے ہیں، تو اس وقت آپ بیقراری سے افسرانِ معائنہ کی آمد کا انتظار کیا کریں گے ؂

یہ اس وقت ہوگا۔ جب ہم اسکول کو طلبہ کیلئے بہشت بنادیں۔ اور طلبہ اگر ہم سے ایسے مانوس نہ ہو سکیں۔ تو کم از کم ہماری موجودگی ان کے لئے وحشت و دہشت کا موجب بھی نہ ہو ؂

موجودہ طرزِ عمل نے طلبہ کی فردیت کو بھی ضائع کر دیا ہے۔ درحالیکہ یہی ایک بات طلبہ کی اخلاقی جسمانی، اور ذہنی ترقی کے لئے نہایت مفید ہوتی ہیں مجبور ہوں، اس کو ذرا کھول کر بیان کروں کہ اگر آپ افسر معائنہ سے ایسی محبت اور خلوص کی توقع کرتے ہیں کہ آپ کو ان کے حضور ہر قسم کی آزادی سے گفتگو کرنے کا حق حاصل ہو۔ اور اگر خدا کرے یہ بات پیدا ہو جائے۔ تو آپ کے اطمینانِ قلب اور سکون

دماغ میں کس قدر اضافہ ہو۔ تو پھر آپ طلبہ کے لئے کیوں نہیں ایسے حالات پیدا کر دیتے کہ آپ سے مل کر گفتگو کر کے سبق پڑھ کر انہیں بھی ایک نوع کی مسرت اور روحانی خوشی حاصل ہو۔ ہم نے اب تک طالب علم کی آزادی اور اس کے احساس کی تربیت نہیں کی ہم اس پر اعتماد نہیں کرتے۔ بسا اوقات شک وشبہ اور ظن وگمان انسانی بچے کے ان اوصاف حسنہ کو ضائع اور گم کر دیتے ہیں۔ جو قدرت نے اس میں ودیعت کیے ہوتے ہیں۔ جب آپ کسی شخص یا بچے کے متعلق کچھ عرصہ یہ اپنا شک اس پر ظاہر کریں۔ کہ وہ چور اور جھوٹا ہے۔ اگر وہ چور نہیں اور جھوٹ بھی نہیں بولتا۔ تو کچھ عرصہ کے بعد جب وہ یہ معلوم کریگا۔ کہ مجھ پر بھروسہ نہیں کیا جاتا۔ اور میری خودداری کو ضائع کیا جا رہا ہے تو وہ بڑا ہو کر سنگ دل، وہمی اور بزدل ہو جائیگا۔ جس بچے کی شفیق نگرانی کی بجائے مشکوک ومشتبہ نگرانی کی جائے۔ ہمیشہ اس کا کھوج لگاتے رہیں، اور اس کی جاسوسی کی جائے۔ بہت دشوار ہے کہ اس میں کیریکٹر کی شرافت اور حوصلہ کی فراخی پیدا ہو سکے۔ بچے کا یہ خیال کہ ہم اس پر اعتماد نہیں کرتے۔ اس کی جاسوسی میں لگے رہتے ہیں۔ اس کی طبیعت کے جوش اور حوصلے کے ولولے کو سرد اور افسردہ کر دیگا۔ وہ اس ملازم کی طرح خائن ہو جائیگا۔ جس کا آقا اس کے متعلق اپنے شکی خیالات کو ترقی دینے میں مصروف رہتا ہے۔ وہ بچہ جس کے متعلق یہ خیال ہو۔ کہ وہ نکما اور کام چور ہے۔ غفلت اور فراموشی اس کی عادت ہے یقیناً ڈھیٹ اور ضدی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور خیال کر لیتا ہے۔ کہ واقعی ایسا ہی ہے۔ جیسا اس کے نگران اور استاد خیال کر رہے ہیں۔ اگر آپ اپنے شاگردوں اور بچوں میں شریفانہ کیریکٹر پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ان پر اعتماد کیجئے۔ ان میں خوددارانہ جذبات پیدا کریں بات بات پر انہیں ہمت دبائیں۔ ڈانٹ ڈپٹ۔ زجر وتوبیخ اور مار پیٹ سے احتراز کریں۔

اور یاد رکھیں کہ ایک بُری طرح دبی ہوئی اور غلام بنی ہوئی نسل نہ تو ترقی و عروج حاصل کر سکتی ہے۔ اور نہ مضبوط کیریکٹر پیدا کر سکتی ہے۔ اس طرح دبایا ہوا ڈرایا ہوا۔ دھمکایا ہوا۔ رُلایا ہوا۔ ستایا ہوا سوسائٹی کا ایک فرد خواہ وہ مرد ہو یا عورت یا بچہ اخلاق کی بلندی سیرت کا علو۔ ذہن کی وسعت اور حوصلہ کی فراخی ہرگز نہیں حاصل کر سکتا ؎

تم نارمل اسکولوں میں اصول تعلیم میں پڑھتے اور یاد کرتے ہو کہ جہاں تک ہو سکے طالب علم کی ذاتی سعی سے کام لیا جا سکے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ٹریننگ اسکول کی چار دیواری سے نکل کر اس اصول کو وہاں کے صندوقوں میں بند کر آتے ہیں۔ اور سکول میں پہنچ کر ٹرینڈ مدرس اور ایک پرائمری پاس ان ٹرینڈ مدرس میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ وہ بھی آگے آگے سبق کہتا جاتا ہے۔ طلبہ اس کے پیچھے پیچھے بولتے جاتے ہیں۔ وہ بھی کمرے کا رقبہ طول × عرض پڑھاتا ہے۔ اور تم بھی بالکل یہی رٹ لگواتے ہو۔ اور طالب علم کو اس امر کا موقع نہیں دیتے۔ کہ وہ خود کمرے کا طول ماپے، عرض کی پیمائش کرے۔ رقبہ نکالے۔ اور دو تین کمروں کی پیمائش کے بعد اس نتیجہ پر خود بخود پہنچنے کی سعی کرے ؎

دراصل بات یہ ہے۔ کہ ہم نے یہاں اپنی خودداری کو ضائع کر دیا ہے وہاں طالب علم کی انفرادیت اور آزادی کو برباد کر دیا ہے ؎

جب طالب علم اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتا ہو۔ اپنی ذاتی سعی سے کام لے رہا ہو تو صرف اس کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ پرواہ نہیں اگر وہ آہستہ آہستہ لڑکھڑا کر چل رہا ہو۔ یہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ اس کا ہاتھ دوسرے کے ہاتھ میں ہو۔ اور وہ کسی دوسرے کے سہارے چلنے کا محتاج ہو ؎

زمانہ بڑی سرعت کے ساتھ ترقی کر رہا ہے۔ اور اس کی ترقی کی رفتار اتنی

تیز ہے۔ کہ نہ تو کوئی تاریخ اس کا تعاقب کر سکتی ہے۔ نہ کوئی خیال اس تک پہنچ سکتا ہے۔ اگر ہم زمانہ کے ساتھ ساتھ چلنا چاہتے ہیں۔ تو ہمیں اپنے اندر مقامی حالات وضروریات کے ماتحت مناسب تبدیلی کرنا چاہئے ۔

اب ہمیں اپنا فرض پہچاننا ہوگا۔ جس طرح کہ پہچاننے کا حق ہے ہمیں کوشش کرنے کی ضرورت ہوگی جس طرح کوشش کی جانی چاہئے۔ ہمیں نگاہوں کو وسعت دینی ہوگی۔ ایسی وسعت جس کا تقاضا حالاتِ حاضرہ کر رہے ہیں ۔

ہمارا مقابلہ جہالت سے ہے۔ اور یاد رکھنا ہوگا۔ کہ اچھا سپہ سالار وہی نہیں ہے جو صرف اپنی فوج کی حفاظت کرے بلکہ وہ جو دشمن کی کمزوریوں کو گرفت کر سکتا ہے۔ اور ان پر کارگر حملہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ آج کے معلم کے لئے ضروری ہے۔ وہ نہ صرف مضامین تعلیمی میں ماہر ہو۔ بلکہ نفسیات اطفال اور مقامی ماحول کی ضروریات کا عالم ہو۔ اور اپنے طریقۂ تعلیم کو ان سے منطبق کر سکے۔ وہ وقت گذر گیا جب صرف آپ مضمون کا مطالعہ کرتے تھے۔ اب وقت آگیا ہے۔ کہ مضمون کے ساتھ ساتھ آپ طالب علم کا مطالعہ کریں۔ اور ہماری نظر سے ماضی وحال اور مستقبل کا کوئی گوشہ چھپا نہ رہنا چاہئے ۔

آج کا طالب علم جسے ہم تعلیم دے رہے ہیں۔ اس نے کچھ عرصہ کے بعد مستقبل کی دنیا آباد کرنا ہے۔ اسلئے آج کے معلم کو نہ صرف حال کی ضروریات سے باخبر ہونا چاہئے بلکہ اُسے اپنی نظر کو اتنا وسیع اور غائر کرنے کی ضرورت ہے۔ کہ وہ حال کے آئینہ میں مستقبل کو دیکھ سکے۔ تعلیم دیتے وقت بچے کا حال ہی اس کے پیش نظر نہ رہے۔ بلکہ اُسے اس کے مستقبل کو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہئے ۔

ہمیں مطالعہ کو اپنا شیوہ بنانا ہوگا۔ مطالعہ سے واقفیت زیادہ۔ زندگی خوشگوار ردلچسپ ہو جاتی ہے۔ ہمارے لئے یہ امر باعث افسوس ہے کہ ہم طلبہ کو تو متواتر مسلسل مطالعہ کا حکم دیتے ہیں۔ اور خود اس سے محروم رہتے ہیں۔ یہ عجیب و غریب ت ہے۔ کہ ہم اپنے اسلاف کے علوم و فنون سے بے بہرہ ہو رہے ہیں۔ قرون اولیٰ کے معلّمین اور ان کی تصانیف پر ایک غائر نظر ڈالیے۔ اگر ہم ان کے دفائر علمی سے آشنا ہیں۔ ان کے دستور العمل سے ناواقف ہیں۔ ان کے اوقات شب و روزی نہیں جانتے۔ اور علمی میدان میں ان کی تگ و تاز کا علم نہیں رکھتے۔ تو میں نہیں جانتا مستقبل میں ہماری عزت کن ذلتوں سے دوچار ہونا ہے ٭

جن اصحاب کو ان علمی خزائن کے دیکھنے کا کبھی موقع ملا ہے۔ وہ جانتے ہیں۔ یہ گنجینہ اپنے اندر کیا عزّو وقار رکھتا ہے۔ اور میں کیا عرض کر رہا ہوں۔ ؎

کسیکہ محرم بادِ صبا ست مے داند
کہ باوجودِ خزاں بوئے یاسمیں باقی است

ماضی، حال اور مستقبل کو ایک نقطہ پر جمع کرو۔ تعلیم دیتے وقت ضروریاتِ زمنۂ ثلاثہ کو نظر انداز نہ کرو تاکہ ہماری نظر سے وقت کا کوئی تقاضا اور ضرورت کا کوئی گوشہ اوجھل نہ ہو۔ اور اسی روشنی میں طالب علم کی زندگی بنانا ہمارا نصب العین ن جائے ٭

بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرح نو در اندازیم

اُستادوں کیلئے فنِ تعلیم کا انتظام
اور
اسکی اصلاح

از بشیر احمد ڈار ایم ۔ اے ۔ بی ۔ ٹی

زمانہ قدیم میں بچوں کی تعلیم کا مقصد بالکل محدود قرار دیا گیا تھا ۔ کسی مکتب میں حاضر ہونے کا مطلب صرف یہ تھا کہ بچہ درسی کتب سے روشناس ہو جائے ۔ مادری زبان بولنے اور لکھنے کی مہارت حاصل کرے اور اگر ممکن ہو تو زمانہ کے رواج کے مطابق شعر و سخن کی مشق سے علم ادب کی کچھ خدمت بھی بجا لائے ۔ اس کے بعد تعلیم کی سرحد ختم ہو جاتی تھی ۔ بچوں کی اخلاقی اور معاشرتی زندگی کی تربیت، تعلیم کے مخصوص دائرے سے خارج تھی ۔ یہ کام معاشرے کے مختلف اداروں کے سپرد تھا جو غیر شعوری طور پر بچوں میں مقامی اور روایتی معیار اخلاق کا احساس پیدا کرتے تھے ۔ گھر کا انتظام، گاؤں کا ماحول، کاروباری زندگی کا نظام، سبھی اس کام میں ممد و معاون ہوتے تھے ۔ ایسے حالات میں تعلیم کا مفہوم اگر تدریسِ کتب تھا تو یقیناً مورد الزام نہیں ۔ اس لئے معلم کا فرض صرف یہ ہوتا تھا کہ علوم متداولہ میں مہارت پیدا کر دے ۔ فنِ تربیت سے اس کو کوئی غرض نہ تھی لیکن آہستہ آہستہ زمانے نے زندگی کا پرانا ورق الٹ دیا اور ہمارے سامنے حیات انسانی کی ایک دوسری منزل کا نقشہ پیش کیا ۔ اس منزل میں انسان

نے زندگی کے ہر شعبہ میں کچھ ایسی ہمہ گیر تبدیلی پیدا کی کہ وہ تمام قدیم ادارے جن پر معاشرتی زندگی کا دارومدار تھا، یکقلم مفقود نظر آنے لگے علمِ طبعی کی تحقیقات نے مادی دنیا کی بوقلموں نیرنگیوں کو عوام کے سامنے بے نقاب کر دیا جس کے علمی نتائج سے آج دنیا کا ہر حصّہ باخبر اور استفادہ کر رہا ہے علم حیاتیات (Biology) نے انسانی زندگی کی مختلف ارتقائی منازل کا حیرتناک خاکہ پیش کیا جس نے تمام گذشتہ اعتقادات کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا علم نفسیات نے انسانی سیرت کے بعض ایسے فراموش شدہ پہلوؤں پر روشنی ڈالی جس کے باعث ہم نے نہ صرف اپنی انفرادی بلکہ اجتماعی اور معاشرتی زندگی پر ایک بالکل مختلف زاویے سے نظر ڈالنی شروع کی۔ انہی چند انقلابات نے من جملہ دیگر تغیّرات کے تعلیم کے مقصد کو یکسر بدل ڈالا۔ تعلیم دلانے کا مطلب محض کتب درسی میں مہارت حاصل کرنا بالکل غیر ضروری ہو چکا ہے۔ بچّہ آئندہ نسل کا ایک فرد ہے جس کی دماغی، جسمانی، روحانی اور اخلاقی اصلاح پر تمام قوم کی بہتری کا انحصار ہے۔ اس موجودہ دورِ حیات میں، جبکہ زندگی کا ہر شعبہ بے انتہا پیچیدگی اختیار کر چکا ہے، معاشرے کے مختلف اداروں نے یہ اہم ترین کام اپنے کندھوں سے ہٹا کر صرف مدرسے پر عاید کر دیا ہے۔ حالات کے اس تغیّر نے ہمیں مجبور کر دیا ہے کہ مدرسے کا وہ پرانا تصور یکقلم دماغ سے نکال دیا جائے۔ مدرسہ اب ہم ایسی جگہ کو نہیں کہہ سکتے۔ جہاں صرف تحصیل علم کیلئے بچے اپنی عمر کا بہترین اور قیمتی حصہ، ایک مُردہ، جامد، ساکن اور ناقابل نمو ماحول میں ضائع کر دیں۔ مدرسہ ایک ایسے ادارے کا تصور ہے جہاں بچّوں کو زمانے کی سیاسی اور معاشرتی ضروریات سے دوچار کیا جائے لیکن شاید یہ مقصد بعض پرانی وضع کے مدارس میں بھی سرانجام ہوتا

رہا ہے۔ مگر یہ احساس صرف مطالعۂ کتب سے حاصل نہیں ہو سکتا اس کیلئے عملی زندگی کی ضرورت ہے۔ جوان مدارس میں مفقود تھی۔ بچوں کو قومی معاملات کی اہمیت کا احساس صرف اُسی وقت ہو سکتا ہے۔ جب وہ عملی طور پر اس اہمیت کو سمجھ لیں۔ اسی طرح ان کی روحانی اور اخلاقی سیرت کی تشکیل کی ذمہ داری بھی مدرسے پر عائد ہوتی ہے تعلیمی ادارے کا صحیح نصب العین یہ ہے کہ وہ بچوں کو آئندہ زندگی کی جدوجہد کیلئے پورے طور پر مسلح کریں۔ اس طرح نہیں کہ وہاں ایک خاص سیاسی، معاشرتی یا اخلاقی نظریے کی محدود تعلیم دی جائے جیسی کہ اس وقت روس، جرمنی یا اطالیہ میں دی جا رہی ہے بلکہ ان کی فطری قوتوں کی نشوونما اور معقول تربیت کی جائے جن کی بنا پر وہ اپنی اصابت رائے، قوت ارادی اور عملی ذوق کی مدد سے دنیا کے کارزار میں شامل ہوں۔

اس انقلاب نے جہاں بچوں کیلئے تعلیمی درس گاہوں کے تصور اور نصب العین میں ایک حیرت انگیز تغیر پیدا کر دیا۔ وہاں لازمی تھا کہ ان تربیت گاہوں کا ماحول بھی بدل دیا جاتا جو مدارس کے اساتذہ کے لئے مخصوص تھے۔ اس تعلیمی مقصد کے حصول میں جس کا مختصر سا خاکہ اوپر پیش کیا گیا ہے، اُستاد کا بہت اہم حصہ ہے بچوں کی سالم تربیت جس کے حصول کیلئے قوم اور حکومت نے تعلیمی اداروں کو قائم کیا ہے۔ درحقیقت اُستادوں کی توجہ، محنت اور قابلیت ہی سے حاصل ہو سکتی ہے معلم کا فرض درسی کتب کی تعلیم تک محدود سمجھنا تعلیمی ادارے کے صحیح مقصد سے بے خبری اور قوم کیلئے تباہی کا موجب ہے۔ معلم کی حیثیت یہ اور صرف یہ ہے کہ وہ اپنی جبلتوں کو ایک ہلکی سی جنبش دے اور اس کے بعد ایسا ماحول پیدا کر دے۔

جسمیں وہ ان جبلتوں کو پورے طور پر اپنے بے شمار عملی تجربوں سے نمایاں کر سکیں +

قوم کی آئندہ زندگی اور بہتری کا دار و مدار اگر بچوں کی صحیح نشوونما پر ہو اور یہ نشوونما بڑی حد تک معلّم کی قابلیت پر منحصر ہو، تو ایسے حالات میں معلّم کی حیثیت یقیناً قابلِ رشک ہے۔ وہ ایک ایسا فرد ہے جس کے ہاتھ میں تمام قوم کی آئندہ باگ ڈور خود قوم نے سپرد کی ہے۔ اس فرض کی ادائی میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ جن بچوں کو اس کے سپرد کیا جاتا ہے، ان میں سے ہر ایک نفسیاتی لحاظ سے دوسروں سے متمیز ہے۔ اس کی انفرادی زندگی اپنے ہر ہم جماعت سے علیحدہ ہے۔ اور ایک ہی ماحول میں ہوتے ہوتے بھی اس کا طرزِ عمل دوسروں سے مختلف ہے۔ ہر ایک کی فطرت اپنے اندر ایک علیحدہ اور ممتاز ہستی کا بیج رکھتی ہے جو اُستاد کی شخصیت سے متاثر ہو کر قدرت کا ایک عجیب نمونہ پیش کر سکتی ہے۔ اس عظیم الشان کام کو سرانجام دینے کیلئے یقیناً ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو نہ صرف عقل و تجربہ میں اپنے ہم عصروں میں ممتاز ہوں۔ بلکہ اہلِ دل اور صاحبِ نظر بھی ہوں +

مگر جب ان نظریات سے جن کو مغربی ممالک میں عملی جامہ پہنایا جا چکا ہے، قطع نظر کر لی جائے اور فضائے آسمانی سے اتر کر خاک ہندوستان کے مختلف کونوں کا مشاہدہ کیا جائے تو شاید مندرجہ بالا تصوّرات محض افلاطونی ایمان سے زیادہ نہیں سمجھے جائینگے جن کا ناقص پرتو بھی شاید اس ظلمت کدہ میں مٹ چکا ہے۔ ہمارے یہاں تعلیمی ادارے اور معلّموں کی تربیت گاہیں کچھ ایسے ڈھب پر چل رہے ہیں کہ شاید اگر ان کو بند بھی کر دیا جائے تو قوم اور ملک کو اتنا نقصان نہ

ہو جتنا اب ان کی موجودگی سے ہو رہا ہے۔ نصف صدی سے تعلیمی اصلاح کی تحریک پورے زوروں سے ملک میں چل رہی ہے۔ اس سلسلے میں بے شمار مجلسیں اور کانفرنسیں قائم ہوئیں اور متفقہ قراردادیں پاس کی گئیں لیکن عملی رنگ میں سارے ہندوستان میں شاید کوئی تعلیمی ادارہ ایسا ملیگا جو موجودہ دورِ حیات میں انسان کی بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے کے قابل ہو۔ اس کے برعکس مغرب میں برطانیہ، روس، اضلاع متحدہ امریکہ تو خیر بڑے عظیم الشان ملک ہیں معمولی سے معمولی ملکوں میں بھی جن کا رقبہ شاید ہندوستان کے صوبوں کے برابر ہوگا تعلیمی معاملات میں حیرت انگیز ترقی ہو چکی ہے ۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے اور فنِ معلمی کی اہمیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مغربی ممالک کے نظامِ معلمی کا بغور مطالعہ کیا جائے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے۔ کہ ہم دوسرے ملکوں کے نظام کی کورانہ تقلید نہیں کر سکتے کیونکہ جغرافیائی، معاشرتی اور تمدنی حیثیت سے ہم میں اور اُن میں بہت فرق ہے لیکن جس طرح ان ممالک کی علمی، صنعتی اور سیاسی ترقی ہمارے لئے ایک مشعلِ راہ ہو سکتی ہے، اسی طرح تعلیمی معلومات میں ان کے تجربات سے استفادہ کرنا یقیناً ہمیں بہت سی غلطیوں سے بچا کر راہ راست پر لا سکتا ہے۔ فنِ معلمی کے آغاز، اس کے نشو و نما اور اس کے مختلف منازل ارتقا کا ذکر یقیناً ہمارے موضوع سے بہت بعید ہے اور نہ اس سے کسی قسم کے عملی فائدے کا امکان ہے۔ البتہ جنگ عظیم کے بعد جن تعلیمی تجربات نے موجودہ شکل اختیار کی ہے اور جن کی وجہ سے مغربی ممالک میں تربیت اساتذہ کی طرف زیادہ توجہ دی جانے لگی، اس کا مختصر سا خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی جائیگی

تاکہ اس کی مدد سے ان ملکوں کے موجودہ نظام کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

جنگ عظیم کے چہار سالہ دور ابتلا کے بعد مغربی ممالک میں تین مختلف قسم کے ذہنی تصوّرات نے لوگوں کے دلوں پر قبضہ جمایا۔ جمہوریت[1] لیکن اس کا مفہوم ہر ملک میں قدرے مختلف تھا، قومیت[2] جسمیں حد سے زیادہ غلو روا رکھا گیا۔ انفرادیت[3] یعنی معاشرہ یا جماعت کے مقابلہ میں فرد کی اہمیت۔ ایسے تغیّرات میں تعلیم کا جمہوری، قومی اور انفرادی ہونا ایک لازم امر تھا۔ اور انہی خیالات کے مطابق مختلف قسم کے تعلیمی نظام (جن میں کافی مماثلت بھی موجود تھی) مختلف ملکوں میں رونما ہوئے۔ ان میں جرمنی کے وفاقی دستور۔ ۱۹۱۹ء کی تعلیمی اصلاحات خاص طور پر قابل تعریف ہیں[۱]۔ تمام ملکوں میں ابتدائی مدرسوں کے نصاب میں مناسب ترمیم کی گئی، علم نفسیات کے مطالعہ کا شوق بہت ترقی کر گیا اور بچّوں کی نفسانی زندگی کے تجربہ کی طرف بیش از بیش توجہ دی جانے لگی۔ خاص کر اضلاع متحدہ امریکہ، جرمنی اور انگلستان میں، طالبان فن معلّمی کے نصاب میں ایسے علوم مدنیہ (Cultural) داخل کئے گئے جن سے وہ پہلے محروم رہتے تھے۔ مدارس میں معلّموں کو اپنے طریقوں کے استعمال میں کافی آزادی دی گئی۔ مانٹسوری اور ڈالٹن کے طریقے اور ڈیوئی کا منصوبی طریقہ بھی آزادی اور وسعت کے ساتھ ہر

---

[۱] جرمنی کا نظام تعلیم مصنّفہ جے۔ یو۔ ہٹ (۱۹۳۸) صفحہ ۵۱۔ اس دستور کا چوتھا باب تعلیم اور مدارس کے لئے وقف ہے مشترکہ مدرسوں کی ضرورت کی اہمیت جتاتے ہوئے دفعہ ۱۴۶ میں درج ہے :" مدارس عوام کا نظام ایک ہی بنیاد پر قائم کیا جائیگا مدارس وسطانیہ اور ثانوی ابتدائی مشترکہ مدارس کی بنیادوں پر استوار کئے جائینگے ان مدرسوں میں داخل ہونے کیلئے بچّوں کے والدین کی سماجی یا مالی حیثیت یا ان کے مذہبی اعتقادات اثر انداز نہیں ہونگے بلکہ اس کا معیار بچّوں کی اپنی ذہنی قابلیت ہوگا۔

ملک میں پھیل گئے اور مقیاس ذہنی کے لئے آزمائشوں کا رواج آہستہ آہستہ عام ہوتا چلا گیا۔

مغرب کی چار دول جمہوریتیہ، انگلستان، اضلاع متحدہ امریکہ، فرانس اور جرمنی (قبل از ۱۹۳۳ء) میں جمہوریتیہ کا مفہوم بالکل جداگانہ اور بعض حالات میں متضاد تھا۔ اور اس لئے لازم تھا کہ اس اختلاف کا اثر ان ملکوں کے نظام تعلیم پر بلاواسطہ نمایاں ہوتا اور اسی لئے ان معلّموں کی تربیت بھی جن پر اس نظام تعلیم کو چلانے کا فرض عائد ہوتا ہے، ہر ایک ملک میں مختلف زاویے سے سرانجام ہوتی۔ انگلستان میں جمہوریتہ کا مفہوم اخوت کے بجائے آزادی ہے یعنی سیاسی دخل درانداز ی کا فقدان لیکن امریکہ میں، انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اخوت زیادہ اہم متصور ہوتی ہے۔ ڈیوئی کے خیالات کے زیر اثر، امریکہ میں مدرسے کو حقیقی معنوں میں اجتماعی زندگی کا ایک چھوٹا سا نمونہ تصور کیا جانے لگا۔ انگلستان میں جمہوری تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ ایک طالب علم کو اس کی ذاتی صلاحیت کے مطابق تعلیم حاصل کرنے کیلئے کسی قسم کی روکاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔ فرانس میں، اس کا مفہوم ایسا نظام تعلیم ہے جس سے افراد ایسی تربیت حاصل کر سکیں کہ وہ اپنی قوم کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید ثابت ہوں۔ فرانسیسیوں کے لئے یہی صحیح جمہوریتیہ ہے کہ ہر فرد کو اسکی جبلّی خصوصیات کے مطابق اس کا مناسب حصہ مل جائے اور اسی کے مطابق اس کو تعلیم دی جائے۔ ایسے حالات میں ظاہر ہے کہ معلّم جسے بچّوں کو ایسی جمہوریتیہ میں زندگی بسر کرنے کیلئے تیار کرنا ہے، ایک مختلف طریقے سے تعلیم دیگا جو اس کا ساتھی، امریکہ یا انگلستان میں استعمال کریگا۔ ان اختلافات کی

موجودگی میں جمہوریہ کسی حالت میں بھی تعلیمی معیار کا درجہ اختیار نہیں کر سکتی۔ ۱۹۱۸ء کے بعد جرمنی میں ایک نئی قسم کی جمہوریہ کا قیام عمل میں آیا۔ وفاقی دستور کی دفعہ ۱۴۸ کے مطابق یہ طے پایا کہ "تمام مدرسوں میں کوشش کی جائیگی کہ بچوں میں اجتماعی احساس اور صنعتی قابلیت پیدا کی جائے اور ان کے اخلاق کو جرمنی کی روایات کے مطابق استوار کیا جائے۔ شہری تربیت اور عملی تعلیم مدرسوں کا لازمی جزو ہوں گے"۔ لیکن عملی طریق تعلیم پر زیادہ توجہ دینے سے ملک کا رجحان جمہوریہ سے ہٹ کر اشتمالیت کی طرف چلا گیا اور قومی نصب العین اور کلچر کی پیروی نے باشندوں میں قومیت کا مبالغہ آمیز تصور پیدا کر دیا جس نے نازی غلبے کے بعد قوم کو افراد کے مقابلہ میں ایسا بلند درجہ دیدیا جس کے سامنے افراد کی اہمیت بالکل ہیچ ہوگئی جمہوریہ کی طرح قومیت اور انفرادیت کے تصورات بھی تعلیمی معیار کے طور پر تسلیم نہیں کئے جا سکتے۔ خاص کر جب معلّمین کی تربیت کا معاملہ درپیش ہو۔ کیونکہ قومیت کی تحریک بعض ممالک میں ایک تنگ نظری اور غلط خود اعتمادی پر منتج ہوتی ہے۔ جس کا نمونہ جرمنی اور اٹلی کی موجودہ زندگی ہے۔ اسی طرح انفرادیت کی تحریک سیاسی اور عمرانی خلفشار کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ جرمنی میں جمہوریہ وائمر (Weimer Republic) کا خاتمہ بڑی حد تک اسی وجہ سے ہوا۔

ان چار دول جمہوریہ کے نظام تعلیم کی تشکیل کے ساتھ یورپ کے دوسرے ممالک میں بھی چند اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ سب سے پہلے روس میں اشتمالی غلبے کے بعد ایک خاص قسم کا معاشرتی نظام قایم ہوا جس کا گہرا اثر نظام تعلیم پر ہونا لازم تھا۔ روس کے متعلق چونکہ اس رسالہ میں کافی بحث کی جا چکی ہے[1]۔ اس لئے

---

[1] دیکھو پنجاب ایجوکیشنل جرنل بابت اگست تا نومبر ۱۹۳۰ء۔ عنوان: روس کا نظام تعلیم

اس کا اعادہ مناسب نہیں۔ ۱۹۲۲ء میں اٹلی میں بھی ایک سیاسی انقلاب پیدا ہوا جس کے باعث قومیت کا ایک نیا تصور قائم ہوا۔ قوم ایک ایسا ادارہ ہے جسمیں ہر فرد اپنی منشا کے مطابق آزادی کے ساتھ قوم کے مفاد کے لئے زندگی بسر کرسکتا ہے۔ ایسی حکومت میں مدرسے کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ وہ بچوں میں اس چیز کا احساس پیدا کر سکے کہ معاشرے میں ان کی انفرادی حیثیت کیا ہے۔ اٹلی کے فلسفی جنٹلے (Gentile) نے اپنی کتاب "اصلاح تعلیم" میں اس انقلاب کی پُرزور حمایت کی ہے۔ یہ فلسفی موجودہ دور کے بہترین مفکروں میں شامل ہے جس نے اپنے استاد کروشے (Croce) کی تعلیم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے آئیڈل ازم (Idealism) کے نظریہ کی از سر نو تجدید کی ہے۔ اس کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ تعلیم ایک "روحانی عمل" ہے۔ جس کا ذوق استادوں کی کوشش سے بچوں میں پیدا کیا جاسکتا ہے اور جسکی نشو و نما بعد میں خود بخود ہو سکتی ہے۔ آزادی کی ضرورت اور آزادی کے راستے میں جو جو رکاوٹیں کسی نظام تعلیم کے باعث پیدا ہوتی ہیں۔ دونوں کو تسلیم کیا گیا ہے لیکن افراد اور معاشرے کے ظاہری تضاد کی طرح آزادی اور جبر کا تضاد بھی حل ہو جاتا ہے۔ جب ہم اس حقیقت پر غور کریں کہ انسانی ارتقا کے راستے میں رکاوٹ عام طور پر انسان کو ترقی کے راستے پر زیادہ مضبوطی کے ساتھ گامزن ہونے کی ترغیب دیتی ہے اور اس لئے وہ رکاوٹ نہیں کہلا سکتی۔ بلکہ وہ ترقی کیلئے زینہ ہے +

باقی آئندہ

اشتہار

کتب لائبریری

برائے پرائمری و لوئر مڈل کلاسز

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت	نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱	کہانیوں کی پہیلی پروفیسر رام سروپ کوشل	۴ر۱۱ پائی	۲۰	دلچسپ تاریخی کہانیاں حصہ سوم	۷ر
			۲۱	کام کی باتیں حصہ اوّل	۳ر۹ پائی
۲	〃 〃 دوسری 〃	۱ر۶ 〃	۲۲	〃 〃 〃 دوم	۲ر۳ 〃
۳	〃 〃 تیسری 〃	۷ر۶ 〃	۲۳	قصص ہند حصہ اوّل	۳ر۲ 〃
۴	پیاری کہانیاں اوّل	۶ر	۲۴	〃 〃 〃 دوم	۲ر۸ 〃
۵	〃 〃 دوم	۵ر	۲۵	قصص ہند کا مجموعہ زنانہ	۱۱ر
۶	〃 〃 سوم	۷ر	۲۶	حسینہ اور وحشی	۱ر۵ پائی
۷	میٹھی کہانیاں اوّل	۲ر	۲۷	شہزادہ مہربان	۲ر۱۰ 〃
۸	〃 〃 دوم	۵ر	۲۸	ماتا سیتا	۱ر۱۰ 〃
۹	〃 〃 سوم	۷ر	۲۹	جادو کا مٹکا مسٹر ریلیارام	۳ر
۱۰	〃 〃 چہارم	زیر طبع	۳۰	دروپدی	۱ر۸ 〃
۱۱	〃 〃 پنجم		۳۱	مہاراجہ رنجیت سنگھ	۴ر۶ 〃
۱۲	امرت کہانیاں نمبر ۱	۲ر۹ پائی	۳۲	خلیفہ ہارون الرشید	۴ر
۱۳	〃 〃 نمبر ۲	۳ر۱۰ 〃	۳۳	راجہ اشوک	۵ر
۱۴	〃 〃 نمبر ۳	۵ر۲ 〃	۳۴	مہارانا پرتاپ	۲ر۱۰ پائی
۱۵	انوار سہیلی کے انمول موتی 〃 〃 حصہ ۱ 〃 〃	۲ر۸ 〃	۳۵	شیر شاہ سوری	۱۲ر۱۱ 〃
			۳۶	شہاب الدین شاہجہان	۲ر۱۰ 〃
۱۶	〃 〃 حصہ ۲ 〃 〃	۴ر۱۰ 〃	۳۷	نصیر الدین ہمایوں	۲ر۱۰ 〃
۱۷	〃 〃 حصہ ۳ 〃 〃	۵ر۲ 〃	۳۸	اورنگ زیب عالمگیر	۲ر۹ 〃
۱۸	دلچسپ تاریخی کہانیاں حصہ اوّل	۷ر۷ 〃	۳۹	نور الدین جہانگیر	۲ر۳ 〃
	〃 〃 〃 دوم	۸ر۱۱ 〃	۴۰	شہاب الدین غوری	۲ر۸ 〃

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۴۱	سلطان علاؤالدین خلجی . .	۲ر ۱۱ پائی
۴۲	فیروزالدین تغلق . . .	۳ر
۴۳	امیر تیمور	۲ر۷ ″
۴۴	پرتھوی راج	۲ر۸ ″
۴۵	محمود غزنوی	۲ر۶ ″
۴۶	مصر کی داستان . . .	۳ر
۴۷	جاپان کی کہانی . . .	۴ر
۴۸	چین کی کہانی . . .	۳ر۶ پائی
۴۹	مستورات چین وجاپان . .	۴ر
۵۰	ایران کی کہانی . . .	۲ر
۵۱	ایشیائی روم	۲ر۷ پائی
۵۲	ٹرکی (یورپی روم) . . .	۲ر۸ ″
۵۳	لنکا	۱ر ۱۱ ″
۵۴	بصرہ وبغداد	۵ر
۵۵	یونان	۲ر
۵۶	تین سوال	۲ر۵ پائی
۵۷	امرت ورشا . . .	۳ر۱۰ ″
۵۸	زمانۂ سلف کے قصے کہانیاں نمبر ۱ داؤد بادشاہ	۲ر۶ ″
۵۹	کہانیاں بتیس پتلیاں حصہ اوّل	۳ر۹ ″
۶۰	″ ″ دوم ″	۴ر۵ ″
۶۱	خوفناک خواب	۲ر
۶۲	ہیرالال	۲ر۶ ″
۶۳	دولت کی پٹاری . .	۲ر۱ ″
۶۴	سادھو کی چٹکی	۲ر
۶۵	نیلا باز	۲ر۱۱ ″
۶۶	بہادر شہزادہ	۲ر ۱ پائی
۶۷	جوتی موتی	۲ر۱۰ ″
۶۸	جواہرات کا خزانہ . .	۳ر۷ ″
۶۹	پھوا اور سونا ہوا با تصویر	۲ر
۷۰	علی بابا چالیس چور .	۴ر
۷۱	علاؤالدّین و عجیب وغریب لیمپ	۴ر۶ پائی
۷۲	ملادہ بیانے کا سفر	۳ر
۷۳	سادھو کنور سدھارتھ یعنی مہاتما بدھ کا دھرم گیان	۳ر
۷۴	نیشاپور کا سوداگر . . .	۲ر۱۱ پائی
۷۵	پرستان کا موچی . . .	۳ر
۷۶	سندر پیاری . . .	۳ر
۷۷	چاندی کی کنجی . .	۳ر
۷۸	سلک جواہر نمبر ۱ (حکمرانی کا گر)	۲ر۶ پائی
۷۹	″ ″ نمبر ۲ (اوج وپستی)	۱ر ۱۱ ″
۸۰	″ ″ نمبر ۳ (شہیدِ الفت)	۱ر ۶ ″
۸۱	سلک جواہر۔ مردِ میدان	۱ر۶ ″
۸۲	″ ″ نیک وبد	۱ر۹ ″
۸۳	″ ″ عیب وہنر	۱ر۴ ″
۸۴	″ ″ جہاں گرد	۱ر۶ ″
۸۵	″ ″ جواب باصواب	۱ر۱۰ ″
۸۶	″ ″ سخاوت کی انتہا	۱ر۲ ″
۸۷	″ ″ حسنِ تدبیر	۱ر۷ ″
۸۸	ڈرامہ نئی بستی یعنی شہریت . . .	۱ر۳ پائی
۸۹	ڈرامہ غمخوار عالم . . .	۱ر۷ ″

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۹۰	مہاراجہ بکرماجیت اور اس کا تخت	۱ر۶ پائی
۹۱	سنہری گیت حصہ اوّل	۲ر۴ 〃
۹۲	〃 〃 دوم	۲ر۴ 〃
۹۳	〃 〃 سوم	۲ر [illegible]
۹۴	جو ہاتھو	۳ر
۹۵	اسرارِ دل . . .	۵ر
۹۶	جارج واشنگٹن . .	۱ر۶ پائی
۹۷	سکاوٹوں کا بادشاہ . .	۱ر۸ 〃
۹۸	لوہے کا بادشاہ . .	۱ر۹ 〃
۹۹	صابن کا بادشاہ .	۱ر۱ 〃
۱۰۰	آزادی کا بادشاہ . .	۱ر۱۱ 〃
۱۰۱	ڈاکو کی مرمت	۲ر۶ 〃
۱۰۲	چھو منتر	۳ر۵ 〃
۱۰۳	فرصت کے کام	۳ر۴ 〃
۱۰۴	دنیا کے کام کاج . .	۵ر۵ 〃
۱۰۵	آداب و اخلاق . . .	۱۰ر
۱۰۶	موقعہ	۵ر۴ 〃
۱۰۷	نیک اطوار	۲ر
۱۰۸	خوشی کا کھیل . . .	۳ر ۱ پائی
۱۰۹	بہادر محمود	۱ر۷ 〃
۱۱۰	سہراب و رستم . . .	۲ر۱ 〃
۱۱۱	دھوپ چھاؤں . . .	۳ر
۱۱۲	راجہ ہریش چندر . .	۲ر

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱۱۳	سنہری پھندہ	۱ر۳ پائی
۱۱۴	گورو کے پانچ بھائی . . .	۱ر۹ 〃
۱۱۵	کرشن جی کا بچپن . . .	۱ر۴ 〃
۱۱۶	تبدیلِ قسمت	۱ر۹ 〃
۱۱۷	جادو کا قلعہ	۳ر
۱۱۸	راجہ گوپی چند . . .	۱ر۷ 〃
۱۱۹	بندر کی ہوشیاری . .	۱ر۶ 〃
۱۲۰	بارہ بھائی	۱ر۱۰ 〃
۱۲۱	مشاہیرِ عالم حصہ اوّل .	۳ر
۱۲۲	〃 〃 〃 دوم .	۳ر
۱۲۳	〃 〃 〃 سوم .	۳ر

کتب لائبریری
برائے لوئر و اپر مڈل سکولز

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱	رسوم ہند حصہ اوّل	۶ر۲ پائی
۲	〃 〃 〃 دوم	۷ر۴ 〃
۳	تختِ سلیمانی . . .	۸ر۷ 〃
۴	الٰہ دین چراغ . . .	۴ر۶ 〃
۵	رامائن کی کہانی . . .	۸ر۲ 〃
۶	مہابھارت کی کہانی . . .	۵ر۶ 〃
۷	پیارا گورو نانک . . .	۴ر۷ 〃
۸	سید انشاء اللہ خاں انشا	۴ر۱ 〃
۹	سوانح عمری نواب مرزا خان داغ	۴ر۴ 〃

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز ایجوکیشنل پبلشرز لاہور

رجسٹرڈ نمبر ایل ۳۷۹۷

منظور کردہ جناب ڈائرکٹر صاحب بہادر سررشتۂ تعلیم پنجاب
بموجب سی ایم نمبر ۵۳۴۱۱ سی، مؤرخہ ۲۲ر مئی سنہ ۱۹۳۶ء

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اردو ایڈیشن

زیر ادارت

خان بہادر شیخ نور الٰہی، ایم اے، آئی ای ایس
بشیر احمد ہاشمی ایم اے-ایم-ای-ڈی-پی ای-ایس
پروفیسر گوپال داس کھنہ، ایم اے، بی ٹی

Vol. 5. June, 1938. No. 3.

سالانہ چندہ: چار روپے

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اُردو ایڈیشن

جلد (۵) | جون ۱۹۲۸ء | نمبر (۳)

فہرستِ مضامین

ایڈیٹوریل

قوم کی تشکیل کے چند ضروری اسباب ہوتے ہیں۔ مثلاً کسی ملک کے افراد کا ہم مذہب ہونا سیاسی اور اقتصادی مقاصد کی یک جہتی۔ ملک میں ایک ہی زبان کا رائج ہونا وغیرہ وغیرہ۔

ان سب اسباب کا یک جا ہونا اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ ایک ملک کے باشندے جلد از جلد ایک ہی رشتۂ قومیت میں منسلک ہو جائیں لیکن ہندوستان میں صورت حالات مختلف ہے یعنی اگر ہم یہ فرض بھی کرلیں کہ اب تمام ملک میں سیاسی اور اقتصادی مقاصد یکساں ہیں تاہم اس امر سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان مختلف المذاہب ہے اور یہاں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ پراکرت اور بھاشا کے دور کے بعد فارسی آئی اور ملک میں خوب رواج پا گئی۔ اگرچہ یہ رواج صرف حکمران قوم ہی تک محدود تھا تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ملکی عدالتیں اور اُمورِ سلطنت سے تعلق رکھنے والے مختلف اداروں کے عمال کے لیے اظہارِ خیالات کا ذریعہ فارسی تھا۔ دو تین صدیوں کے بعد مغلوں کے دور میں سنسکرت، پراکرت، بھاشا، عربی اور فارسی کے میل ملاپ سے ایک نئی زبان پیدا ہو گئی، جو کچھ مدت تک تو صرف ایک نئی زبان ہی رہی لیکن اب اس نے ملک میں ایک اہم اور ضروری زبان کی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ فوج، پولیس، عدالتوں اور اکثر دفاتر میں یہ رواج پا چکی ہے۔ اس کے پاس ایک اچھا خاصہ لٹریچر بھی ہے۔ اور اب انجمن ترقی اُردو حیدرآباد دکن اور دیگر اداروں کی کوششوں سے فلسفہ، سائنس اور دورِ جدید کے فروعی

مضامین پر کتابوں کا بھی ایک اچھا ذخیرہ جمع ہو چلا ہے اس زبان کی سرشت ایسی ہے، کہ یہ نئی نئی ضرورتوں کے ماتحت نئے نئے الفاظ اور نئے نئے اسالیب بیان اختیار کرتی چلی جا رہی ہے یہ امر ایک زبان کے زندہ ہونے اور روز بروز ترقی کرنے کا کفیل ہوتا ہے۔

ہندوستان میں وطنیت اور آزادی کے جذبات کے ساتھ ساتھ یہ ضرورت بھی محسوس کی گئی ہے، کہ تمام ملک میں حتی الامکان ایک ایسی زبان رواج پا جائے جسے کلکتے کا بنگالی، مدراس کا مدراسی اور سندھ کا سندھی سمجھ سکے۔ اس ضرورت نے مختلف اقوام اور مذاہب کے افراد کے دلوں میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ اگر کوئی زبان جو اُن کی تہذیب تمدن اور معاشرت کی آئینہ دار نہیں، رواج پا گئی۔ تو اس قوم اور مذہب کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوگا یعنی اگر مسلمان سے اُردو چھوٹ گئی، تو مسلمان کی معاشرت اور تہذیب کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہوگا۔ اگر ہندو سے ہندی چھوٹ گئی، تو اُس کے دھرم اور اُس کی تہذیب کی خصوصیات کے مٹ جانے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ یعنی ہر اقلیت اور ہر اکثریت خائف ہے کہ اس کی زبان اور زبان کے ساتھ ساتھ اس جماعت کی خصوصیات ایک بے رنگ اور بے کیف قومیت میں رل مل کر مٹ جائینگی۔ سیاسی نقطہ نگاہ سے یہ بحث نہایت دلچسپ ہے، لیکن اگر سائنٹیفک نقطہ نگاہ سے اس پر غور کیا جائے، تو یہ سیاسی گرما میں اُٹھنے والا ایک بگولا ہے جو تھوڑی دیر تک بدمزگی کے گرد و غبار اُڑا کر فضا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ بہر حال میرا یہ مقصد نہیں کہ میں سیاسی یا سائنٹیفک نقطہ نگاہ سے اس پر ایک مفصل بحث کروں۔ میری گذارش کا مدعا یہ ہے کہ مدرسوں کے لیے زبان کی ایک حقیقت کو واضح کر دوں

کوئی زبان کسی کانفرنس یا کمیٹی کے بنانے سے نہیں بنا کرتی، سماج اپنی ضروریات کے اظہار کے لیے ایک طریقہ اختیار کر لیتی ہے جو بتدریج نشو ونما پاتا جاتا ہے، اور آخرکار ایک مکمل زبان کی صورت اختیار کر لیتا ہے، جنگ عظیم کے بعد انگریزی زبان کی ایک تازہ لغت ان الفاظ پر مشتمل تیار کی گئی جو دورانِ جنگ میں بتدریج انگریزی زبان میں شامل ہو گئے تھے۔ انگریزی دنیا کی ایک نہایت ہی مقتدر زبان ہے اور اس کے اقتدار کا ایک راز یہ ہے کہ یہ ہر وقت ہاتھ پھیلائے تیار رہتی ہے کہ نئی ضروریات کے اظہار کے لیے نئے الفاظ اور نئی ترکیبیں خواہ کسی زبان ہی کی ہوں اپنے میں ملا لے۔ ہندوستان کی مشترکہ زبان کی یہ ایک خصوصیت ہونی چاہیے کہ یہ نئی ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نت نئے الفاظ اور اسالیب بیان قبول کرتی رہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی زبان میں نئے الفاظ کیوں کر شامل ہو جاتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ آج جب کہ مہینوں کی مسافت دنوں میں طے ہوتی ہے، اور مختلف اقوام کے افراد بین الاقوامی زندگی میں اس طرح شریک ہیں، جیسے پہلے کسی قصبے یا شہر کے افراد ایک دوسرے سے متعلق ہوتے تھے، اس لیے روز نئی نئی ضرورتوں کے لیے نئے نئے الفاظ کا استعمال شروع ہو جاتا ہے، ظاہر ہے کہ جب کوئی ضرورت موجود نہ تھی تو اس کے لیے کوئی لفظ بھی نہ تھا، جب ضرورتیں پیدا ہوئیں تو الفاظ بھی پیدا ہو گئے۔ اسٹیشن، موٹر کار، ٹیلیفون اور سینکڑوں الفاظ انگریزی زبان سے ہندوستان کی زبانوں میں آ ملے، اور اس طرح کہ عام آدمی کو یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ یہ الفاظ اس کی اپنی زبان کے نہیں ہیں، البتہ جس ضرورت کے اظہار کے لیے کسی زبان میں الفاظ موجود ہوں اس کے لیے کسی دوسری زبان سے نیا لفظ

لینا زیادتی ہے، چونکہ اس نئی بھرتی سے زبان کے احاطہ بیان میں کوئی ترقی نہیں ہوتی۔
مندرجہ بالا سطور سے یہ واضح ہوگیا ہے، کہ کسی زبان میں مترادفات یعنی ہم معنی الفاظ کا اکٹھا ہونا زبان کے اُصول کے خلاف ہے۔ بالعموم ہم اس غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں، کہ زبان میں کتنے ہی الفاظ ہم معنی ہو سکتے ہیں، مثلاً کہنے والا کہہ سکتا ہے، کہ عربی زبان میں اُونٹ کے لیے کئی سو الفاظ ہیں، مگر ایک عرب جانتا ہے کہ ہر لفظ ایک خاص قسم کے اُونٹ کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے اور بس۔
ایک نہایت ہی پیش پا افتادہ مثال اُردو زبان کی یہ ہے، ہم میں سے کون ہے جو گھوڑا ٹٹو اور کوتل کے الفاظ سے واقف نہیں یہ سب ایک بڑی قسم یعنی گھوڑے کے ماتحت ہیں لیکن اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے، کہ یہ تین مختلف قسم کے جانور ہیں، یا پھر گھوڑے ہی کے اقسام کو لیجئے تو نقرہ، کرا، سرنگ، کمیت، ابلق ہشکی وغیرہ وغیرہ مختلف نام ہیں، جو مختلف رنگ و روپ کے گھوڑوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں مختصراً یہ بالکل قطعی اور واضح امر ہے، کہ کسی زبان میں مترادفات کا موجود ہونا ممکن نہیں میری اس گذارش کو سن کر شاید کوئی اُردو دان صاحب فرمائیں کہ اُردو تو مخلوط النسل زبان ہے، اور اس لیے اس میں مترادفات موجود ہیں، یعنی ماں اور ماتا، ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔ یہ صحیح ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو جائیگا، کہ اُردو میں بھی صرف چند الفاظ ایسے ہیں، جو انسان کی ابتدائی ضروریات کا اظہار کرتے ہیں، اور انہی کے مترادفات موجود ہیں۔ اُردو کو چھوڑیئے، کسی اور زبان کے لفظ کو لے لیجیے، ماتا، ٹھیٹھ ہندوستانی عورت ہے، جس کے نزدیک اُس کا بیٹا ایک مقدس شخصیت ہے۔ اور جس کے

نزدیک بیٹے کو دیکھنے کے لیے جذباتی آنکھوں کے علاوہ اور کوئی آنکھیں موجود نہیں، اب لفظ 'مادر' پر غور فرمائیے، اس لفظ کی اصلیت بالکلیہ اسلامی ہے، اور اس کا معہود ذہنی ایک ایسی شخصیت ہے جس کے نزدیک بیٹے کی وہ اہمیت اور وقعت نہیں، جو ماتا کے نزدیک ہے، اب اگر کوئی ادیب جو صحیح معنوں میں الفاظ کی سرشت اور مزاج سے واقف ہے کہیں لفظ ماتا استعمال کرتا ہے، اور کہیں مادر، تو یقین مانیے کہ اس کے ذہن میں اگرچہ ہر دو مواقع پر ایک عورت ہی ہے، لیکن اس عورت کا مزاج اور اس کی سرشت مختلف ہے ۔

مزید بحث و تجسس کی ضرورت نہیں، اور ہم بلا تامل یہ مان سکتے ہیں کہ زبان میں مترادفات نہیں ہوتے ۔

قومیت کے جوش نے ہمیں زبان کی حقیقت کی طرف سے اندھا کر دیا ہے، اور آج ہر طرف سے یہی آواز سنائی دیتی ہے، کہ اردو اور ہندی قوم کے جسم پر بڑھنے والے پھوڑے ہیں، اور ہندوستانی ہی ہمارے قومی دکھوں کی دوا ہے۔ ہندوستانی کی تشریح اس طرح کی جاتی ہے، کہ ہندی والے سنسکرت کے ثقیل الفاظ کو اس میں دخل نہ دیں، اور اردو والے عربی، فارسی کے الفاظ کے استعمال کو ترک کر دیں، یعنی حتی الامکان آسان سے آسان الفاظ استعمال کئے جائیں، قہر کے بدلے غصہ، شمشیر کے بدلے تلوار، انبساط کے بدلے خوشی، سنگھاسن کے بدلے چھپر کٹ وغیرہ وغیرہ، آپ خود ہی غور فرمائیے کہ کیا یہ مترادفات ہیں اور کیا ان سے لکھنے اور بولنے کا مفہوم پوری طرح ادا ہو جاتا ہے۔ اس سے میرا یہ مقصد نہیں کہ ہم اپنی تقریر و تحریر میں نامانوس الفاظ کی بھرمار کر دیں بلکہ میری گذارش صرف اس قدر ہے، کہ مدرسین زبان کے اسرار سے واقف ہو جائیں اور ایک کم پایہ اظہار بیان کی خاطر معتبر اظہار بیان [illegible]

واردھا کی تعلیمی کانفرنس

از

پروفیسر محمد مجیب بی، اے (آکسن) استاد جامعہ

(ماخوذ از جامعہ)

پچھلی چند اشاعتوں میں ہم وار دھا کمیٹی کی رپورٹ کا ترجمہ شائع کر چکے ہیں ۔ اب ہم اس کے مفید اور غیر مفید پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی غرض سے چند اور مضمون بھی چھاپیں گے۔ اس سلسلے کی ابتدا ہم پروفیسر محمد مجیب صاحب بی ۔اے آکسن کے مضمون "واردھا کی تعلیمی کانفرنس" سے کرتے ہیں، آپ کا یہ مضمون دسمبر ۱۹۳۷ء کے جامعہ میں شائع ہوا تھا۔ نہایت دلچسپ مضمون ہے، اور اس لیے اور بھی زیادہ دلچسپ ہے، کہ صاحب مضمون خود اس کانفرنس میں موجود تھے ۔

پچھلی جولائی سے رسالہ "ہریجن" میں ایسے مضامین نکلنے لگے جن سے سمجھنے والے سمجھ گئے کہ گاندھی جی کے دل میں ایک نئی دُھن سمائی ہے، اسی طرح کی دھن جس نے ستیاگرہ کی تحریک چلائی، قوم پرست ہندوستانیوں کو کھدر پہنایا، اور دو مرتبہ ہندوستان کے سارے جیل خانے کانگرسیوں سے آباد کر دئے۔ یہ نئی دُھن تعلیمی ہے، مگر ابتداء اس کی اخلاق سے ہوئی، اور اسے پیدا دنیاوی حکمت عملی کے اس جال نے کیا جس میں اخلاقی حوصلے کا بلند پرواز عقاب اکثر پھنس جاتا ہے اور بیکسی کے غصے میں اپنی بوٹیاں نوچنے لگتا ہے، مدراس کی کانگریسی حکومت نے ارادہ کیا کہ شراب کی تیاری اور خرید و فروخت بند کرے اور یہ سوال فوراً اُٹھ کھڑا ہوا کہ ایسا کیا گیا تو پھر تعلیمی منصوبوں

کا کیا حشر ہوگا۔ اب تک تعلیم کا خرچ اس آمدنی سے نکالا گیا ہے جو شراب اور دوسری منشیات کی تجارت پر محصول لگانے سے ہوتی تھی، اور اس آمدنی کے موقوف ہونے سے عام جبری تعلیم کا ارادہ پورا کرنا درکنار، ان تعلیمی اداروں کی جان پر بن جائے گی جو اس وقت موجود ہیں۔ یہ صورت حال ایک مدراس کے صوبے میں نہیں ہے بلکہ ہندوستان کے بیشتر حصوں میں پائی جاتی ہے، اور ہمارے ملک میں افلاس بھی اس طرح پھیلا ہے کہ مزید آمدنی کی ضرورت ٹیکس بڑھانے سے پوری نہیں کی جا سکتی۔ اس عملی دشواری نے گاندھی جی کے دل پر بہت اثر کیا، وہ سوچتے رہے کہ کیا کرنا چاہیے اور اچانک ان کے دل میں خیال آیا کہ تعلیم کو اپنا خرچ آپ برداشت کرنا چاہیے۔ اس سے حکومت ہی کا کام آسان نہ ہوگا، بلکہ وہ بے روزگاری بھی بڑی حد تک دور ہو جائے گی جو ہمارے موجودہ نظام تعلیم سے پیدا ہوئی ہے۔ کیونکہ تعلیم اپنا خرچ آپ برداشت تبھی کر سکتی ہے جب کتابیں پڑھا دینے کے بجائے دستکاری سکھائی جائے اور اتنا مال تیار کیا جائے کہ جسے بیچ کر اسکول اپنے اخراجات پورے کر سکیں۔ اپنا یہ خیال گاندھی جی نے ہریجن میں پیش کیا، لوگوں نے اس کے متعلق اپنی رائے دی اور گاندھی جی خود بھی اور نکتے اور تفصیلی باتیں جو ان کی سمجھ میں آئیں بیان کرتے رہے۔ لیکن یہ معاملہ اتنا سلجھا ہوا نہیں ہے کہ مضمون لکھ کر طے کر لیا جائے، اس وجہ سے واردھا میں فن تعلیم کے ماہروں اور کانگریسی وزیروں کی ایک کانفرنس کرائی گئی۔

کانفرنس کے صدر مہاتما جی خود ہوئے۔ ان کی صحت بہت نازک ہے اور اس ڈر سے کہ کہیں عین وقت پر ان کے قوٰی جواب نہ دیدیں انھوں نے چار پانچ روز پہلے سے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ لیکن کانفرنس کے پہلے اجلاس میں وہ قریب

ڈیڑھ گھنٹے تک بولے اور تعلیم کا جو نیا طریقہ ان کے ذہن میں تھا اسے تفصیل سے بیان کیا۔ میں نے ان کی تقریر حرف بحرف لکھنے کی کوشش نہیں کی، اور گاندھی جی زبان کو سلجھانے اور آسان کرنے کے سوا اور کسی ادبی خوبی کی پروا نہیں کرتے۔ اس لئے میں ان کے خیالات کو اپنے الفاظ میں اور اختصار کے لئے ترتیب ذرا بدل کر بیان کر دوں گا۔

گاندھی جی نے اس وقت کی اعلےٰ اور ابتدائی تعلیم پر جو اعتراض کئے وہ مسلّم ہیں، انھیں یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ آئندہ تعلیمی نظام کو درست کرنے کے لیے ان دونوں کو الگ کر دینا ہوگا۔ ابتدائی تعلیم میں بھی انہوں نے شہروں کی ضروریات کو چھوڑ کر صرف دیہات کو مدِّنظر رکھا۔ موجودہ طریق تعلیم کے انہوں نے جو نقصان بتائے کہ اس کی بدولت دیہاتیوں کو شہریوں کی نقل کرنے کی خواہش ہوتی ہے، ان کے اخلاق بگڑ جاتے ہیں اور کچھ نہیں تو انھیں اپنا خاندانی پیشہ چھوڑ کر نوکری حاصل کرنے کی فکر ہو جاتی ہے، ان سب باتوں سے ظاہر ہو گیا کہ انھیں شہروں اور شہری زندگی سے کچھ نفرت سی ہے۔ پھر بھی ہندوستانی آبادی کا اتنا بڑا حصّہ دیہات میں رہتا ہے کہ گاندھی جی کے اس معاشرتی تعصّب کا ان کی تجویز پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اپنی تجویز کا یہ پہلو واضح کر دینے کے بعد گاندھی جی نے کہا کہ ابتدائی تعلیم کے لیے عام طور سے چار سال کی جو مدت رکھی گئی ہے وہ بہت کم ہے، اسے بڑھا کر سات سال کر دینا چاہیے، اور ابتدائی تعلیم میں ثانوی تعلیم شامل کرکے پوری مدت کے لیے ایک مشترک اور مسلسل نصاب بنانا چاہئے، اس طرح کہ فارغ ہونے پر لڑکے کے

معلومات قریب قریب اتنے ہوں جتنے کہ اس وقت میٹرکولیشن کے لیے درکار ہیں۔ مگر یہ تعلیم خالی کتاب کے ذریعے سے نہ دینا چاہیے، جیسے کہ آج کل ہوتا ہے، بلکہ نصاب کا مرکز کسی دستکاری کو بنانا اور باقی تمام مضامین اسی کے ضمن میں پڑھانا چاہییں۔ گاندھی جی نے کہا "یہ تعلیم کا یہ طریقہ بالکل نیا ہوگا، لیکن جنوبی افریقہ اور ہندوستان میں مجھے تجربہ کرنے کے جو موقعے ملے ہیں ان کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ اس طریقہ پر تعلیم دینا نہ صرف یہ کہ ممکن ہے بلکہ اس کی بدولت بے شمار فوائد بھی حاصل ہوں گے۔

اس وقت جو تعلیم عام طور پر دی جاتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نوجوان اپنے خاندانی پیشے کو چھوڑ کر نئے ذرائع معاش تلاش کرتے ہیں۔ دستکاری کی جو تعلیم دیہات میں حاصل کی جا سکتی ہے اس میں ذہنی تربیت داخل نہیں، اور خود فن بھی جس طریقے پر سکھایا جاتا ہے وہ سائنٹفک نہیں، اور اس لیے یہ بھی اکثر ہوتا ہے کہ نوجوان اپنا آبائی پیشہ سیکھ کر بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ حکومت نے زراعت اور صنعت کی تعلیم دینے کے لیے جو مدرسے کھولے ہیں وہ ایسے اوزار، سامان اور ٹھاٹھ کی عادت ڈال دیتے ہیں کہ وہاں تعلیم پاکر پھر گاؤں میں کام کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت گاؤں میں اچھے دستکار نہیں ملتے اور دیہی صنعتوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی تمام کوششیں ناکامیاب ہوتی ہیں۔ اگر ہم ابتدائی اسکولوں میں کام بھی سکھائیں اور ذہنی تربیت کا بھی انتظام کریں تو ہماری ہر غرض پوری ہو جائے گی۔ گاؤں کے رہنے والے گاؤں کو چھوڑے بغیر اپنا آبائی پیشہ اس طرح سیکھ لیں گے کہ وہ ان کا ذریعہ معاش بن سکے اور ان کے ذہنی قویٰ کی ایسی تربیت ہو جائے گی کہ وہ جدت اور ترقی کے حوصلے کر سکیں۔ کام کے سلسلے میں ذہنی تعلیم دی جائے تو دماغ پر بہت بوجھ نہیں پڑتا، اور ذہنی اور جسمانی نشوونما میں ہم آہنگی رہتی ہے

سچی تعلیم دراصل دستکاری کے ذریعے ہوسکتی ہے ۔

ہندوستان کے دیہاتوں میں ہر جگہ اب بھی بہت سی صنعتیں نیم جان یا انتہائی پستی کی حالت میں موجود ہیں جن کی تعلیم دی جاسکتی ہے ، اور تکلی اور چرخا تو ایسی چیزیں ہیں جو ہر وقت اور ہر جگہ کام آسکتی ہیں ۔ کاتنے اور بننے کا کام کم سے کم سرمایہ سے شروع کیا جاسکتا ہے ، اس میں یہ دشواری بھی نہیں ہے کہ جو مال پیدا کیا جائے اس کی کھپت کیونکر ہو ، اور اس کے دھندے ایسے ہیں کہ اس کے سلسلے میں تاریخ ، معاشیات ، ریاضی ، جغرافیہ وغیرہ جیسے تمام علم بڑی آسانی سے سکھائے جاسکتے ہیں ۔ ہم چاہیں تو ابھی سے تکلی ہاتھ میں لے کر اس نئے طریقے پر تعلیم دینا شروع کر سکتے ہیں ۔ مدرسوں میں اس وقت تکلی چلانے کے ساتھ ساتھ صفائی ، حفظان صحت ، ڈرل اور موسیقی کی تعلیم بھی جاری ہے ۔

گاندھی جی کی تعلیمی تجویز کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس نئی وضع کے مدرسوں کا نظام عمل ایسا ہو کہ وہ اپنا خرچ آپ برداشت کریں یعنی اتنا مال پیدا کریں کہ اسے بیچنے سے ان کے اخراجات پورے ہوسکیں ۔ ہندوستان جیسے کنگال ملک میں تعلیم عام کرنے کا اور کوئی طریقہ ممکن ہی نہیں ہمارے وزیر اس فکر میں رہے کہ آمدنی بڑھے تو تعلیم پھیلائیں تو انھیں بہت انتظار کرنا ہوگا ، اگر وہ واقعی کام کرنا چاہتے ہیں تو انھیں اس اصول پر چلنا ہوگا کہ تعلیم اپنا خرچ آپ نکالے ۔ دوسری طرف ، اگر خالص تعلیمی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ مدرسے میں آمدنی کے خیال سے کام کرایا جائے ۔ یہ سمجھ لینا کہ لڑکوں کے ہاتھ میں جو چیز دی جائے اسے وہ توڑ ہی ڈالیں گے بالکل بیجا ہے ، اور ہم بغیر کسی دشواری کے کھلونوں کو تعلیم کا ذریعہ ، اور پھر تعلیم کو آمدنی کا ذریعہ بنا سکتے ہیں ۔ ایک صاحب نے اس کے متعلق ہریجن میں لکھا ہے کہ لڑکوں سے اس طرح کام لینا ان کو غلام بنا لینے کے برابر ہے ، لیکن اس طرح کا اعتراض صحیح نہیں ، جب ہم دیکھتے ہیں

کہ وہی لڑکے اب بھی ماں باپ کے لیے برابر ایسے کام کرتے ہیں جن سے آمدنی کی اُمید ہوتی ہے دیہاتی تو سب اس پر خوشی سے راضی ہو جائیں گے کہ ان کے لڑکوں کو دستکاریاں سکھائی جائیں، اور اگر اس تعلیم کا برابر بازار میں امتحان ہوتا رہا تو انھیں اور بھی زیادہ اطمینان ہوگا۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنے آپ کو اس دھوکے میں رکھیں کہ تعلیم صرف دان دی جا سکتی ہے اور لڑکوں سے تعلیم کے لیے کچھ مل نہیں سکتا۔ حکومت کو تو یہ سمجھنا چاہیے کہ مدرسوں اور طالب علموں سے یہ مطالبہ کر کے کہ وہ اپنا خرچ اپنے کام سے نکالیں وہ دراصل اس کا مطالبہ کر رہی ہے کہ تعلیم کار آمد ہو اور جو اسے حاصل کرلے وہ کمانے کھانے کے لائق ہو جائے۔

اب رہا یہ سوال کہ ہمارے دیہاتی اسکولوں کے لیے مدرّس کہاں سے آئیں گے، سو اس کا حل وہی ہے جو پروفیسر شاہ نے پیش کیا ہے۔ ہم ان تمام لڑکوں کو جو میٹرکولیشن پاس کریں ایک سال کے لیے دیہاتی اسکولوں میں پڑھنے پر مجبور کریں۔ دوسرے ملکوں میں نوجوان فوج میں بھرتی کیے جاتے ہیں اور انھیں بڑی عمر کے دو سے لے کر چار سال تک قومی خدمت کے لیے وقف کرنا پڑتے ہیں، اس لیے ہم اپنے نوجوانوں سے تعلیمی کام لیں تو اس میں کوئی بے انصافی نہ ہوگی۔ جب ریاست لڑکوں کی تعلیم پر اتنا خرچ کرتی ہے تو وہ اپنے خرچ کا ایک حصّہ اس طرح وصول بھی کر سکتی ہے۔

آخر میں گاندھی جی نے کہا کہ سیرت کی تشکیل کتاب کے ذریعے سے نہیں ہوتی، ہاتھ کے کام سے ہوتی ہے۔ خالی دماغ سے کام لینا آدمی کی صفت نہیں ہے شیطان کی صفت ہے۔ تعلیم کے معاملے میں ہم یورپ کی تقلید نہیں کر سکتے، اس لیے کہ وہاں گولے بارود کا راج ہے، اور روس بھی ہمارے لیے کوئی مثال نہیں، اس لیے کہ ہم اہنسا کو مانتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں تعلیم پر بہت زیادہ خرچ کیا جاتا ہے، لیکن ان کی دولت دوسری قوموں کا

خون چوس کر حاصل کی جاتی ہے ہمیں تو ایسی تدبیریں اختیار کرنا ہوں گی جو ہماری معاشی حالت اور اخلاقی عقیدوں کے مناسب ہوں۔

گاندھی جی نے جو تجویزیں پیش کیں وہ ایسی تھیں کہ ایک طرف وزیر جنھیں تعلیم کا انتظام کرنا تھا اور جو یوں بھی مالی مشکلات کے سبب سے پریشان تھے، اور دوسری طرف ماہرانِ تعلیم گھبرا گئے۔ وزیروں میں کوئی بھی نہیں مانتا تھا کہ تعلیم اپنا خرچ آپ برداشت کر سکتی ہے لیکن اگر کانفرنس گاندھی جی کے اصرار پر طے کرتی کہ ایسا ہو سکتا ہے تو ان کی کچھ نہ چلتی، ان سے کہا جاتا کہ تعلیم کا بڑے پیمانے پر نئے اصول کے مطابق انتظام کرو اور اگر وہ ذرا بھی پس و پیش کرتے تو ہر طرف سے اعتراضات کی مار پڑتی۔ ماہرانِ تعلیم زیادہ تر اس وجہ سے گھبرائے کہ وہ تعلیم کی پیچیدگیوں اور اُستادوں کی کوتاہیوں سے واقف ہیں، انھیں اخراجات کا بھی اندازہ ہے، اور اس لیے ان میں سے کوئی بھی یہ تسلیم کرنے پر تیار نہ تھا کہ مدرسوں میں دستکاری کے ذریعے مکمل تعلیم دی جا سکتی ہے یا دستکاری سکھانے سے مدرسے اپنا خرچ نکال سکیں گے، لیکن دونوں اپنی بات کمزوریوں کے اعتراف سے پیرائے میں کہہ سکتے تھے، وزیر کہتے تو یہ کہتے کہ ہم میں اتنی انتظامی قابلیت نہیں ہے کہ ہم ایسے مدرسے بڑے پیمانے پر قائم کر سکیں، ماہرانِ تعلیم یہ کہتے کہ اب تک ہم نے جس طریقے پر پڑھایا ہے اس میں کتاب کے بغیر کام نہیں چلتا، کتاب کے ساتھ ہم اچھے استاد پر بھی بھروسا کرتے ہیں، اور اگرچہ ہم خالی کتابی تعلیم کو بُرا سمجھتے ہیں اور حتی الامکان ہاتھ کا کام بھی سکھاتے اور کراتے ہیں، ہم نے یہ کبھی نہ دیکھا ہے نہ سنا کہ مدرسے اپنی بنائی ہوئی چیزوں کو بیچ کر اپنا خرچ نکالتے ہیں۔ ہاں یہ بے شک ممکن ہے کہ ہم لڑکوں سے کارخانے کے اصول پر کام کرائیں اور کارخانے کا نام اسکول یا صنعتی اسکول رکھ

لیں سکا نفرنس میں ایسے لوگ موجود تھے جنھیں دعوےٰ تھا کہ اُنھوں نے دستکاری کے ذریعے سے مکمل تعلیم دی ہے اور مدرسے کی مصنوعات سے تعلیم کا پورا خرچ نکلا ہے، اس لیے وزیروں اور ماہران تعلیم کی معذرت آمیز مخالفت کا نہ جانے کیا نتیجہ نکلتا لیکن گاندھی جی نے تقریر ختم کر کے جب لوگوں سے کہا کہ اپنی اپنی رائے دیں تو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اِدھر اُدھر دیکھ کر اور سب کی نظریں نیچی پا کر کھڑے ہو گئے اور ان کی تقریر نے سب کی مشکلیں آسان کر دیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب خود بھی سمجھتے ہیں کہ سچی تعلیم وہ ہے جس میں انسان کی تمام صلاحیتیں نشو و نما پائیں، اور چونکہ یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ خالی کتابیں پڑھ لینے سے یہ مطلب حاصل نہیں ہوتا، اس لیے وہ بھی چاہتے ہیں کہ ابتدائی تعلیم میں خصوصاً ہاتھ کے کام کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دی جائے لیکن یہ مسئلہ تعلیمی ہے، اس کا روحانیات، اہمسا، دیہاتی تہذیب، تکلی اور چرخے سے کوئی خاندانی تعلق نہیں۔ ذاکر صاحب نے تقریر شروع اسی سے کی۔ اُنھوں نے کہا کہ گاندھی جی کا یہ خیال کہ وہ تعلیم کو ایک بالکل نئی صورت دے رہے ہیں صحیح نہیں، اس لیے کہ مشہور جرمن معلم پستالوزی نے اسی طریقۂ تعلیم کو سب سے بہتر مانا ہے، اور اس کے بعد سے اس خیال کو عام طریقِ تعلیم میں شامل کرنے کی برابر کوشش ہوتی رہی اور سینکڑوں معلّموں نے تجربہ کر کے اس خیال کو بہترین عملی روپ دینے کی ترکیبیں نکالی ہیں۔ اس وقت اسی طریقے کی ایک خاص صورت امریکہ میں پروجکٹ متھڈ (منصوبی طریقہ) اور دوسری روس میں کومپلکس متھڈ کے نام سے رائج ہے لیکن یہ طریقہ اتنا محدود نہیں ہے جتنا کہ گاندھی جی نے ظاہر کیا ہے، تکلی کے ذریعے ہر علم نہیں سکھایا جا سکتا، اور ایک دستکاری کو لے کر بیٹھ جانے سے کام کے ذریعے تعلیم دینے کا

اُصول بن نہیں جاسکتا۔گاندھی جی نے ابتدائی تعلیم کے لیے سات سال کی جو مدت مقرر کی تھی اس سے ڈاکٹر ذاکر صاحب نے اختلاف کیا، اس بنا پر کہ یہ تعلیم اس وقت ختم ہو جائے گی جو دراصل صلاحیتوں کے ظاہر ہونے کی عمر ہوتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تعلیم اور تربیت نامکمل رہ جائے گی اور اس کا مقصد بھی یقین کے ساتھ نہ بتایا جا سکے گا کہ پورا ہوا یا نہیں۔ ہمیں چاہیے کہ سات برس کی عام جبری تعلیم کو تکمیل دینے کے لیے ایسے مدرسے قائم کریں جہاں مخصوص صلاحیتوں کے مطابق تربیت دی جائے، یعنی ایک مدرسہ دستکاری اور صنعتی تعلیم کے لیے ہو تو دوسرا ریاضی اور علوم طبیعی کے لیے، اور چونکہ ادبی ذوق بھی مانی ہوئی صلاحیتوں میں ہے، اس کی تربیت کے لیے بھی ایک مدرسہ چاہیے۔ چونکہ ہم اس طریق تعلیم کو بہت بڑے پیمانے پر رائج کرنا چاہتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ ہم چند ادارے منتخب جگہوں پر قائم کریں، اور وہاں اس کا تجربہ کر کے ایسے نمونے بنالیں جن کی پھر عام طور سے نقل کی جا سکے، ورنہ ممکن ہے کہ نئی تعلیم کے رواج سے ہمیں فائدے کی جگہ اُلٹا نقصان ہو۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے بعد مولوی عبدالحق صاحب نے ایک مختصر سی تقریر میں فرمایا کہ اگر بچوں کی تعلیم ساتویں برس شروع کی جائے تو اس کا بھی انتظام ہونا چاہیے کہ وہ پانچویں سے ساتویں برس تک تعلیمی کھیل کود میں مشغول رکھے جائیں اور مدرسے کی تعلیم کے لیے تیار کیے جائیں۔ مولوی صاحب کے بعد کئی حضرات نے جن میں قریب قریب سب کسی نہ کسی طرح کنڈرگارٹن کی تعلیم کا تجربہ رکھتے تھے کانفرنس کو اس ضرورت کی طرف متوجہ کیا۔

کانفرنس کے لوگوں میں گاندھی جی کی تجویزوں سے بنیادی اختلاف صرف پروفیسر شاہ کو تھا۔ وہ سوشلسٹ ہیں اور ان کے خیال میں اس وقت مشین اور کارخانے سے عداوت برتنا جب کہ ساری دنیا میں انھیں کا راج ہے دریا کو اُلٹا بہانے کے منصوبے سے کم نہیں

گاندھی جی نے یہ طریقۂ تعلیم بے روزگاری دور کرنے کے لیے سوچا ہے، لیکن تعلیم سے قطع نظر ہندوستان میں جو معاشی دشواریاں پیش آ رہی ہیں ان کا سبب دولت کی غلط تقسیم ہے، اور یہ مسئلہ نئی تعلیم کی مدد سے حل نہ ہوگا۔ ہم دستکاری کی تعلیم دیں یا اسے تعلیم دینے کا ذریعہ بنائیں تو اس میں ایک خطرہ تو یہ ہے کہ سب لوگ ایک خاص ذہنیت کے نمونے بن جائیں گے اور ہماری غریبی اور بڑھ جائے گی، دوسرا خطرہ یہ ہے کہ اگر تعلیم کا خرچ نکالنے پر زور دیا گیا تو نئے مدرسوں کی صنعتی تعلیم ویسی ہی بیجان ہو جائےگی جیسی کہ کتابی تعلیم اس وقت ہو گئی ہے۔ معاشی نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو تعلیم کا یہ طریقہ بڑی اُلجھنوں کا پیش خیمہ ہوگا۔ گاندھی جی کی تجویز کے مطابق ریاست نئے مدرسوں کو عمارت، سامان، استاد دے گی، اور ان میں جو چیزیں تیار ہوں انھیں بیچنے کا انتظام کرے گی اس طرح کوئی دو کروڑ بچے ہر وقت صنعتی مال تیار کر کے منڈی میں ڈالتے رہیں گے اگر ایسا ہوا تو پھر ان دستکاروں کا کیا حشر ہوگا جو اس وقت موجود ہیں، اور ان کو جنھیں نئے مدرسے تعلیم دے کر اپنی روزی کمانے بھیجیں گے اپنے مال کے خریدار کہاں سے ملیں گے دراصل گاندھی جی کی تجویز اسی صورت میں قابل عمل ہو سکتی ہے کہ ہم دوسرے ملکوں سے مال کی درآمد بند کر دیں اور اپنی موجودہ صنعتوں کو بھی ختم یا کسی طرح نئے تعلیمی نظام میں محو کر دیں، لیکن پروفیسر شاہ کو بھی اس سے اتفاق تھا کہ تعلیم ہاتھ کے کام کے ذریعے سے دینا چاہیے، مگر اس میں بھی انھوں نے یہ شرط لگائی کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے مخصوص استعداد کے مدرسوں کی جو تجویز پیش کی تھی وہ بھی منظور کی جائے، اور عام تعلیم کے انتظام کے ساتھ ایسے مدرسے بھی قائم کیے جائیں۔

پروفیسر شاہ کے بعد کئی اور حضرات نے تقریریں کیں جنھیں یہاں دہرانے کا

موقع نہیں، اسی روز سہ پہر کو کانفرنس کا دوسرا اجلاس ہوا۔ مہاتما جی نے شروع میں اعتراضات کا جواب دیا، لیکن ان کا اصل مقصد یہ تھا کہ غلط فہمیاں رفع کریں اور یہ واضح کر دیں کہ وہ تکلی کا پرچار کرنا یا کسی نئے صنعتی نظام کی بنیاد رکھنا نہیں چاہتے ہیں۔ ان کے بعد جن لوگوں نے ان کے قریب بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر تقریریں کیں وہ ایک خاص ذہنی رنگ میں رنگے ہوئے تھے اور اپنے پیر و مرشد کی کمزوری اور پست ہمتی سمجھتے تھے کہ وہ دوسرے کی بات سنتے ہیں اور اس کے تجربے اور علم کی قدر کرتے ہیں۔ پہلے مقرر ونوبا صاحب نے کہنا چاہیے، گاندھی جی کو سامنے سے ہٹا کر نئی تعلیمی تجویز پیش کرنے کا سہرا اپنے سر لے لیا اور فرمایا کہ "ہر بچن میں جو کچھ میں نے پڑھا اس نے میرے تجربے کی تصدیق کی، شاید کہ سماننا (لفظی شباہت) ہو تب بھی وچاروں کے اندر جانے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم کچھ چاہتے ہیں۔ یعنی گاندھی جی کی تجویز خاص ان کے ذہن کی ایجاد ہے، اور یہ جو کہا گیا کہ لوگ پہلے بھی اسے جانتے تھے وہ غلط ہے۔ آگے چل کر انھوں نے یہ فرمایا کہ آج کل لوگ محنت سے جی چراتے ہیں، اُستاد لڑکوں کو مدرسے کے سامنے پیشاب کرتے دیکھتے ہیں اور کچھ نہیں کہتے، ان سے بیڑیاں منگواتے ہیں اور اپنی طرح انھیں بھی آرام طلب بنا دیتے ہیں۔ اُستادوں کی مخالفت کرتے کرتے ونوبا صاحب تعلیم کی بھی مخالفت کرنے لگے، اور ایسا کچھ کہا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ تعلیم کا لفظ دوسروں کی رعایت۔ شاید گاندھی جی کی اخلاقی کمزوری۔ سے درمیان میں آیا، ورنہ اصل کام تو دستکاری سکھانا ہے۔ گاؤں والے اُستاد اور تعلیم کی حقیقت معلوم کر چکے ہیں۔ وہ مروّجہ قسم کے مدرسوں میں اپنے بچوں کو بھیجنے میں تامّل کرتے ہیں، دستکاری سیکھنے کیلئے بڑی خوشی سے بھیجیں گے۔
ونوبا صاحب بول چکے تو کاکا صاحب کالیلکر کی باری آئی۔ انھوں نے ۱۹۰۷ء سے

اپنا تجربہ اور اپنے تعلیمی نصب العین کے بدلنے کا قصہ سنایا، گاؤں کی اہمیت اور کتاب کی بے وقعتی جتائی، مشین سے اس وقت تک کام لینا حرام ٹھہرایا جب تک آدمی اور جانور کی پوری طاقت سے کام نہ لیا جا چکا ہو، پروفیسروں اور وکیلوں نے جو قوم کو الجھن میں ڈال رکھا تھا اس کی شکایت کی، اور اس کے بعد فلسفۂ تعلیم پر پہنچے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے چند ماہرانِ تعلیم کے نام لیے تھے، یہ سب کاکا صاحب نے دہرائے اور فرمایا کہ میں ان سب کو پرکھ چکا ہوں، اور پھر یہ فتویٰ دیا کہ جب تک ہندوستانی ان قوموں میں شامل نہ ہو جائیں جو دوسروں کا خون چوس کر دولت حاصل کرتی ہیں تب تک ہندوستان میں مونٹیسوری اور پروجیکٹ میتھڈ (منصوبی طریقہ) رائج نہیں ہو سکتا۔

اس گولہ باری کے بعد صوبۂ متوسط کے وزیرِ تعلیم شکلا صاحب نے تقریر کی۔ وہ خود اس فکر میں ہیں کہ عام جبری تعلیم کا خرچ کسی طرح سے نکالیں۔ اور انھوں نے یہ طے کیا ہے کہ جہاں جہاں اسکول بنانے ہوں وہاں اتنی زمین حاصل کر لیں جو استاد کی بسر اوقات کے لیے کافی ہو۔ اپنے مجوزہ مدرسوں کا نام انھوں نے "ودیا مندر" یعنی علم کا گھر رکھا ہے، اور انھیں وہ غالباً تعلیم کے ساتھ تنظیم کے مرکز بھی بنانا چاہتے ہیں۔ دستکاری کے ذریعے تعلیم دلانے میں انھیں کوئی عذر نہیں، اور مدرسے اپنا خرچ آپ نکال سکیں تو انھیں بہت خوشی ہوگی لیکن انھوں نے کہا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ممکن کیسے ہوگا۔ میں نے تو یہ سوچا ہے کہ واپس جاتے ہی حکم دیدوں گا کہ واردھا اور سیگاؤں کے اردگرد پندرہ بیس مدرسے بنا دیے جائیں، اور انھیں مہاتما جی کے سپرد کر دوں گا کہ انھیں چلائیں۔ کامیابی کی صورت میں تیار ہوں کہ مہاتما جی جو نمونے پیش کریں ان کی نقل کروں۔

گاندھی جی کی خواہش پر اسی روز رات کو آٹھ سے دس بجے تک کانفرنس نے

بحیثیت کمیٹی کے ان کی تجویزوں پر غور کیا اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو اس کمیٹی کا صدر مقرر کیا۔ صدر کی حیثیت سے ذاکر صاحب کو ان لوگوں کی دلجوئی کرنے کا موقع مل گیا جنھیں ان کا یہ کہنا بہت ناگوار معلوم ہوتا تھا کہ مہاتما جی کی تجویز نئی اور نرالی نہیں ہے، اور انھوں نے ان تمام لوگوں کو تقریروں کا موقع دیا جو اپنی قابلیت ظاہر کرنے کے لیے بے چین تھے کمال یہ تھا کہ کام بھی ہو گیا، اور کمیٹی نے بحث کے بعد چار رزولیوشن اتفاق رائے سے کانفرنس کے سامنے پیش کرنے کے لیے مرتب کر لیے۔ رزولیوشن یہ تھے :-

(۱) اس کانفرنس کی رائے میں سارے ملک کے لیے عام جبری تعلیم کا انتظام کیا جائے اور یہ تعلیم سات سال تک دی جائے۔

(۲) ذریعہ تعلیم مادری زبان ہو۔

(۳) یہ کانفرنس مہاتما گاندھی کی اس تجویز کی تائید کرتی ہے کہ اس تمام مدت میں جو تعلیم دی جائے اس کا مرکز کوئی دستکاری ہونا چاہئے، یہ دستکاری ماحول اور ضروریات کا لحاظ رکھ کر منتخب کی جائے اور جہاں تک ممکن ہو تعلیم اور صلاحیتوں کی تربیت کا جو طریقہ اختیار کیا جائے اس کا اسی دستکاری سے گہرا تعلق ہونا چاہیے۔

(۴) اس کانفرنس کو امید ہے کہ اس طریقہ تعلیم سے آہستہ آہستہ اتنی آمدنی ہونے لگے گی جس سے اُستاد کی تنخواہ نکل آئے۔

دوسرے روز کمیٹی کے یہ ریزولیوشن کانفرنس کے سامنے پیش کیے گئے اور گاندھی جی نے یہ کہہ کر کہ کانفرنس کی تجویزوں کا مقصد ملک کو پابند کرنا نہیں ہے اور جتنا اور تعلیم یافتہ لوگوں نے انھیں دل سے قبول نہ کیا اور مدد کرنے کو کھڑے نہ ہو گئے تو تجویزوں پر عمل نہ کیا جا سکیگا پھر حاضرین کو اپنے خیالات ظاہر کرنے کی دعوت دی۔ پروفیسر شاہ نے پھر اصرار سے کہا کہ

آمدنی پر زور نہ دینا چاہیے۔ تعلیم کو کسی ایک صنعت تک محدود نہ کرنا چاہئے۔ ابھی ناس لنگم صاحب ایم ایل اے اور پروفیسر ملکانی صاحب نے اپنے تجربے کی بنا پر کہا کہ آمدنی اور تعلیم دونوں کا ایک ساتھ خیال نہیں رکھا جا سکتا، اور نانا بھائی صاحب نے بھی، جو بھاونگر کے ایک بہت مشہور اور کامیاب بچوں کے اسکول کے بانی اور منتظم ہیں، کہا کہ تجارتی پہلو کا زیادہ خیال کیا گیا تو ابتدائی تعلیم کی تعلیمی قدر بہت گھٹ جائے گی۔ اس کے بعد وزیروں کی تقریریں ہوئیں، اور ان سب نے کانفرنس کی عام رائے سے اتفاق کرتے ہوئے اپنے بس بھر کرنے کا وعدہ کیا، مگر صبر اور احتیاط کی ضرورت بھی جتائی ۔

آخر میں گاندھی جی نے کانفرنس میں جو خیالات ظاہر کیے گئے تھے ان پر ایک نظر ڈال کر کمیٹی کے چاروں ریزولیوشن کانفرنس کے سامنے پیش کیے اور وہ سب اتفاق رائے سے منظور ہوئے۔ تب گاندھی جی نے اس نئے طریقہ تعلیم کے لیے نصاب بنانے کی غرض سے ایک کمیٹی مقرر کی اور ذاکر صاحب کو اس کا صدر بنایا۔ ذاکر صاحب کو واردھا میں ایک دن کے لیے روک کر گاندھی جی نے نصاب کمیٹی کا پہلا جلسہ بھی کرا لیا، اور یہ کمیٹی غالباً نومبر کے آخر تک اپنا کام ختم کر دے گی ۔

گاندھی جی نے ایک تقریر کے دوران میں کہا تھا کہ میں پہلے نہیں سمجھتا تھا کہ مجھ میں پروپیگنڈا کرنے کی خاص صلاحیت ہے، لیکن لوگوں نے میری تعریف کرتے کرتے مجھے یقین دلا دیا ہے کہ میں واقعی اس فن میں ماہر ہوں۔ دراصل لوگوں کی زبان سے زیادہ گاندھی جی کی اپنی یک جہتی اور ان کے خلوص نے ان کو تبلیغ کے فن میں کامل بنا دیا ہے۔ اور وہ اپنی بات کی دھوم ہی نہیں مچا سکتے بلکہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام کر سکتے ہیں اور کرا سکتے ہیں ان میں یہ صلاحیت بھی ہے، جو خدا کی طرف سے صرف چند برگزیدہ ہستیوں کو ملتی ہے، کہ وہ

آدمی ہی نہیں بلکہ زمانے کو بھی پہچانتے ہیں اور زندگی کو کبھی مقصد سے خالی نہیں رہنے دیتے یہ ان ہی کی شخصیت کا فیض ہے کہ ہندوستان کی سیاسی تحریک کے ساتھ ساتھ ایسی معاشرتی تحریکیں بھی جاری رہیں جنھوں نے قومی خدمت کا حوصلہ اور استعداد رکھنے والوں کو برابر تعمیری کاموں میں مصروف رکھا اور اب کہ مخالفت کی جگہ حکومت کے فرائض ادا کرنا کانگریس کے سپرد ہوا ہے۔ ان ہی کی نظر ہے جو وقتی دشواریوں اور ذمہ داریوں کے آگے دیکھ رہی ہے۔ کانگریس کے موجودہ صدر نے کانگریس کو بحیثیت پارٹی کے مضبوط اور سب پر حاوی کرنے اور ان کے ہاتھوں قدامت پسند اور فرقہ پرست مسلمانوں کی جڑ کاٹنے کا تہیہ کیا ہے، کانگریسی حکومتیں ابھی تک کندھے بدل بدل کر اپنے آپ کو سیاسی باربرداری کا عادی بنا رہی ہیں۔ گاندھی جی نے عام جبری تعلیم کی تحریک اُٹھائی ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ ہماری سیاست کی جان یہی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ قوم ان کی دوراندیشی کا حق ادا کرسکے گی یا نہیں۔ اپنی طرف سے تو وہ جو کچھ ہو سکتا ہے کر کے چھوڑیں گے ۔

اُستادوں کیلئے فنِ تعلیم کا انتظام اور اس کی اصلاح

بسلسلۂ گذشتہ

از بشیر احمد ڈار ایم۔اے۔بی۔ٹی

اپنی وزارت کے دوران میں جنٹیلے نے اطالوی نظام تعلیم میں چند ایک تبدیلیاں کیں اس کا خیال تھا کہ تعلیم کی اصلاح ، اساتذہ کی اصلاح کے بغیر ممکن نہیں۔ اس کے نزدیک معلمین کا یہ فرض ہے ، کہ وہ سمجھ لیں تعلیم محض چند بے جان اصول کی پیروی کا نام نہیں بلکہ ایک روحانی عمل ہے۔ ایک اعلےٰ مقصد اور آئیڈیل ہے جس کے لیے انسان کو اپنے کلچر اور اصلاحی قوے کی نئی تشکیل لازم آتی ہے ، درسی کتب کا ایک نیا سلسلہ تیار کیا گیا جس میں ملکی روایات اور ادب کا خاص خیال رکھا گیا ، سیرت کی تکمیل کے لیے جسمانی تربیت پر بہت زور دیا گیا ، ثانوی تعلیم میں کلاسکس (یعنی لاطینی اور یونانی علوم) کی تعلیم اہم قرار دی گئی۔ مسولینی کے مندرجہ ذیل الفاظ ، اطالوی تعلیم کی روح کو بے نقاب کرتے ہیں۔

(۱۹۳۵): "وہ دن آنے والا ہے جب نام نہاد صاحبان علم کو اپنے ہاتھوں سے کام کرنا ہوگا تاکہ وہ اُن ٹھوس حقائق (زمین ، پانی اور مادہ) کو محسوس کر سکیں جن سے دولت اور طاقت حاصل ہوتی ہے "۔

سنہ ۱۹۳۲ء میں ہر ہٹلر نے جرمنی میں ایک نیا سیاسی انقلاب پیدا کر دیا جس کے باعث حکومت نازی گروہ کے قبضے میں منتقل ہو گئی۔ اس کے گروہ کے راہنماؤں نے

شروع ہی سے انفرادیت کے خلاف آواز اٹھانی شروع کی لیکن چند معمولی تبدیلیوں کے علاوہ جرمنی نظام تعلیم میں کوئی خاص تبدیلی رونما نہ ہوئی، نازی راہنماؤں کے نزدیک حکومت کا اہم ترین کام نسل کی بقا اور نسلی خصوصیات کی حفاظت ہے اور تعلیم کو انہی مقاصد کے مطابق بدلنے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ تعلیم کی بنیاد بچوں کی خواہشات پر نہیں بلکہ لوگوں اور ان کی ضروریات پر رکھی گئی، اور تعلیم کا تمام عمل محض درسی کتب کی تحصیل کے بجائے مختلف قسم کی نوجوان سبھاؤں کے ذریعے جسمانی ورزش اور تخلیقی کارگزاریوں پر مشتمل سمجھا جانے لگا۔

ایسے نوجوانوں کی تربیت مدرسوں کے عام اساتذہ سرانجام نہیں دے سکتے، اس لئے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے والے معلّموں کے لیے کچھ ایسی تربیت کی ضرورت ہے، جو دوسرے ملکوں سے مختلف ہو۔ معلم کی اعلےٰ تعلیم کے نصاب میں ایسے علوم ہونے چاہئیں جو قوم، نسل اور افراد کے لیے فائدے کا موجب ہوں۔ محض تحصیل اور تحقیق علم بالکل بے فائدہ شغل ہے، جس سے حکومت کو کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ اور ایک عالم (Scholar) کی حیثیت حکومت کی نگاہ میں کچھ وقعت نہیں رکھتی۔

اگرچہ مدرسوں میں کوئی خاص اہم تبدیلیاں رونما نہیں ہوئیں پھر بھی ایسے خیالات کا اثر لازمی ہے۔ اس لئے معلّمی کی تربیت حاصل کرنے والے اگرچہ بہت حد تک اُسی نصاب کو طے کر رہے ہیں، جو نازی انقلاب سے پہلے رائج تھا، پھر بھی حکومت اور ملک کی خواہشات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے ان کے لیے ضروری ہو چکا ہے، کہ بچّوں کو ان مقاصد کے مطابق تعلیم و تربیت دیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ جنگ کے باعث ہر ملک کے سماجی نظام میں حیرت انگیز تغیرات پیدا ہوئے اور ایسے ہی تغیرات درحقیقت تعلیمی نصاب اور ماحول کے انقلابات کا پیش خیمہ ہوتے ہیں اس سے شاید کسی کو انکار کی مجال نہیں کہ تعلیم کا مفہوم اور مقصد یہ ہے کہ بچوں کو ایسی تربیت دی جائے کہ وہ اپنی فطری اور اکتسابی استعدادات کی مدد سے سماجی زندگی کے لیے موجب فائدہ ہوں، اور فطرت کے منشائے تخلیق کو پورا کر سکیں اگر تعلیم کو اسی معنوں میں لیا جائے، کہ وہ قومی جذبات اور ملّی روح کی آئینہ دار ہے تو اُس تعلیم سے، جو معاشرہ ان بچوں کے پڑھانے والوں کو دیتا ہے، ہم اندازہ کر سکتے ہیں، کہ کس حد تک وہ ان جذبات اور روایات کی محافظت کر رہا ہے۔ اور ان حالات میں تو یہ یقینی ہے کہ معلّموں کی تعلیم کا عمدہ انتظام، عام تعلیم سے بہت زیادہ اہم ہے تعلیم و تہذیب کا جو معیار ہم ان کے سامنے پیش کریں گے، وہی چیز ہماری آئندہ نسلوں تک پہنچ سکتی ہے، اس لیے جہاں ہمارے لیے لازمی ہے کہ تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر حالات کے مطابق بحث کی جائے، اور عوام کو اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہو، وہاں ہمیں ان تمام مباحث اور اصلاحات سے پہلے چند لمحوں کے لیے یہ سوال پُوچھ لینا چاہیے: آیا ہمارے موجودہ معلّمین ان اصلاحات کو کامیابی کے ساتھ عمل میں لا سکتے ہیں؟ کیا ان کی تعلیم و تربیت کا معیار اتنا بلند اور وسیع ہے کہ وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں اپنے ملک، اپنی قوم اور دنیا کی موجودہ کشمکش اور ضروریات کو سمجھ سکیں؟ کیا وُہ اپنی قومی روایات سے اس طور سے واقف ہیں کہ وہ بچوں میں ان روایات کے لیے تعظیمی جذبہ پیدا کر سکیں؟ یہ اور ایسے ہی سوالات اور بھی ہیں جن کے متعلق اگر ہم اپنے دل سے استفسار کریں تو سوائے مایوسی کے ہمیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔ . .

کبھی وہ زمانہ تھا جب تعلیم کا تمام تر کمال حافظہ الہٰی وہبی اور غیر حقیقی قوت کی نشوونما تک محدود تھا لیکن علم نفس کی جدید تحقیقات نے الہٰی قوت کی ہستی سے انکار کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم کا دائرہ عمل وسیع تر ہو کر بچوں کی نفسیاتی شخصیت کی نشوونما قرار پایا۔ اگرچہ بیان میں یہ تمام مفہوم چند الفاظ میں ادا کر دیا گیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بچوں کی نفسیاتی شخصیت کی نشوونما کچھ ایسا سہل کام نہیں۔ اس کام کو صحیح طور پر ادا کرنے کے لیے نہ صرف علم نفسیات کے پیچ در پیچ نظری مسائل پر غور کرنا لازمی ہے، بلکہ ایک عمدہ تجربہ گاہ میں عملی طور پر بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں ان کی روزمرہ کی نفسیاتی زندگی اور اس کے مظاہرات کا مطالعہ بھی بہت ضروری ہے۔ بچوں کو مختلف قسم کی بے معنی اطلاعات اور واقعات کا رٹا دینا تعلیم نہیں بلکہ ان کے تمام تخلیقی قوے کی موت ہے، اور قوم کی بنیاد کو نااستوار کرنا ہے۔ بچوں کو اس طریقے سے تعلیم دی جائے کہ ان کی ذاتی صلاحیتوں اور فطری رجحانوں کو برسرِ کار لایا جائے جن کی مدد سے وہ زندگی کی مشکلات کا حل سوچ سکیں۔ ان تمام کاموں کی ذمہ داری آخر کار معلموں پر ہی عائد ہوتی ہے۔

جنگ عظیم سے پہلے بچوں کی زندگی کے تخیلاتی اور تخلیقی پہلو کو بالکل ناقابل اعتنا سمجھ کر فراموش کرنے کی کوشش کی جاتی رہی یا اگر کبھی درسی نصاب میں چند ایسے مضامین داخل کیے گئے جن سے یہ قوائے نشوونما حاصل کر سکیں تو یہ صرف کسی مروجہ تعلیمی نظریے کے ماتحت تھا یا شاید کسی قریبی فائدے کی خاطر۔ مثلاً پسٹالوزی کا شاندار تعلیمی نظریہ "تعلیم بذریعہ عمل" اگرچہ کچھ مدت تک نیم مردہ حالت میں چند مدارس میں رائج رہا، لیکن اٹھارہویں صدی کے آخری حصے میں، ایسے "بے فائدہ" مضامین کی بجائے سپنسر کے پسندیدہ مضامین دستکاری اور عملی تجربات، داخل نصاب کیے گئے۔ لیکن صرف موجودہ دور میں اصول فعالیت (جو

پسٹالوٹسی کے نظریے کا دوسرا نام سمجھنا چاہیے) کی نفسیاتی اور معاشرتی اہمیت واضح ہوئی صرف جنگ کے بعد کا زمانہ ہی ایسا تھا جب فرد اور جماعت ہر دو کی یکساں اہمیت کا احساس قوت پکڑتا چلا گیا، اور اسی ماحول میں علم نفس اور علم معاشرہ (Sociology) کے نتائج اور تحقیقات درسی نصاب کے انتخاب اور عمل پر اثر انداز ہو سکے۔ اگرچہ فراوڈ (Freud)، ینگ (Jung) اور ایڈلر (Adler) ایسے ماہرین نفسیات اپنے اُصول کے لحاظ سے ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف ہوں، کم از کم ان کی تحقیقات کا باہمی نتیجہ یہ ہوا کہ بچوں کے لیے آزادی کا راستہ کھول دیا گیا کیونکہ ان کی جبلی خصوصیات کو دبانا یقیناً ان کی نفسیاتی موت کے مترادف ہے اور جہاں یہ یقینی امر ہے کہ اس دور کے معلم علم نفسیات سے کافی بہرہ حاصل کر سکتے ہیں، وہاں یہ چیز بھی ناقابل تردید ہے کہ جماعت کے ہر بچے کی نفسیاتی ہستی سے واقف ہونا کچھ آسان کام نہیں، پھر بھی ان تربیت گاہوں میں معلم کو اس مقدس امانت اور اس کی تمام پیچیدگیوں سے آگاہ کرنے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے اگر آج سے کچھ مدت پہلے علم نفسیات کا دائرہ تحقیق و عمل محض انفرادی زندگی کے مطالعہ اور اس میں بھی صرف عقلی پہلو تک محدود تھا، وہاں اس وقت نفسیات عملیہ (Behaviourism) اور گشتالٹ کی مدد سے انفرادی زندگی کی صحیح نشو ونما کے لیے جماعتی احساس اور پھر عقلی پہلو کے علاوہ عملی اور فعالی پہلو پر بھی زیادہ زور دیا جانے لگا ہے۔ ان حالات کے ماتحت جنگ عظیم کے بعد سے تقریباً تمام یورپی ممالک میں معلّمی کی تعلیم پانے والوں نے خود اپنی طالبعلمی کے دوران میں اور بعد میں اپنی فن تعلیم کے زمانے میں ایسی تربیت حاصل کی ہے، جس سے ایک معاشرتی ماحول میں ان کی اپنی خودی کی نشوونما کا زیادہ امکان ہے۔ علم نفسیات کی ضرورت کا احساس تو یقیناً تعلیمی معاملات میں ناقابل طور تسلیم

ہو چکا ہے، اور خاص کر جہاں معلّم کو چھوٹی عمر کے بچّوں سے واسطہ ہو۔ لیکن مدارس ثانوی کو عمرانی نقطۂ نگاہ سے تبدیل کرنے کا خیال ابھی تھوڑی مدت سے زیر غور آیا ہے اور اس کی اہمیت تقریباً سبھی ملکوں میں محسوس کی جا رہی ہے۔ یہ اصلاح درحقیقت وسیع نقطۂ نگاہ سے بظاہر دو متضاد نظریوں کے درمیان ایک جنگ کی صورت اختیار کر رہی ہے یعنی افادیت (Pragmatism) اور روحانیت (Humanism) افادیت ایک ایسا نظریہ ہے جس کے رُو سے تعلیم کا اوّلین مقصد یہ ہونا چاہیے کہ بچّے فائدہ مند پیدائش کے قابل ہو سکیں اور اس کے دوسرے درجہ پر ان کے قوائے ذوقی کی بھی تربیت ہو، روحانیت اس سے برعکس نظریہ پیش کرتی ہے۔ اس کے مطابق چند ایسے مضامین ہیں جن کی تمدنی قدر دوسروں سے زیادہ ہے، اور اس لیے نصاب کو اس طرح ترتیب دیا جائے جس سے ایسے مضامین کو نمایاں جگہ حاصل ہو تاکہ بچّوں میں ایک خاص تمدنی (Cultural) زاویہ نگاہ پیدا ہو سکے، فرانسیسی نظریۂ تعلیم خالصتہً روحانی ہے، امریکہ کے مدارس اعلیٰ (High Schools) جہاں نصاب کے سبھی مضمون ایک ہی قدر و قیمت کے تسلیم کیے گئے ہیں، افادیت کی ہلکی سی مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ان دو متضاد نظریوں کے درمیان کئی ایک وسطی اور دائیں بائیں کے راستے بھی نظر آتے ہیں۔ اطالوی فیسطائیت کا رجحان، روحانیت کی طرف ہے، اور روسی اشتمالیت، افادیت کی طرف مائل ہے۔

لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ دونوں نظریے ایک حیثیت میں اپنا تضاد کھو دیتے ہیں، اور کافی چیزیں ان دونوں میں مشترک پائی جا سکتی ہیں روحانیت کا مقصد یہ ہے، کہ بچّوں کے ان قوائے کی آزادی سے نشوونما کی جائے، جن سے بچّوں کی زندگی میں قوت اور اصلاح پیدا ہو اور اس لیے یہ نظریہ ان تمام

اُصول کا مخالف ہے جن سے بچّوں کی آزادی اور خودی قربان ہونے کا امکان ہو یا معاشرتی اخوت اور اقتصادی کمال کی خاطر بچّوں کے نفسیاتی اختلافات کو ایک بے کار یکسانیت میں تبدیل کر دیا جائے، ایسی حالت میں روحانیت کا نظریہ پرانے طرز کی محض کلچرل تعلیم کا دشمن ہے، خواہ وہ غیر افادی ہی کیوں نہ ہوں۔ اور ایسی تعلیم جو صحیح معنوں میں افادی ہو، درحقیقت روحانیت کی اصل ہے، کیونکہ اسی کی مدد سے افراد اور قوم کی روحانی ترقی ممکن ہو سکتی ہے۔ اسی قسم کا نظریۂ روحانیت، ۱۹۲۶ء سے (جب ہیڈو رپورٹ شائع ہوئی) انگلستان میں ابتدائی تعلیم کا مقصد پایا۔ تمدنی اور پیشہ وارانہ تعلیم جو بڑی مدت تک متضاد تصورات خیال کیے جاتے تھے، موجودہ دور میں ان میں ایک گہرا تعلق پیدا ہو چکا ہے، اور ان سب کی حیثیت تعلیم کے دو مختلف مگر لازمی پہلوؤں کی سی ہو گئی ہے۔

ایسے وسیع کلچر کا حصول شاید معمولی ذرائع سے ممکن نہ ہو۔ بچّے اس قومی ورثے سے جبھی استفادہ کر سکتے ہیں کہ ان کے معلّمین اس سے بہرہ اندوز ہو چکے ہوں۔ فرانسیسی تعلیم کے ہر درجہ کے مقاصد واضح ہیں، اور ان کے حصول کے ذرائع بھی معیّن کیے گئے ہیں۔ روسی معلّم کو بھی اپنے عجیب و غریب کام کے اہل بنایا جاتا ہے، اسی طرح اطالیہ اور جرمنی میں بھی معلّمین اور نوجوان سبھاؤں کے ذمہ دار افسروں کا انتخاب بڑی احتیاط سے کیا جاتا ہے، اور بعد میں بڑے شاندار پیمانے پر انہیں تربیت دی جاتی ہے، اضلاع متحدہ امریکہ میں بڑی مدت سے بچّوں میں شہریت کے عمدہ جذبات پیدا کرنے کے لیے مدرسین کے لیے خاص تعلیم کا انتظام رائج ہے۔ انگلستان میں، جہاں ایسے اساتذہ کی خاص ضرورت ہے جو حقیقی معاشرتی اور تمدنی تعلیم دے سکیں جبھی ملک کی صنعتی اور دیگر پیشہ وارانہ ضروریات کا بھی خاص لحاظ رکھا جائے وہاں ان کی تربیت کے لیے ایک خاص انتظام کی ضرورت ہے۔ غرضکہ ہر ملک میں اس چیز کو تسلیم کیا جا چکا ہے کہ معلّمی کی تربیت حاصل کرنے والوں کے لیے ضروری ہے کہ انہیں طالبعلمی کے زمانے اور بعد میں فنِ تربیت کے دوران میں، ان تمام مقاصد سے آگاہ کیا جائے اور ان کے حصول کے ذرائع سے بھی خبردار کر دیا جائے۔

حصۂ لوئر مڈل میں حساب کی تدریس

از

سید غضنفر علی نقوی بی۔اے سنٹرل ماڈل سکول لاہور

اس سے کسی کو انکار نہیں، کہ دنیا بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہی ہے یہی تبدیلی ہمارے خیالات۔ ہمارے اوضاع و اطوار اور ہماری روزمرّہ کی ضروریات میں بھی ایک بہت بڑے تغیّر کی ذمّے وار ہے۔ جو چیز آج ہمیں مرغوب ہے۔ کل وہی ہمارے ہاں معیوب تھی جن باتوں کو ہم دقیانوسی اور غیر مفید سمجھ کر چھوڑ بیٹھے تھے۔ آج کوئی نہ کوئی حیلہ تراش کر انھیں پھر اختیار کر رہے ہیں۔

اگر ہم کسی قوم کی تاریخ پر نظر ڈالیں۔ تو معلوم ہوگا، کہ جن اصول پر وہ دو چار صدیوں پہلے کاربند تھی۔ آج اُنہی اصول کا اُن کے دستور العمل میں نام و نشان بھی نہیں ملتا۔

غرض انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں یہ تغیّر ہو رہا ہے۔ اور اسی طرح ہوتا رہیگا۔ سلسلہ تعلیم و تدریس بھی اس سے مستثنےٰ نہیں ہے۔

ہم بہ حیثیتِ مدرّس جب اپنے طرزِ تعلیم پر نگاہ ڈالتے ہیں، تو ہمیں اس امر کا بہت جلد احساس ہو جاتا ہے، کہ ہمارا محکمہ طرزِ نو اور مفید تبدیلیوں کے جذب کرنے میں مقابلتہً زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔

دفتر کے ایک کلارک نے جب مجھے خوش طبعی کے طور پر کہا، کہ ٹیچر جُوں جُوں

بوڑھا ہوتا جاتا ہے۔ اُسی قدر اُس کا طریقۂ تعلیم نکما اور غیر مفید سمجھا جاتا ہے۔ اور سچ پوچھو، تو خود اُس کی ہستی دقیانوسی ڈھانچا خیال کی جاتی ہے۔ مگر ہم اپنی قدامت کے لحاظ سے دفتر میں تجربہ کار اور قابل اور خود دفتر کے وقار کا موجب ہُوا کرتے ہیں۔ میں نے اُنہیں جواب دیا، کہ تمھیں اپنے اور ہمارے کام کی نوعیت کے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔ تمھارا کام محض کاغذی کارروائی تک محدود ہے، جونہی کاغذات کا منشاء پورا ہوا تمہاری ذمے داری ختم ہوئی، تمہارے ہاں دفتری کارروائی جو آج ہے۔ تقریباً ایک صدی پہلے بھی وہی تھی۔ اور غالباً زمانہ مستقبل میں بھی وہی رہیگی۔ مگر ہمیں قدرت نے وہ ننھے ننھے نازک ورق عطا کیے ہیں، کہ شروع میں جو کچھ بھی اُن پر لکھ دیا جائیگا۔ وہی تحریر آئندہ زندگی میں نہ صرف اُن کی پیشانی کی تحریر بنیگی۔ بلکہ ملک کی قسمت بھی اسی تحریر کی رہینِ منت ہوگی۔ اور اگر یہی نازک غنچے غافل اور بے رحم مالی کی بے پروائی سے اپنی طبعی حالت پر پہنچ کر نہ کھلے، تو ہو نہیں سکتا، کہ اِس چمنستانِ حیات میں رہنے والوں کی کیاریاں کبھی سرسبز اور شاداب نظر آئیں۔

اِن ننھے ننھے افراد کی نگرانی کی ذمے داری قدرت کی طرف سے ہم پر عاید کی گئی ہے کیا اُن کی نگہداشت اور تربیت کا طریقہ تمہارے طریقوں سے مختلف نہیں ہونا چاہیے؟ ہم اپنے بچوں کو جس زمانے کے لیے تیار کر رہے ہیں۔ یقیناً وہ زمانہ ہمارے زمانے سے بدرجہا مختلف ہوگا جس کے لیے ہمارے اُستادوں نے ہمیں تیار کیا تھا۔ اگر امرِ واقعہ یہی ہے، تو کوئی بھی سلیم الفطرت انسان ہمارے طریقۂ تعلیم کی آئے دن کی تبدیلیوں پر جو ہمارے ننھے ننھے نونہالوں کی بہتری پر مشتمل ہوں معترض نہیں ہوسکتا۔ ہمارے طریقۂ تعلیم میں آئے دن کی تبدیلیاں ہمیں "پیر شو بیاموز" کا زبانِ حال سے سبق دے رہی ہیں، تاکہ

ہمارا علم، ہماری واقفیت، نئے نئے معلومات سے ہمیشہ تروتازہ رہے۔ اور پھر یہی تازگی ننھے ننھے غنچوں کی مستقل شگفتگی کا باعث ہو۔ تاریخ وجغرافیہ کے موجودہ طرزِ تعلیم کو آج سے تیس سال پہلے کے طرزِ تعلیم سے دُور کی بھی نسبت نہیں۔ اسی طرح ہر ایک مضمون کے طرزِ تعلیم میں ایک اہم تغیر رونما ہوچکا ہے۔ حساب کے مضمون میں بھی اِن تبدیلیوں کا ہونا ایک ناگزیر امر ہے۔

آج کی صحبت میں مجھے اسکولوں میں "ورنیکلر مڈل میں حساب کی تعلیم" کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے، اور میں اپنے مضمون کو چار حصوں میں تقسیم کرونگا۔

۱۔ حساب کی تعلیم کا مقصد کیا ہے ؟

۲۔ کیا ورنیکلر مڈل میں موجودہ طریقہ تعلیم اصلی مقصد کو پورا کررہا ہے ؟

۳۔ اگر جواب نفی میں ہے، تو موجودہ تعلیم میں کیا نقائص ہیں ؟

۴۔ اِن نقائص کا تدارک کیسے ہوسکتا ہے ؟

۱۔ حساب کی تعلیم کے مقاصد اگر تفصیل سے بیان کئے جائیں۔ تو کئی صفحے سیاہ کئے جاسکتے ہیں۔ مگر اسکولوں میں حساب کی تعلیم کا اصلی مقصد یہی ہے کہ اسکول کی چار دیواری کو خیرباد کہنے کے بعد بچے اِس قابل ہوجائیں، کہ وہ عملی زندگی میں اُن اُلجھنوں اور پیچیدگیوں پر قابو پاسکیں۔ جو اُنھیں روزانہ کاروبار میں پیش آئینگی۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ بھی کہ سکتے ہیں، کہ اسکولوں میں حساب کی تعلیم بچوں کی شہری زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے دی جاتی ہے۔

میں نے دانستہ اُن فوائد یا مقاصد کو چھوڑ دیا ہے۔ جو علم ریاضی کے ماہرین بیان کرتے ہیں یعنی حساب کی تعلیم سے قوائے عقلیہ، قوت استدلال وغیرہ وغیرہ میں ترقی

ہوتی ہے۔طلبہ میں استقلال پیدا ہوتا ہے۔ یہ تعلیم پوری توجہ سے کسی امر کی تہ تک پہنچنے کا عادی بناتی ہے۔خیالات میں یکسوئی پیدا کرتی ہے۔مشکلات پر قابو پانے کا عادی بناتی ہے۔یہ سب درست ہے لیکن ان تمام فوائد کا سلسلہ اسی بڑے فائدہ سے وابستہ ہے جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، یعنی حساب کی تعلیم کا اہم مقصد طلبا کی شہری زندگی کو کامیاب بنانا ہے۔

۲- کیا لوئر مڈل میں موجودہ طرزِ تعلیم مذکورہ بالا مقصد کو پورا کر رہا ہے؟

ہم اسکولوں میں تاریخ، جغرافیہ اور دیگر مضامین پڑھتے ہیں۔اسکول کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد جب ہم عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں۔تو اپنے خیالات کے اظہار کے لیے ہمیں زباندانی سے واسطہ پڑتا ہے مجلس احباب میں خوش طبعی کے طور پر جب کسی کے قول وفعل پر تنقید منظور ہوتی ہے۔تو اس میں بھی ہماری ہمہ دانی کا پول کما حقہ نہیں کھلتا۔مگر بدقسمتی سے جب کبھی خرید وفروخت میں دکانداروں سے سابقہ پڑتا ہے، تو خریدی ہوئی اشیا کی قیمت کا اندازہ لگانے میں اربعہ کی مدد کے علاوہ اور کوئی طریقہ ہماری بے بسی میں ہاتھ نہیں بٹاتا، دکانداروں کے سامنے جس خفت اور ندامت کا سامنا ہوتا ہے۔ غالباً اس کا تجربہ ہم میں سے بہتوں کو ہوا ہوگا۔

دکاندار کا آٹھ سالہ لڑکا جس نے زندگی کے ایک دو سال ہی کسی پرائیویٹ اسکول میں ایک ان ٹرینڈ ٹیچر کی نگرانی میں صرف کئے ہوں۔ وہ یقیناً علم حساب کی اس کاروباری شاخ میں ہمارے ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچر سے کہیں زیادہ ہوشیار اور تجربہ کار ہوگا۔ غلطی کا اعتراف فی الحقیقت ایک اخلاقی جرأت ہے۔ میرے ایک دوست نے مجھ سے ذکر کیا، میں ایک دفعہ بازار سے کپڑا خریدنے کے لئے گیا۔ دکاندار کے دس

بارہ سالہ لڑکے نے جھٹ پٹ ایک کاغذ پر تمام پارچات کا حساب لکھا، اور بل بنا کر میرے سامنے رکھ دیا۔ اب میں ہوں، کہ ہر ایک قسم کے پارچہ کا نرخ بل پر سے دیکھتا جاتا ہوں، اور بہتیرا اربعہ اور ہستہ لگاتا ہوں، مگر کسرات کی ناقابل حل اُلجھنوں کی وجہ سے کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ اس ننھے بزاز نے جو کام ایک دو منٹ میں ٹھیک ٹھاک کر کے میرے سامنے رکھ دیا۔ وہ مجھ ایسے ٹرینڈ گریجویٹ ٹیچر سے پورے آدھ گھنٹہ کی دردسری سے بھی منتِ پذیر تکمیل نہ ہُوا۔ نہ ہی بی ۔ اے کے اے کورس نے کچھ رہبری کی، اور نہ ہی بی کورس نے کچھ دستگیری کی کبھی دل ہی دل میں گورنمنٹ کالج کے ریاضی کے اساتذہ کو کوسا، اور کبھی ٹرینینگ کالج اور ہائی اسکولوں کے اساتذہ کی طرف ذہن منتقل ہُوا۔ آخر چار و ناچار محض اِس خیال سے کہ ہماری قابلیت کا بھانڈا چوراہے میں نہ پھوٹے، کہدیا، ہاں ٹھیک ہے۔ رقم دی اور سیدھا گھر پہنچا۔ جان بچی، لاکھوں پائے۔ گھر میں اطمینان سے کاغذ پنسل لے کر اربعہ کی مدد سے تمام اشیا کی قیمت کا جائزہ لیا۔ تو معلوم ہُوا، کہ حساب درست ہے۔ ہماری عملی زندگی کا اس سے بھیانک منظر اور کیا ہو سکتا ہے۔

یہ روزمرہ کے واقعات ہیں جن سے ہمیں دوچار ہو کر دکانداروں کے سامنے بغلیں جھانکنی پڑتی ہیں۔ آجکل کی حساب کی تعلیم کا عملی پہلو اگر یہی ہے۔ تو ہمیں لامحالہ اعتراف کرنا پڑیگا، کہ اسکولوں میں حساب کی تعلیم کا صحیح مفہوم بالکل نظرانداز کیا جا رہا ہے۔ جو تعلیم ہمیں کاروباری زندگی میں اس قابل بھی نہیں بناتی، کہ ہم روزانہ خرید و فروخت بھی اطمینان کے ساتھ کر سکیں، تو یقیناً ایسی تعلیم تعریف کے قابل نہیں ع

ایں رہ کہ مے روی بہ ترکستان است

جن نقائص کا خمیازہ ہمیں بڑا ہو کر بھگتنا پڑتا ہے۔ وہ شروع ہی سے ہمارے طریقِ

تعلیم اور نصابِ تعلیم میں پائے جاتے ہیں۔ لوئر مڈل میں جن باتوں سے ہمیں پرہیز لازم ہے بدقسمتی سے وہی باتیں ہمارے لئے زیادہ ضروری اور اہم سمجھی جاتی ہیں، اور یہ نقائص دو طرح کے ہیں:-

(۱) وہ نقص جو ہمارے نصابِ تعلیم کے متعلق ہیں۔

(۲) وہ نقائص جو طریقۂ تعلیم سے تعلق رکھتے ہیں۔

اِن دونوں قسم کے نقائص کا ذکر "موجودہ تعلیم میں نقائص اور اُن کے تدارک" کے تحت میں کیا جاتا ہے۔

"موجودہ تعلیم کے نقائص اور اُن کا تدارک"

اِس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں، کہ موجودہ تعلیم کے نقائص کی ذمے وار آجکل کی مروجہ درسی کتب ہیں۔ گو یہ کتابیں ٹیکسٹ بُک کمیٹی کی منظوری حاصل کیے ہوتے ہیں۔ مگر ان میں بھی اُن اُمور کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ جو طالب علم کی آئندہ زندگی کو کامیاب بنانے میں بہت حد تک مفید ہؤا کرتے ہیں۔

میں نے ان نقائص کا اندازہ لگانے کے لیئے کئی ایک درسی کتب کا نہایت غور و خوض سے مطالعہ کیا ہے۔ میرا خیال ہے، کہ وہ صاحب جنہیں حساب کی تعلیم سے کچھ نہ کچھ مناسبت ہے۔ درسی کتب کی خامیوں کو خصوصیت سے لوئر مڈل میں، بہ نظر استحسان نہیں دیکھینگے۔ بعض درسی کتب مقابلتہً بہت کم نقائص رکھتی ہیں۔ اور وہ حتی الامکان بچوں کی مشکلات کو مدِّنظر رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ مگر ایسی کتابیں بہت کم ہیں، افسوس تو اس امر کا ہے، کہ آجکل جو کتاب بھی لکھی جاتی ہے، وہ تجارتی

نکتہ نگاہ سے لکھی جاتی ہے۔ بچوں کی مشکلات اور اُن کی ذہنی تربیت کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا۔

پانچویں اور چھٹے درجے میں حساب کی تعلیم کے تحت میں سب سے پہلے ہماری یہ کوشش ہونی چاہئے، کہ سوالات ضرورت سے زیادہ مشکل نہ ہوں یعنی جو سوالات بھی اُن درجوں کے لیے وضع کئے جائیں۔ وُہ اُن کی عام لیاقت کے معیار سے بہت اونچے نہ ہوں۔ اور نہ ہی اُن میں ایسی پیچیدگیاں اور اُلجھنیں ہوں، کہ بچے اُن مشکلات سے گھبرا کر اُس مضمون کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں، بلکہ مشکلات اِس طرح سے ترتیب دی جائیں، کہ اُن مشکلات پر رفتہ رفتہ طلبہ کا قابو پانا سہل تر ہو۔ اور اسی طرح سے بتدریج دیگر مشکلات پر بھی قابو پایا جا سکے۔ یہی وقت ہے، جب ہم بچوں کے دلوں میں اپنے مناسب طریقۂ تعلیم اور معقول نصابِ تعلیم سے حساب کے مضمون کے ساتھ ایک خاص لگاؤ پیدا کر سکتے ہیں معقول نصابِ تعلیم کے ضمن میں ٹیکسٹ بک کمیٹی بہت حد تک ہماری ممد اور معاون ہو سکتی ہے۔ جب ہم بچوں کے دلوں میں حساب کے مضمون سے ایک خاص لگاؤ اور وابستگی پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں، تو ہماری کوشش اس امر پر مرتکز ہونی چاہیے، کہ بچوں میں ایسے نصابِ تعلیم کو جاری کیا جائے، جو اُن کی شہری زندگی کو کامیاب بنانے میں مدد دے۔ یہ مقصد ہر وقت ہمارے پیشِ نظر رہنا چاہیے، کہ کس طرح بچوں کی عملی زندگی مفید اور بہتر بنائی جا سکتی ہے۔

مشکل سوالات کے ضمن میں ممکن ہے، کہ بعض حضرات یہ اعتراض کریں، کہ اگر سوالات میں مشکلات پیدا نہ کی جائیں۔ تو بچے استقلال ایسی خوبی اور اُس سچی خوشی

سے جو مشکل سوالات کے حل کرنے کے بعد حاصل ہوتی ہے، محروم رہ جائینگے۔ مجھے سوالات میں بتدریج مشکلات پیدا کرنے میں کوئی اعتراض نہیں۔ مگر میں ایسی مشکلات کا قائل نہیں۔ جو بچوں کے دلوں میں لگاؤ اور وابستگی کے بجائے ایک قسم کی نفرت اور خفارت کے احساسات پیدا کر دیں۔

میں نے کئی ایک درسی کتب کے مطالعے کے بعد چند ایک نقائص معلوم کیے ہیں۔ اور ہر ایک کے تحت میں ایک یا دو مثالوں سے اُس نقص کی نوعیت کی توضیح کی ہے۔

۱۔ سوالات طلبہ کی معیارِ قابلیت سے بہت بالا ہیں۔ ایسے سوالات کے پیش کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ طلبہ کے دل و دماغ اس مضمون سے ہی گریز کرنے لگتے ہیں۔ ذیل کے سوالات میرے اس بیان کی بخوبی تصدیق کرینگے۔

(ا) پانچویں جماعت کی بعض درسی کتب میں اس قسم کے سوال مثلاً $\frac{۱۳۰۷۸}{۲۵۰۲۶}$ اور ایسی ہی اور مشکل کسور عام کو صورتِ اقل میں لانے کے سوالات درج ہیں۔ ایسے سوالات یقیناً بچوں کے نازک اور ننھے ننھے دماغوں کو پریشان کر دینے کا موجب ہوتے ہیں۔

(ب) $\frac{۱۲۶۶۲}{۳۱۱۶۸}$ اور $\frac{۱۳۶۴۲}{۳۴۴۶۴}$ میں کونسی کسر بڑی ہے اور کون سی چھوٹی۔ ہر ایک سلیم الطبع انسان ایسے سوالات کی الجھنوں اور ننھے ننھے دماغوں کی نزاکت کا صحیح طور پر مقابلہ کر سکتا ہے۔

اسی طرح تین یا چار مشکل کسرات کے کرسب سے بڑی اور سب سے چھوٹی کسر تلاش کرانے میں معلوم نہیں، کونسے ذہنی قوائے کی تربیت مقصود ہوتی ہے۔ مثلاً $\frac{۳۸۸}{۵۸۲}$، $\frac{۴۰۲}{۵۳۶}$، $\frac{۳۲۸}{۴۱۰}$ میں سب سے چھوٹی کسر پہلے لکھو۔ اور

سب سے بڑی بعد میں ۔

(ج) ایسی ہی چند ایک کسوروں میں سب سے بڑی کونسی ہے ، اور سب سے چھوٹی کونسی ، سب سے بڑی اور سب سے چھوٹی کسوروں کے حاصل جمع کو باقی ماندہ دونوں کسوروں کے فرق سے ضرب دو ۔ ایسا سوال خاص خاص قابلیت کے طالب العلم اگر پورے دو پیریڈ میں نکال لیں ، تو یقیناً یہ ان کی سخت جانی کی دلیل ہے ۔ ہماری درسی کتب میں ننھے ننھے دماغوں کے لیے اگر یہی روحانی غذا ہے ، تو معلوم نہیں ، اُن بے چاروں کی قوت ہاضمہ کا کیا حشر ہوگا ۔

(د) دو کسوروں کا حاصل ضرب ۵۵۲/۶۹۰ اور ۵۹۰/۷۰۸ کے فرق کے برابر ہے ۔ اور اُن کسوروں میں سے ایک کسور ۴۹۸/۶۶۴ اور ۴۷۴/۵۳۰ کی حاصل جمع کے برابر ہے دوسری کسور بتاؤ وغیرہ وغیرہ ۔

اس سوال کی مشکلات ملاحظہ ہوں ، کیا پانچویں اور چھٹی جماعت کے طلبہ سے اُمید کی جا سکتی ہے ، کہ ایسے سوالات کی مشکلات پر وہ قادر ہو سکینگے ۔

چھٹی جماعت کی بعض درسی کتب میں اکائی کے قاعدے کے ضمن میں بعض ایسے سوالات بھی دیکھنے میں آتے ہیں ، جو نسبت کے قاعدے سے تو حل ہو سکتے ہیں لیکن اکائی کے قاعدے سے حل نہیں ہو سکتے ایسے سوالات کے حل کرانے کی کوشش کرنا اکائی کے قاعدے میں بھی پختگی پیدا کرنے کے منافی ہے ۔ مثلاً اگر ۱ آدمی ایک کام کو ۱۲ گھنٹے روزانہ کام کر کے ۲۰ دن میں ختم کریں ، تو بتاؤ اسی کام کو ۱۵ گھنٹے روزانہ کام کر کے ۱۰ دن میں کتنے آدمی ختم کرینگے وغیرہ وغیرہ ۔ سوال مشکل نہیں ، مگر لوئر مڈل کے نصاب سے بالاتر ہے ، اوسط کے قاعدے کے تحت میں ذیل کے سوالات ملاحظہ فرمائیں ، اور خود ہی فیصلہ کریں ، کہ آیا چھٹی جماعت کے طلبہ سے

یہ امید کی جا سکتی ہے، کہ اُن کے ننھے ننھے دماغ ایسے پیچیدہ سوالات کے حل کرنے پر قادر ہو سکینگے؟

۱۔ ایک فوج میں کل سپاہی ۱۰۰۰۰ ہیں۔ اُن میں کچھ دیسی اور باقی گورے ہیں۔ دیسی سپاہیوں کے قد کی لمبائی اوسطاً ۵ فٹ ۱۱۔انچ ہے۔ گوروں کے قد کی لمبائی اوسطاً ۵ فٹ ۱۰ انچ ہے۔ گوروں کی تعداد بتاؤ۔ جبکہ کل فوج کی اوسطاً لمبائی ۵ فٹ ۱۰ ½ انچ ہو۔

۲۔ کرکٹ کے کھیل میں ایک کھلاڑی کچھ اننگز میں بحساب ۳۸ - ۳۳ فی اننگ کرتا ہے۔ اگر وہ ۲ اننگز میں ۱۷ دوڑیں اور کرتا۔ تو اُس کی اوسط فی اننگ ۳۳.۹۰ ہو جاتی۔ بتاؤ وہ کتنی اننگز کھیلا۔

ممکن ہے، بعض صاحبان یہ خیال کریں، کہ کسی قاعدے کی مشق میں کوئی نہ کوئی ایسا سوال ضرور ہونا چاہیے جس سے ہوشیار اور کمزور طلبہ میں تمیز ہو سکے۔ اس کے جواب میں صرف یہ عرض کرنا کافی ہوگا، کہ یہ دونوں سوالات چھٹی جماعت کو چھوڑ کر اگر اوپر کے درجوں کے طلبہ کو بھی دئے جائیں۔ تو اُن کی کثرت بھی اِن سوالوں کے حل کرنے پر قادر نہیں ہوگی۔ ایسے سوالات کے درسی کتاب میں درج کرنے کے صرف یہی معنی ہو سکتے ہیں، کہ بچوں کو پست حوصلہ بنا کر انہیں اُس مضمون سے متنفر کیا جائے۔ جس طرح حساب کی تعلیم میں بچے اپنی قابلیت کے معیار کے مطابق مشکلات پر حاوی ہو کر استقلال، یکسوئی اور دیگر خصائل حسنہ سے بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں۔ بعینہٖ اسی طرح ضرورت سے زیادہ مشکلات کو دیکھ کر اُن میں معمولی معمولی باتوں میں گھبراہٹ اور پست ہمتی اور دیگر ایسے ہی خصائل رذیلہ کے پیدا ہو جانے کا بھی ایک یقینی امر ہے۔

سود کے قاعدے میں بعض ایسے سوالات درسی کتب میں دیے گئے ہیں۔ جن کی چند در چند مشکلات پر بڑی جماعت کے طلبہ تو ممکن ہے، سوچ بچار سے قادر ہوسکیں۔ مگر چھٹی جماعت کے طلبہ سے ایسی توقع رکھنا محض واقعات کی تکذیب کرنا ہے۔ مثلاً کسی رقم کا خاص شرح سے ۶ ماہ میں ۱۸ روپیہ سود ہوتا ہے۔ اگر شرح سود فی سال ایک روپیہ زیادہ ہو۔ تو ۲۲ روپیہ سود ہوجاتا ہے۔ اصل زر و شرح سود بتاؤ۔

اس کے بعد یہ عرض کرنا بھی غیر ضروری نہیں ہے۔ کہ ہم ورنیکلر مڈل میں طلبہ کو وہ وہ باتیں رٹواتے ہیں۔ جو اُن کی آئندہ زندگی میں بالواسطہ یا بلاواسطہ شائد ہی کوئی مفید نتائج پیدا کرسکیں۔ اور جن سے طلبہ کو مدت العمر تک واسطہ نہیں پڑتا۔ کلومیٹر۔ کلوگرام۔ ڈولر۔ فرینک اور دیگر غیر ملکی پیمانوں کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں۔ مگر زمانے بھر کی تمام رطب و یابس کا چھٹی جماعت میں ہی ٹھونسنا یقیناً کوئی مستحسن بات نہیں۔

بڑی جماعتوں میں بھی اگر ان کا تعارف طلبہ کی واقفیت عامہ کے وسیع کرنے کی غرض سے ہو۔ تو بہت کافی ہے۔ جو وقت ان کے رٹواتے پر ضائع کیا جاتا ہے۔ وہ کیوں کاروباری سوالات کے ذریعے اپنے ملکی پیمانے مثلاً روپیہ، آنہ، پائی یا من، چھٹانک، سیر یا گز، گرہ وغیرہ کی مشق میں صرف نہیں کیا جاتا۔ مثلاً یہ سوال کہ اگر ۱۶ روپے برابر ہوں، ۵ ڈولر کے اور ۸ ڈولر برابر ہوں، ۳۸ فرینک کے تو ۴۸ روپیہ کتنے فرینک کے برابر ہونگے، نہیں معلوم چھٹی جماعت کے طلبہ کی کس قدر ذہنی ترقی کا ذمّے دار ہے۔ میری رائے میں چھٹی جماعت میں ایسے سوالات کو حل کرانے کی کوشش کرنا تضیع اوقات بھی ہے، اور طلبہ کے ذہنی قوائے پر ضرب کاری بھی، انگریزی پیمانوں کا

جاننا ہمارے لیے ضروری ہے۔ مگر چھوٹی جماعتوں میں دیسی پیمانوں کے استعمال پر ہی اکتفا کرنا چاہیے۔

اُن سوالات سے ہمیں قطعاً احتراز واجب ہے۔ جو محض کسی مشق کے تحت میں سوالات کی تعداد کو زیادہ کرنے کی غرض سے بے سوچے سمجھے درج کیے گئے ہوں۔ اور خلاف واقعہ ہونے کی وجہ سے بچوں کے دلوں میں مختلف اشیا کی قیمتوں کے متعلق غلط تصورات پیدا کرتے ہوں۔ اس میں کوئی کلام نہیں، کہ آج کل کی درسی کتب میں اس امر کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے۔ تاہم آج کل بھی بعض سوالات میں اس قسم کی خامیاں موجود ہیں۔ ایک زمانہ تھا، جب طلبہ کو حل کرنے کے لئے ایسے ایسے لغو سوالات دیے جاتے تھے۔ جو عادتاً اور فطرتاً ممکن الوقوع نہ تھے۔ مثلاً ایک شخص کے پاس ۳۵ ارب ۳۶ کروڑ وغیرہ وغیرہ روپے ہیں، اُس نے ایک نفر کو ۳۸ لاکھ روپے دیے۔ اور دوسرے کو اس سے دس گنا اور تیسرے کو اس سے پانچ گنا وغیرہ وغیرہ۔ بتاؤ اس کے پاس باقی کیا بچا؟

آج کل کی حساب کی کتب میں بھی اس قسم کے سوالات موجود ہیں، ان کی مثالیں حسب ذیل ہیں:۔

ا۔ اگر ۴ ر کا گھی ۱۴ چھٹانک آئے۔ تو ۱۲ سیر ۸ چھٹانک گھی کی کیا قیمت ہوگی؟

ب۔ ایک تولہ سونے کی قیمت ساڑھے چھ روپیہ ہو۔ تو ۲۰۰ تولہ ۱۰ ماشہ کی قیمت کیا ہوگی؟

۴ ر کا ۱۴ چھٹانک گھی آج کل تو محالات سے ہوگیا ہے۔ اور سونے کا بھاؤ اس زمانے میں تو ممکن نہیں، پتھر اور دھات کے زمانے میں ایسا ہوتا ہو تو عجب نہیں۔

سود کے سوالات کے ضمن میں ایک سوال کی عبارت ملاحظہ ہو:۔

۲۶۲ء۱۵ روپیہ کا سود کسی خاص شرح سے خاص مدت میں کیا ہوگا۔ظاہر ہے کہ کوئی شخص بقائمیٔ ہوش وحواس کسی ساہوکار سے یہ نہیں کہیگا، کہ مجھے ۱۵ ار۲۶۲ روپیہ اس قدر شرح اور اتنی مدت کے لئے قرضہ دو۔

چھٹی جماعت میں تجارت کے قاعدے کے سکھانے کی غرض بھی یہی ہوتی ہے، کہ بچوں کو اس قاعدے کی مدد سے براہ راست کاروباری زندگی میں مدد ملے مگر اس قاعدے کے تحت میں بھی ایسے سوالات ہوتے ہیں جن میں کسرات کی بھرمار ہوتی ہے۔جواب میں بھی کسرات آتی ہیں۔طلبہ کو باوجود صحیح سوال نکال لینے کے جواب کی صحت کا یقین نہیں ہوتا۔ شروع ہی سے تجارت کے سوالات کو اکثر مجرّد اعداد میں پیش کیا جاتا ہے۔مثلاً ایک چیز کی قیمت ۹ پائی ۴ آنے ۳ روپے ہے۔تو ایسی ہی ۳۴ چیزوں کی قیمت معلوم کرو۔ اگر ایسے سوالات کو محسوس مثالوں سے پیش کیا جائے۔تو یہ امر نہ صرف طلبہ کی دلچسپی کا موجب ہوگا۔بلکہ بڑی حد تک اُن کے طریق معاشرت میں بھی مدد دیگا۔مثلاً میں نے ایک صندوقچی بازار سے تین روپے چار آنے ۹ پائی کو خریدی۔تو ایسی ۳۴ صندوقچیوں کی قیمت کیا ہوگی۔ایسے سوالات آجکل کی مجوزہ درسی کتب میں کافی تعداد میں ہیں۔ جنہیں واقعات کا رنگ دیا گیا ہو۔مگر پھر بھی بعض ایسی منظور شدہ کتابیں ہیں۔ جن میں اس امر کو نظرانداز کر دیا گیا ہے۔اس کے علاوہ اور نقائص مثلاً درسی کتب میں سوالات کی ترتیب میں طلبہ کے ذہنی قوائے سے غفلت یعنی مشکل سوالات کا پہلے اور آسان کا بعد میں رکھنا۔قاعدہ کے شروع میں زبانی سوالات کا کم ہونا۔ یا بعض حالتوں میں زبانی سوالات کا کافی مشکل ہونا وغیرہ وغیرہ کا ازالہ بھی ضروری ہے۔ زبانی سوالات کے تحت میں یہ عرض کرنا غالباً غیر ضروری نہ ہوگا، کہ اصلی قاعدہ

سکھانے سے پہلے اُسی قسم کے زبانی سوالات کا حل کرانا بچوں کو اصلی قاعدے کے سمجھنے میں کافی مدد دیتا ہے۔ نہیں معلوم کہ محکمے کے امتحانوں میں زبانی سوالات کی اہمیت کو کیوں نظر انداز کیا گیا ہے۔ وقت آنے والا ہے، کہ محکمہ تعلیم مستقبل قریب میں ہی حساب کے مضمون میں ان سوالات کی ضرورت پر پھر غور کریگا۔

اِس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے اس امر کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے، کہ ان چند سطور سے قابل مولفین کی کوششوں پر صرف نکتہ چینی مقصود نہیں ہے۔ بلکہ جو کچھ بھی عرض کیا گیا ہے۔ نہایت نیک نیتی سے بچّوں کی مشکلات کو مدنظر رکھ کر عرض کیا گیا ہے۔ اغلب اُمید ہے، کہ یہ امر نہ صرف اُن کی خوشنودیٔ مزاج کا باعث ہوگا بلکہ درسی کتب میں آئندہ طباعت کے موقع پر ترمیم و تنسیخ یقیناً طلبہ کی آئندہ بہتری پر مشتمل ہوگی +

مدرسوں میں فنون لطیفہ کی تعلیم

از
میرزا سجاد حسین، آرٹ ماسٹر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

(نصاب)

اگر سب مدرس پیدائشی مصور ہوں۔ اور اُن میں ایک ہی قسم کا جمالیاتی مذاق ہو۔ اور اُن کا تعلیمی نقطہ نظر بھی ایک ہو۔ اور ایک ہی سی اُن کی تعلیم ہو اور جہاں کام کریں، وہاں بھی موقع ومحل کے لحاظ سے ایک حالت ہو۔ نیز طلبہ بھی ایسے ہی ہوں، جیسے کہ اُن کے اُستاد۔ صرف اس صورت میں ایک عام نصاب خصوصیت کے ساتھ مُضر نہ ہوگا۔ یہ پورا کا پورا مسئلہ تو کھلے طور پر متناقضانہ ہے (یعنے ایسا مسئلہ کہ جس کا ظاہر بُرا اور باطن اچھا)۔ ہندوستان میں جہاں صرف چند ہی ماہر خصوصی ملینگے۔ اور وہ لوگ جن کے ذمّے آرٹ کی تدریس ہے سب کے سب ایسے ہیں۔ جو مقررہ قاعدوں پر آنکھیں بند کرکے عمل کرنے والے ہیں۔ اگر ان کے لئے ایسا نصاب مرتب کردیا جائے، جس میں وسعت کی گنجائش نہ ہو، تو نتیجہ بد سے بدتر ہوگا۔ نیز اگر ہم فن کے مخصوص ماہر ڈرائینگ ماسٹر بھی پیدا کریں۔ اور بہترین نصاب ترتیب دیں، تو یہ نصاب اس واسطے نہیں ہوگا۔ کہ اُستاد اس کے مقررہ قاعدوں پر چلیں۔ بلکہ یہ تو محض ایک اندازہ قائم کرنے کے لئے ہوگا۔ اور موقع اور محل کے لحاظ سے اس میں تبدیلی کی بھی ضرورت ہوگی، علاوہ اِس کے اگر ایک ہی طرز کا نصاب تیار کیا جائے، اور سختی کے ساتھ اُس کی پیروی

کی جائے، اور قابل سے قابل آرٹ ماسٹروں کی زیر نگرانی بچوں سے اسکولوں میں کام لیا جائے۔ اس صورت میں بھی دقت درپیش آئیگی۔ کیونکہ ان قابل ماسٹروں میں سے ہر ایک کے خیالات اور رجحانات مختلف ہونگے۔ اور ان میں ہر ایک آرٹ کی الگ الگ شاخ سے دلچسپی رکھتا ہوگا۔ کوئی انسانی تصاویر کا دلدادہ ہوگا، اور کوئی قدرتی مناظر کا، بعض صنعت وحرفت سے دلچسپی رکھتے ہونگے۔ غرض کہ ان استادوں کے اسباق میں بھی ان کے ذاتی رجحانات اور خیالات کی نمایاں جھلک ہوگی۔ جہاں اس کے خلاف ہو سمجھ لیجیے، کہ وہاں محض قاعدوں کی خانہ پُری کی جارہی ہے، اس سلسلے میں اس امر کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، کہ استاد اپنی دلچسپی کی چیزوں میں اتنا منہمک نہ ہو جائے، کہ اصل معاملہ سے پہلوتہی کرنا شروع کر دے، یہ مانا کہ فن کی جس شاخ کی طرف اس کی طبیعت کا لگاؤ ہوگا۔ اُسی کا مظاہرہ وہ شدومد سے کریگا۔ مگر اُس کو چاہیے کہ اصل مقصد کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ اور جہاں تک معاملات کا تعلق طلبہ سے ہو۔ اُن سب سے حتی الامکان مناسب دلچسپی لے۔ اور نصاب کے مختلف پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے لڑکوں کو کام کا موقع دے۔ تاکہ ہر ایک طالب علم اپنی اپنی طبیعت کے موافق فن کی تکمیل کرے۔ اِسی پر اُس کی کامیابی کا انحصار ہے۔

لڑکوں اور لڑکیوں کے طبائع ڈرائینگ کی تعلیم کے سلسلے میں مختلف ہوتے ہیں۔ ایک تجویز جو لڑکوں کے لئے مناسب ہوگی۔ لڑکیوں کے لئے قطعی غیر موزوں ہوگی تحقیقات سے ثابت ہوا ہے، کہ لڑکوں کے کام میں چلبلاپن ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف لڑکیوں کی کوششیں، سادگی کا پہلو لئے ہوتی ہیں۔ لڑکے منظر پر مجموعی حیثیت سے زور دیتے ہیں، لڑکیاں علیحدہ علیحدہ خط و خال پر، لڑکے وضع قطع اور ساخت پر بہتر

قابو پانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ لڑکیاں رنگوں کے بارے میں مذاق سلیم رکھتی ہیں لڑکیاں بہ نسبت لڑکوں کے زیادہ عرصے تک ترقی کی ابتدائی منازل ہی میں رہتی ہیں مگر وہ لڑکوں کی طرح کام سے جلدی نہیں اُکتا جاتیں۔

مختلف مقامات میں کامیابی اور ترقی بھی مختلف ہوگی۔ دیہاتی بچے شہری بچوں کی نسبت کم تیز ہوتے ہیں۔ شہر کے بچوں میں بھی مقامی، خاندانی، افلاس یا دولتمندی اور والدین کے مختلف پیشوں کے اعتبار سے فرق ہوگا۔ اِن کے علاوہ اور مختلف وجوہ ہوسکتے ہیں جن کا بہت کم لحاظ کیا جاتا ہے۔ یہ فرق ابتدائی منازل میں تقریباً سات یا آٹھ سال کی عمر تک مقابلتًہ کم ہوتا ہے لیکن بعد کی ہر منزل کے بعد یہ فرق زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے مقامی تجارت اور صنعت وحرفت کا بھی بچوں کے رجحانات اور خیالات پر کافی اثر پڑتا ہے۔ فرض کیجیے کہ کسی مقام پر برتن سازی یا پارچہ بافی کے کارخانے ہیں۔ وہاں کے لوگوں پر ان کے بچوں کے خیالات پر ان کا قدرتی اثر ہوگا۔ اس کے برخلاف دیہاتوں میں جہاں اس قسم کے صنعت وحرفت کے کارخانے نہیں ہوتے۔ بلکہ یہاں زراعت کے سلسلے میں جو کام ہوتے ہیں۔ مثلاً ہل چلانا اور فصل کاٹنا وغیرہ اور دیگر امور جو اس ضمن میں درپیش آتے ہیں۔ یہ سب دیہاتی بچوں کے لیے قدرتاً دلچسپی کا موجب ہوں گے۔ سخت غلطی ہوگی، اگر کوئی چاہے کہ وہ اِن بچوں سے مشین کے پرزوں کی بناوٹ، یا وضع قطع بنوائے، ان کے لیے تو دیہاتی مناظر ہی دلکش ہونگے۔ اسی طرح شہر کے بچے دیہاتی مشاغل سے اُتنی دلچسپی نہیں لے سکتے جتنی کہ شہری مشاغل سے، شہر اور دیہات کے نصاب کے لیے مندرجہ بالا اشاروں سے سمجھدار اُستاد حسب دلخواہ نتیجہ نکال سکتا ہے۔ اب

قصبوں کو لیجئے۔ عموماً قصبوں میں نہ تو کارخانے ہوتے ہیں، اور نہ دیہاتوں کی طرح زراعتی سرگرمیاں۔ مثل مشہور ہے "جو بندہ یابندہ" اگر آپ یہاں آئیں گے تو یہاں بھی آپ کو بچّوں کی دلچسپی کے کچھ نہ کچھ اسباب ضرور مل جائینگے۔ یہ مانا کہ یہاں کی عمارتیں اتنی شاندار نہیں ہونگی جتنی شہر کی۔ یہاں نہ تو پارک ہونگے اور نہ تفریح گاہیں۔ اب نصاب تیار ہو تو کس طرح؟ سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ بچّوں نے جس ماحول میں تربیت پائی ہو اسی ماحول کو اپنی توجہ کا مرکز بنائیے (۱) بچے خود (۲) مکانات جن میں یہ بچے رہتے ہیں (۳) دوکانیں وغیرہ۔ یہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ صرف انھیں کو مدنظر رکھ کر بہترین نصاب تیار کیا جا سکتا ہے۔ آیئے ذرا ان پر گہری نظر ڈالیں۔ پھلوں کی دوکانوں کو لیجیے ان دوکانوں میں دائرہ نما شکلوں کے پھل مثل نارنگی سیب وغیرہ سے لیکر گاجر بیگن۔ مولی شلجم۔ چقندر مخروطی شکلوں کی ترکاریاں بھی موجود ہونگی۔ چیڑھ کے چوکھونٹے اور گول صندوق بھی جنمیں یہ پھل رکھے ہوتے ہیں دوکانوں میں ہونگے۔ رنگوں کا جہاں تک دارومدار ہے سب ہی قسم کے ہلکے رنگوں سے لیکر گہرے شوخ رنگ بھی ان میں موجود۔ اب رہ کیا گیا؟ یہ سب چیزیں ملکر دوکان میں ایک عجیب قسم کی دلچسپ گوناگوں کیفیت پیدا کرتی ہیں۔ ان میں انسانوں کا اضافہ تصویر کو دلچسپ بنا دیتا ہے۔ خصوصاً رات کو ان دوکانوں میں روشنی سے ایک عجیب و غریب پُر کیف سماں پیدا ہوتا ہے۔

کسی درجے کے بچّوں سے اس قسم کی دوکان کے بارے میں سوالات تو کرنا شروع کیجیے۔ ان سے پوچھیے کہ وہ اس کی بابت کیا کیا باتیں جانتے ہیں ٹھیک وقت پر جبکہ بچے ان خیالات میں مستغرق ہوں ان سے عملی طریقہ

سے ان خیالات کا اظہار شروع کرا دیجئے بیشتر بچوں کے لئے یہ کارروائی وقت طلب ہوگی۔ مگر آپ نے ان میں اس منظر کو حقیقی اور بہترین طور پر ظاہر کرنے کی خواہش پیدا کر دی ہے آناً فاناً دوکان اور چیزیں جو اس سے وابستہ ہیں ایک نیا نقشہ اختیار کرتی ہیں۔ یہ مناسب بناوٹوں اور رنگوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ یہ ایک تصویر ہے محض کھانے کی چیزوں کا ذخیرہ نہیں ہے۔ یہ ان اشکال سے پُر ہے جن کو ایک خاص دلچسپ مقصد کے لئے ذہن نشین کیا گیا ہے۔

مدرس کا ان معاملات میں حقیقی معنوں میں دلچسپی لینا شرط ہے وہ ذہین بچوں سے اسے اندازہ کرنا چاہیے کہ مندرجہ بالا کام بچوں کے لئے وقت طلب نہیں ہے۔ درصورت اس کے وہ اس سے سہل طریقہ اختیار کر سکتا ہے۔ ایک یا دو پھلوں کے مجموعے سے کام شروع کرا سکتا ہے۔ شروع میں بچے امرود۔ سیب۔ کیلا اور اسی قسم کے دیگر پھلوں کی بناوٹ۔ وضع قطع سے واقفیت حاصل کریں۔ بہتر یہ ہوگا کہ محض حافظے سے ان کو بتائیں۔ بعد اس کے اصل چیز سے مقابلہ کر کے غلطیوں کو صحیح کریں۔ آخر میں چیزوں کو مجموعی حیثیت سے ذہن نشین کریں۔ دوکانوں یا مکانوں کی بناوٹ ذہن نشین کریں بلکہ ضرورت ہو تو ان کے خاکے تیار کریں۔ ذہین بچے دوکانوں اور مکانوں کے علاوہ دوکاندار اور خریدار کی تصاویر بھی ان خاکوں میں شامل کر سکتے ہیں۔ وہ بچے جن کو اس کام میں دقت محسوس ہو صرف پھلوں کی اور صندوقوں کی تصویریں کھینچنے کی مشق کر سکتے ہیں۔ ہوشیار بچے جن کو انسانی تصویر سے دلچسپی ہو وہ اس ضمن میں کام کا

سلسلہ جاری رکھ سکتے ہیں۔ اکثر بچے تصویر کھچوانے کے لئے کسی خاص انداز میں بیٹھنے کے شائق ہوتے ہیں۔ انہیں میں سے کسی کو درجے کے لڑکوں کے سامنے بٹھایئے جب طلبہ (تقریباً ایک منٹ میں) اس لڑکے کے بیٹھنے کا طرز ذہن نشین کرلیں تو ان سے کہئے کہ پانچ منٹ میں محض حافظے سے اس کی تصویر بنائیں اسی طریقے سے تین چار مرتبہ عمل کریں۔ اسی طرح اور مختلف طریقے استاد اختیار کرسکتا ہے۔ جن کی تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ جب بچوں کی دلچسپی کا سامان مہیا ہو جائے وہ خود درخواست کرینگے کہ فلاں چیز کی طرف ان کی طبیعت راغب ہے۔ جب یہ سبق ختم ہونے کے قریب ہو جائے تو بچوں میں سے تقریباً ۱/۳ کی خواہش یہ ہوگی کہ وہ بڑے پیمانے پر اسی کام کے سلسلے کو جاری رکھیں اگر بچوں کی حسب دلخواہ نگرانی کی گئی تو بہت سے بچے بجائے اس کے کہ شرارت کریں گلی اور کوچوں میں اسی قسم کے کام کی تلاش میں مصروف ہوں گے۔ اس موقع پر اعتراض کا احتمال ہو سکتا ہے کہ چھوٹے بچے انسانی تصاویر کس طرح مکمل طور سے بنا سکتے ہیں۔ میں نے شروع میں بھی جا بجا گذارش کی ہے اور اب بھی عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ چھوٹے بچے جب کام کرنا شروع کرتے ہیں تو سب سے پہلے وہ انسانی تصویر ہی بناتے ہیں وہ نقل نہیں کرتے اور نہ تناسب کا لحاظ کرتے ہیں۔ یہ تو ان کے قدرتی جذبات کا ابال ہوتا ہے جن کا اظہار وہ انفرادی انداز میں کرتے ہیں۔
اگر بڑوں نے ان کی تخلیقی قوت کو دبا نہیں دیا تو وہ کام میں اپنی اصلی شخصیت کا اظہار کرینگے۔ اور یہ اظہار بہت سچا اظہار ہوگا۔ کیونکہ یہ

ان کے خیالات کی اصلی تصویر ہوگی جو بسا اوقات خواہشات اور امید وبیم پر مبنی ہوگی۔ بچے کی نقاشی ایک عجیب وغریب قیمتی دستاویز ہے۔ ہمیں ہرگز کوئی حق حاصل نہیں کہ ہم ان کے کام کو اپنے نقطہ نظر سے جانچیں۔ اور بقول ایک ماہر فن کے اپنی دھندلی روشنی والی آنکھوں سے اُس کے کام کو نکتہ چینی کرنے یا زیادہ سے زیادہ صحیح کرنے کی غرض سے دیکھیں۔ یہی تو وقت ہے جبکہ بچوں کو اپنی ذاتی کوششوں پر اعتماد کرنے کا سبق دیا جاسکتا ہے۔ اگر اس سن میں بچوں کو اپنی قوتوں کا اندازہ نہ ہوا تو آئندہ زندگی میں اُن کی قوت ارادی اس قدر کمزور ہو جائیگی کہ جو کام وہ سہولیت کے ساتھ کرسکتے ہیں اس کے اختیار کرنے میں بھی ان کو پس وپیش ہوگا اور وہ ہمیشہ دوسروں کے دست نگر رہینگے۔

چین کی جمہوری حکومت کے دور میں ثانوی تعلیم

از

احباب اللہ ایم ۔ ایس ۔ سی ۔ بی ۔ ٹی علیگ مسلم یونیورسٹی

گذشتہ سے پیوستہ

سال ۱۹۱۲ء سے جبکہ یہاں جمہوری حکومت قائم ہوئی ملک میں ثانوی تعلیم نے بتدریج ترقی کی ہے ۔ مڈل اسکولوں کی تعداد ۱۹۱۳ء میں [illegible] تھی جو بڑھ کر ۳۳ء میں ۱۹۰ تک پہنچ گئی ۔ نارمل اسکولوں کی تعداد ۱۹۱۲ء میں ۲۵۳ تھی جو ۱۹۳۳ء میں ۸۹۳ ہوگئی ۔ صنعتی اسکولوں کی تعداد اسی عرصہ میں ۶۹ سے ۳۱۲ تک بڑھ گئی ۔ ثانوی مدارس کی تعداد بھی اسی زمانہ میں ۸۳۲ سے بڑھتے بڑھتے ۳۱۲۵ تک پہنچ گئی یعنی ۲۲ سال کے عرصے میں ۴۰۰ فیصدی کی زیادتی ہوئی ۔

تعلیم میں اس ترقی کے ساتھ ساتھ یہ مشکل درپیش ہوئی ۔ کہ ملک بھر میں جغرافیائی لحاظ سے ثانوی اسکولوں کی تقسیم غیر مساویانہ تھی ۔ کیونکہ ۱۹۳۲ء کے ثانوی مدارس کی کل تعداد میں سے کوانگ تنگ میں ۳۴۶ ، سیزچوان میں ۲۴۴ ، لیاؤننگ میں ۱۳۰ ، کیانگسو میں ۱۲۰ اور ہونان میں ۱۱۸ مدارس تھے ۔ بلدیہ جات میں سے شنگھائی میں ۱۰۰ ، اپی پنگ میں ۱۷ ثانوی مدارس تھے ۔ نو صوبوں میں ان مدارس کی تعداد ۵۰ اور ۱۰۰ کے درمیان تھی ۔ اور تیرہ صوبوں میں سے ہر ایک میں ان کی تعداد پچاس سے بھی کم تھی ۔ مثلاً کیانگسو میں ۴۲ ، ہونان میں ۴۷ ، کوئی چیو میں ۲۸ ، شنسی میں ۲۳ ، کانسو میں ۱۳ ، شنگھائی

میں ۳، جیہول میں ۵، چہار میں ۴، سیٹویاں میں ۳، ننگھسیا میں ۲، کیرین میں ۹، ہیلنگنگ میں ۱۰ اور سیانگنگ میں صرف ایک اس لیے قومی حکومت تمام ملک میں صوبوں کی ضروریات کے مطابق بہت سے نئے اسکول کھولنے کی بہت کوشش کر رہی ہے۔

روپیہ کی کمی کی وجہ سے حکومت نارمل اسکولوں کی تعداد نہیں بڑھا سکتی۔ ۱۹۳۳ء میں کل ۸۹۳ نارمل اسکول تھے، جن میں سے ۱۶۶ ہوپئی میں، ۱۰۹ ایاؤننگ میں ۱۰۵ ہونان میں، ۸۱ سیٹنگ میں اور ۷۱ سرچوان میں تھے۔ باقی ہر ایک صوبے میں ان کی تعداد پچاس سے کم تھی۔ بلدیہ جات میں سے شنگھائی میں ۷ اور پی پنگ میں ۳ نارمل اسکول تھے چونکہ ابتدائی تعلیم اس قدر تیزی سے پھیل رہی ہے، اس لیے ابتدائی مدارس میں بہتر قسم کے مدرسوں کی زیادہ سے زیادہ ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ چنانچہ تمام ملک میں عام طور پر اور دور دراز اور سرحدی صوبوں میں خاص طور پر اور نارمل اسکول کھولنے کی جد و جہد ہو رہی ہے۔

سال ۱۹۳۳ء میں کل ۳۱۲ صنعتی اسکول تھے۔ جن میں سے ۲۷ کیانگسو میں، ۲۲ چی کیانگ میں ۴۲ ہُپتان میں، ۳۰ کوانٹنگ میں ۲۸ ہونان میں ۲۰ اوپی میں اور ۳۵ لیاؤننگ میں تھے۔ باقی صوبوں میں سے ہر ایک میں ان کی تعداد ۲۰ سے کم تھی۔ اب جبکہ حیاتِ ملّی کی نئے سرے سے تشکیل کی جا رہی ہے، صنعتی اسکولوں کی ضرورت کو بھی پورے طور سے محسوس کیا جا رہا ہے۔ اور جمہوری حکومت اس کوشش میں ہے کہ تمام ملک میں صنعتی اسکولوں کو یکساں طور پر ترقی دی جائے۔

ثانوی مدارس پبلک کے بھی ہوتے ہیں۔ اور نج کے بھی مقدم الذکر میں وہ مدارس شامل ہیں، جو حکومت کے قائم کردہ ہیں۔ اور مؤخر الذکر

میں وہ اسکول شامل ہیں، جو افراد یا جماعتوں کے قائم کردہ ہیں، پبلک ثانوی اسکول قومی، صوبائی، اضلاعی یا بلدیاتی ہوتے ہیں۔ اور یہ اکثر اوقات ان اداروں کے نام سے معروف ہوتے ہیں جن کی آمدنی سے وہ چلائے جاتے ہیں نجی کے مدارس میں وہ مدارس بھی شامل ہیں، جو غیر ملکی مشنریوں نے قائم کر رکھے ہیں، مگر نارمل اسکول نجی کے طور پر نہیں کھولے جا سکتے، یہ صرف حکومت کے ہی قائم کردہ ہوتے ہیں۔ ان کے تمام مصارف بھی حکومت ہی برداشت کرتی ہے۔ نجی کے طور پر کسی شخص یا جماعت کو یہ حق حاصل نہیں ہے، کہ وہ اس معاملے میں دخل اندازی کرے۔

سال ۳۳ء کے کل ۳۱۲۵ ثانوی اسکولوں میں سے ۷ا قومی ۵۶۳ صوبائی، ۱۵۱۵ بلدیاتی اور ۱۰۳۰ پرائیویٹ تھے۔ اور کل تعداد میں ۲۵۸۱ مدارس لڑکوں کے لیے اور ۵۴۲ مدارس لڑکیوں کے لیے تھے۔

پبلک ثانوی مدارس کو روپیہ قومی یا صوبائی یا اضلاعی یا بلدیاتی خزانوں سے ملتا ہے پرائیویٹ مدارس کے مصارف کا بیشتر حصہ عام اوقاف یا طلبہ کی فیس سے حاصل ہوتا ہے۔ ثانوی مدارس کے اخراجات جو ۱۲ء میں ۳۲،۹۹،۶۷۲ ڈالر[1] تھے، بڑھ کر ۳۳ء میں ۳،۹۵،۷۵،۵۴۶ ڈالر ہو گئے۔ اور صنعتی اسکولوں کے اخراجات ۱۰،۲۴،۹۰۳ ڈالر سے بڑھ کر ۶۳،۶۱،۹۶۲ ڈالر ہو گئے۔ یعنی سال ۳۳ء سے کل مصارف جو ۸۳۸،۴۴،۶۶،۵ ڈالر تھے ۲۲ سال کے عرصے میں ۸۰۰ فیصدی کے اضافہ کو ظاہر کرتے ہیں۔

۳۳ء کے ثانوی مدارس کے مصارف میں سے ۳،۵۶،۲۶،۱۴۹ ڈالر تو پبلک مدارس پر اور ۱۵،۱۸،۶۸۱ ڈالر نجی کے مدارس پر صرف ہوئے اس

[1] (اس کی قیمت آج کل تقریباً ۳ روپیہ ہے) چینی سکہ جسے ینی کہتے ہیں

سے ظاہر ہے کہ مالی لحاظ سے پبلک مدارس کی حالت نج کے مدارس کی حالت سے بہتر تھی لیکن مختلف صوبوں اور بلدیہ جات کے ثانوی تعلیم کے اخراجات میں بہت فرق تھا۔ ۱۹۳۳ء کے کل مصارف میں سے کوانٹنگ تنگ میں سب سے زیادہ خرچ ہوا۔ یہ ۸،۴۴،۷۳،۵۶ ڈالر تھا۔ کیانگسو دوسرے درجے پر تھا جس میں ۴۱،۹۲،۲۵۶ ڈالر صرف ہوئے۔ اسی طرح سزچوان میں ۵،۱۶،۷۶۳ ڈالر اور ہوپئی میں ۳،۶۳،۵۴۵ ڈالر صرف ہوئے۔ سات صوبوں میں ۳۰،۰۰،۰۰۰ ڈالر سے کم چھ صوبوں میں ۲۰،۰۰،۰۰۰ ڈالر سے کم اور باقی ۱۰ صوبوں میں سے ہر ایک میں ۱۰،۰۰،۰۰۰ ڈالر سے کم صرف ہوئے بلدیہ جات میں سے شنگھائی میں ۴،۶۶،۲۷۲ ڈالر پی پنگ میں ۲۴،۰۳،۶۱۵ ڈالر اور باقی چار میں سے ہر ایک میں ۱۰،۰۰،۰۰۰ ڈالر سے کم خرچ ہوئے۔ نارمل اور صنعتی اسکولوں کو وسعت اور ترقی دینے کے لیے ۱۹۳۲ء میں ایک قانون جاری کیا گیا جس کے موافق ہر ایک صوبہ اور بلدیہ کو اپنے ثانوی تعلیم کے بجٹ میں سے ۴۰ فیصدی مڈل اسکولوں کے لیے ۲۵ فیصدی نارمل اسکولوں کے لیے اور ۳۵ فیصدی صنعتی اسکولوں کے مصارف کے لیے مقرر کرنا لازمی قرار دیا گیا، اُمید کی جاتی ہے کہ اس معیار پر ۱۹۳۷ء کے آخر تک سب جگہ عمل شروع ہو جائیگا۔ اور اسی قانون کے رو سے یہ بھی تصریح کی گئی ہے کہ ثانوی تعلیم کے میزانیہ میں جس قدر اضافہ کیا جائے وہ سب سے پہلے نارمل اور صنعتی اسکولوں پر صرف کرنا ہوگا۔

مڈل اسکولوں میں ۱۹۱۲ء میں ۵۹،۹۷۱ اور ۱۹۳۲ء میں ۴،۱۵،۹۴۰ طلبہ تھے، نارمل اسکولوں میں بالترتیب ۲۸،۵۲۵ اور ۱،۰۰،۴۸۰ طلبہ تھے، اور صنعتی اسکولوں میں ۹،۷۶۴ اور ۳۳،۰۲۴ طلبہ تھے۔ اگر مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو ثانوی اسکولوں

میں طلبہ کی تعداد ۱۹۱۲ء اور ۱۹۳۳ء میں بالترتیب ۵۷،۹۶۵ اور ۵۹،۳۲۰ تھی یعنی ۲۲ سال کے عرصہ میں ۵۰۰ فیصدی کا اضافہ ہوا۔

سال ۱۹۳۳ء میں ثانوی مدارس میں ۹۳۲۰۰ طلبہ کی کل تعداد میں سے ۱۵،۹۴۸ یا ۳۷.۷۴ فیصدی) مڈل اسکولوں میں ۰۰،۸۴۰ یا ۸۶.۱۲ فیصدی) نارمل اسکولوں میں ۱۳۰ ۵۴۲ یا ۰.۶۰ فیصدی) صنعتی اسکولوں میں تھے۔ اور ۱۹۳۳ء کی کل تعداد میں سے ۴۷،۵۲،۲۷۴ تو لڑکے اور ۴۶،۰۰۷ لڑکیاں تھیں، اگرچہ یہ اعداد بتلاتے ہیں، کہ لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے تعلیم کے یکساں مواقع نہیں بہم پہنچائے گئے تاہم لڑکیوں کی تعداد لڑکوں کی نسبت زیادہ سرعت سے بڑھی، مثلاً ۱۹۳۱ء میں طلبہ کی تعداد ۳۲۲،۲۲۴ اور طالبات کی تعداد ۳۸۶، ۹۰ تھی اور ۱۹۳۲ء میں ان کی تعداد بالترتیب ۳۶،۸۴۳ اور ۹۸۵، ۹۹ تھی جو ۱۹۳۳ء میں بالترتیب ۳۰۹، ۴۲،۴ اور ۹۰۳، ۱۰۳ ہو گئی اور اُمید کی جاتی ہے۔ کہ مستقبل قریب میں ہی طلبہ و طالبات کی تعداد برابر ہو جائے گی۔

سال ۱۹۳۳ء میں ثانوی مدارس کے پاس شدہ افراد کی تعداد ۵۸،۰۲ تھی جن میں سے ۸۴،۰۳۱ لڑکے اور ۵۵،۸ لڑکیاں تھیں۔ اگر ان درسگاہوں کا تجزیہ کیا جائے جہاں ان طلبہ نے تعلیم حاصل کی تھی تو معلوم ہو گا کہ ۶۸،۰۲۸ مڈل اسکولوں کے ۲۹،۷۲۵ نارمل اسکولوں کے اور ۸۲،۴ ۸ صنعتی اسکولوں کے فارغ التحصیل تھے۔ اور ۵۸،۰۱ کی کل تعداد میں سے ۲۱۵، ۱ پبلک ثانوی مدارس کے اور ۳۶۶، ۳۱ نجی کے ثانوی مدارس کے پاس شدہ تھے۔ لیکن نجی کے ثانوی مدارس کی اہمیت نظر انداز نہیں کی جا سکتی کیونکہ ان طلبہ میں سے جنہوں نے یونیورسٹی میں داخل ہونے کے بعد امتحانات پاس کئے تقریباً ۵۰ فیصدی طلبہ انہیں نجی کے ثانوی مدارس، درسگاہوں کے فارغ التعلیم تھے۔

ملک کی قومی زندگی میں جو جگہ ثانوی تعلیم کو حاصل ہے، وہ اس کی تعلیمی حالت کا مزید تجزیہ کرنے سے بخوبی ظاہر ہو جاتی ہے۔ ۶۶۱، ۴۹، ۵۸، ۴۴ کی کل آبادی میں سے ۵، ۵۹، ۳۲۰ یا ہر دس ہزار میں سے ۱۲٫۵۵ اشخاص ثانوی مدارس کے طالب العلم تھے۔ اس لحاظ سے صوبوں میں سے کوانٹنگ کا درجہ سب سے آگے ہے جس میں ہر دس ہزار میں سے ۳۰٫۲۴ طالب العلم تھے اس کے بعد لیاؤننگ آتا ہے، جہاں ہر دس میں ۲۱٫۱۶ طالب العلم تھے بارہ صوبوں میں ۱۰ سے بیس تک اور چودہ صوبوں میں ہر دس ہزار میں سے ۱۰ سے بھی کم اشخاص تعلیم پا رہے تھے۔ بلدیات میں سے پی پنگ سب سے بڑھا ہوا ہے، جس میں ہر دس ہزار کی آبادی میں سے ۱۷۱٫۳۷ طالب العلم تھے، نین کنگ میں ہر دس ہزار میں ۸۹٫۴۰ اشنگھائی میں ۲۵٫۰۹ سنگٹاؤ میں ۳۵٫۴۶ اور دی ہائیوں میں ہر دس ہزار میں ۲۵٫۲۵ طالب العلم تھے ظاہر ہے کہ ملک کے تمام حصوں میں یکساں تعلیم پھیلانے کے لیے ایک بہت بڑی جد و جہد کی ضرورت ہے۔

سال ۳۳ء میں ثانوی مدارس کے اساتذہ اور دیگر عملے کی تعداد ۶۱، ۶۳۸ تھی جس میں سے ۵۵، ۹۶۵ تو مرد اور ۵، ۶۷۳ عورتیں تھیں۔ اور کل تعداد میں سے ۴۳٫۴۸۶ مڈل اسکولوں میں ۱۱٫۳۹۵ نارمل اسکولوں میں اور ۶٫۷۵۷ صنعتی اسکولوں میں تھے۔ پبلک ثانوی مدارس میں اساتذہ اور ممبران اسٹاف کی تعداد ۳۷، ۶۹۸ اور نجی کے ثانوی مدارس میں ان کی تعداد ۲۳، ۹۴۰ تھی ثانوی مدارس میں اساتذہ اور ممبران اسٹاف کی تعداد ۳۷، ۶۹۸ اور پرائیویٹ ثانوی مدارس میں ان کی تعداد ۲۳، ۹۴۰ تھی ثانوی مدارس کے کل ۶۱، ۶۴۸ اساتذہ اور ممبران سٹاف میں سے ۳، ۹۴۷ (یا ۶٫۳۶ فیصدی) غیر ملکی یونیورسٹیوں کے۔ ۳، ۹۵۸ (یا ۴۸٫۷ فیصدی) نارمل یونیورسٹیوں کے۔ ۱۶، ۲۲۰ (یا ۲۶٫۵۵ فیصدی) ملکی یونیورسٹیوں کے۔ ۶، ۶۴۶ (یا ۱۰٫۸۳ فیصدی) ہپیر نارمل اسکولوں کے اور ۱۱، ۵۶۲ (یا ۱۸٫۹۲ فیصدی) دوسرے مدارس کے

فارغ التحصیل تھے یعنی ثانوی مدارس کے مدرس زیادہ چینی یونیورسٹیوں، کالجوں اور ٹکنیکل اسکولوں کے ہی تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ اور ملک کی اعلےٰ تعلیم کا اثر بلاواسطہ اسکی ثانوی تعلیم پر پڑا ہے۔

۲۶ مئی ۳۲ء میں وزارت تعلیم نے ابتدائی ثانوی مدارس کے امتحانات کے متعلق ایک ضمنی قاعدہ جاری کیا جسکا مقصد ایک طرف تو طلبہ کی تعلیمی حالت کا صحیح اندازہ لگانا اور اس کا بڑھانا تھا اور دوسری طرف اساتذہ کی تدریس کی صلاحیت کو ترقی دینا تھا لیکن ثانوی اور نارمل اسکولوں پر اس قانون کی پابندی عائد نہیں ہوئی تھی۔ مڈل اسکول کا آخری امتحان دینے والے طلبہ کو صوبائی یا بلدیائی افسران تعلیم کے مقرر کردہ امتحانات میں بیٹھنا پڑتا تھا۔ ان امتحانات کیلیے مضامین کی فہرست وزیر تعلیم نے مقرر کر کے جون میں شائع کر دی تھی۔ جونیر مڈل اسکول کے امتحان میں اصول کومینٹانگ، ملکی اور غیر ملکی زبانیں، ریاضی، تواریخ، جغرافیہ، حیوانیات، نباتات، جسمانی تربیت شامل تھے۔ اور سینیر مڈل اسکول کے امتحان کے لیے اصول کومینٹانگ، ملکی اور غیر ملکی زبانیں، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، طبیعات، کیمیا، حیوانیات و نباتات اور جسمانی تربیت مقرر کیے گئے تھے، نیز کوئی امیدوار اس وقت تک سند یا ڈپلوما دئے جانے کا مستحق نہیں تھا جب تک کہ وہ سرکاری امتحان (Publio Examinaticn) میں کامیاب نہ ہو جائے۔ اور بغیر اس سند یا ڈپلوما کے کسی طالب علم کو یونیورسٹی یا کالج کے داخلے کے امتحانات میں شامل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ ہاں اگر وہ ایک یا دو مضامین میں رہ جائے تو اُسے دوبارہ امتحان دینے کی اجازت تھی۔ اور اگر وہ دوبارہ فیل ہو جائے تو ایک سال کے بعد سے پھر ایک اور آخری موقع دیا جاتا تھا۔

ان عارضی قواعد پر وزیر تعلیم نے ۳۳ء میں پھر نظر ثانی کی اور نئے قانون کے موافق ابتدائی مدارس کے طلبہ پر سے امتحان کی قید اُٹھالی گئی۔ اور مڈل اسکول کے طلبہ کو جو دو یا تین مضامین کے امتحان میں ناکام رہے، عارضی طور پر یونیورسٹی میں داخل ہونے کی اجازت مل گئی۔

سال ۱۹۳۳ء میں مڈل اسکول کے سرکاری امتحانات کے متعلق جو قواعد جاری کیے گئے تھے ان پر وزیر تعلیم نے ۱۹۳۵ء میں دوبارہ نظرثانی کی اور اپریل ۱۹۳۶ء میں ان سرکاری امتحانات کے مضامین کم کر کے چینی اور غیر ملکی زبانیں، ریاضی، طبیعات، کیمیا، تواریخ اور جغرافیہ تک محدود کر دئے اور طلبہ کی سہولت اور آسانی کو مدِنظر رکھتے ہوئے ملک میں مختلف مقامات پر ان امتحانوں کے بہت سے مرکز مقرر کیے۔ اور ۱۹۳۲ء کے ضمنی قواعد سال ۱۹۳۵ء کے قواعد سے منسوخ کر دیے گئے اور مڈل اسکول کے امتحان میں صرف وہی مضامین رکھے گئے جو نارمل اسکولوں میں پڑھائے جاتے تھے۔ جب سے سرکاری امتحانات کا سلسلہ شروع ہوا ہے اس وقت سے ثانوی مدارس کا عام معیار بہت بلند ہو گیا ہے۔

سال ۱۹۳۴ء کے اعداد و شمار کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲،۲۲۸ مڈل اسکولوں کے کل ۸۰،۲۱۶ طلبہ ان سرکاری امتحانات میں شامل ہوئے جن میں سے ۵۴،۳۸۱ (یا ۶۷.۵۳ فیصدی) کامیاب ہوئے اور اسی سال ۳۷۳ نارمل اسکولوں کے کل ۱۲،۵۵۵ طلبہ نارمل اسکول کے سرکاری امتحان میں بیٹھے جن میں سے ۷،۳۴۰ (یا ۵۸.۴۸ فیصدی) کامیاب ہوئے۔

سائنس کی تعلیم

گذشتہ چند سالوں سے ثانوی مدارس میں سائنس کی تعلیم کو مختلف مشکلات کا سامنا ہوا ہے چونکہ چین قدیم روایات کا حامل ہے اس لیے چینی طلبہ کی اکثریت ریاضی، طبیعات، کیمیا اور حیوانیات و نباتیات کی نسبت تواریخ اور ادب کی طرف زیادہ مائل رہتی ہے۔ ادبی مضامین سے اس قدر علاقہ اور تعلق ہو تو قدرتی طور پر طلبہ کی توجہ سائنس سے ہٹی رہتی ہے جو آجکل کی تہذیب کی بنیاد ہے۔ چنانچہ وزارت تعلیم نے اس مسئلہ کا حل علم ادب کو دبانے میں نہیں بلکہ سائنس کی تعلیم کو علم ادب کی تعلیم کے ہم پلہ بنانے میں پایا ہے۔ اس لیے سائنس اور علم ادب ہر دو کی تعلیم پر یکساں زور دینا لازمی کر دیا گیا۔ دوسری طرف اصطلاحی

مشکلات بھی تھیں ۔ اور بعض مدارس میں سرمائے کی کمی انہیں سائینس کی تعلیم کی معمولی ضروریات کے مہیا کرنے میں مانع تھی ۔ اور بغیر ضروری سامان کے سائینس کی تعلیم حقیقی اور عملی نہیں ہو سکتی اس مشکل کو حل کرنے کی غرض سے ایسے نادار اسکولوں کے لیے مفید اور ضروری سامان خریدا جاتا ہے ۔ اور معملوں میں بھی ضروری اضافے کے لیے اہم تبدیلیاں عمل میں لائی جا رہی ہیں ۔

وزارت تعلیم نے سنہ ۳۳ء میں طبیعات، کیمیا، حیوانیات، نباتیات کیلیے سٹینڈرڈ سامان کی فہرستیں اور ان کے متعلق تفصیلی بیان شائع کر دیئے ہیں ۔ اور تمام ثانوی مدارس میں عملی کام شروع کر دیا گیا ہے ۔ اور یہ محسوس ہو رہا ہے ، کہ سائینس کی تعلیم اب بہت کچھ سُدھر گئی ہے ۔ دُور دراز صوبوں میں عارضی طور پر چند اسکولوں کو ملا کر ان کے لیے متفقہ معمل قائم کر دئے گئے ہیں ۔ ان تعلیمی انجمنوں کی امداد سے جو کولمبو پلان کے تاوانی روپیہ کے صحیح مصرف کے لیے قائم ہیں ، اور سینیکا اکاڈیمی کی فزکس انسٹی ٹیوٹ کے تعاون سے وزارت تعلیم نے سائینس کے آلات بنانے کی ایک تجویز کو عملی جامہ پہنایا ہے چنانچہ سنہ ۳۶ء میں ہی علم طبیعات نے ۸۰ سٹ اور علم کیمیا کے سامان کے ۱۸۰ سٹ تیار ہو کر مختلف صوبوں اور بلدیہ جات کے سینیر مڈل اسکولوں میں تقسیم ہو چکے ہیں ۔ اسی طرح آلات سائینس کی ایک کثیر تعداد جس میں علم طبیعات کے سامان کے ۱۰،۰۰۰ سٹ اور علم کیمیا کے سامان کے ۶۶۰ سٹ شامل ہیں تیار ہو کر تمام ملک کے جونیر مڈل اسکولوں میں تقسیم کر دئے گئے ہیں ۔ سائینس کے آلات کے یہ سٹ سینیر مڈل اسکولوں میں لاگت کی ۵۰ فیصدی قیمت پر اور جونیر مڈل اسکولوں میں لاگت کی ۶۰ فیصدی قیمت پر فروخت کیے گئے ہیں ۔ اور آلات سائینس کا سائینس کے مختلف شعبہ جات میں خاص تربیت یافتہ اور مہارت رکھنے والے طلبہ سے ملک کے اندر ہی تیار کرانیکا یہ تجربہ اس قدر کامیاب ثابت ہُوا ہے ۔ کہ انہیں وسیع پیمانے پر تیار کرنیکی ایک تجویز عمل میں لائی جا چکی ہے ۔ تاکہ ثانوی مدارس کو سائینس کی تعلیم کے لیے کافی مقدار میں سامان مہیا کیا جا سکے ۔

اساتذہ کی تعلیم کا ضمنی انتظام

ثانوی مدارس کے اساتذہ کے عام تعلیمی معیار کو بڑھانے کے لیے ۱۹۳۲ء میں وزارت تعلیم نے سب یونیورسٹیوں کو ہدایت کی کہ وہ تعطیلات موسم گرما میں اساتذہ کی مزید تعلیم کے لیے اسکول کھولیں۔ تاکہ وہ اپنے اپنے مخصوص مضامین میں علمی واقفیت کی اصلاح کر سکیں اور طلبہ کو اس سے مستفید بھی کر سکیں۔ اس غرض سے افسران تعلیم نے اساتذہ کی مناسب تعداد کا انتخاب کیا۔ اور انہیں وظیفے سفر خرچ، اور اسی طرح کی دیگر امداد دے کر اس فرید تعلیم کے لئے آمادہ کیا۔ سال ۱۹۳۳ء میں وزارت نے تمام صوبوں اور بلدیہ جات کے ارکین محکمہ تعلیم کو ہدایت کی۔ کہ گرما کے ایسے اسکول کھولنے میں وہ یونیورسٹیوں کی امداد کریں۔ اور ہدایت کی گئی کہ ہر ایک معلم کو ہر تین سال کے عرصہ میں ایک مرتبہ ضرور ایسے اسکولوں میں جانے کا موقع دیا جائے۔ گرما کے ان اسکولوں کے نصاب میں انگریزی۔ تواریخ۔ جغرافیہ اور سائنس کے مختلف شعبوں کی تعلیم شامل کی گئی ہے۔

اسی طرح اور اسکولوں میں بھی صنعتی مضامین کی مزید تعلیم اور ٹریننگ دینے کے لیے ضمنی انتظام کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ تعلیم کی وزارت نے مرکزی تجربی فارم، قومی مرکزی یونیورسٹی اور نین کنگ یونیورسٹی کے تعاون سے سال ۱۹۳۳ء میں زراعتی اسکولوں کے اساتذہ کے لیے گرمیوں میں ایک ایسے ہی اسکول کا افتتاح کیا ہے۔ اور اسی زمانہ میں لیسٹر انسٹی ٹیوٹ کے تعاون سے شنگھائی میں ایک ایسا ہی اسکول صنعتی اسکولوں کے اساتذہ کے افادے کے لیے کھول دیا گیا ہے۔

خاص نصاب

اپریل ۱۹۳۶ء میں وزارت تعلیم نے ثانوی مدارس میں قومی وقتی ضروریات کو پورا

کرنے کے لئے خاص تربیت کا مزید نصاب مترتب کیا جس پر جولائی میں عملدرآمد شروع ہو گیا، اس کے بعد سب مضامین میں مزید نصاب نافذ کیا گیا۔ تا کہ وہ قوم کے نازک موقعوں پر اور خطرے کے مرحلوں پر فوری ضروریات کو پورا کر سکے۔ ثانوی مدارس میں فضائی خطرے سے بچنے کے لئے بھی معمولی تربیت کا انتظام کیا گیا۔

فوجی تربیت

ثانوی مدارس میں فوجی تربیت لازمی کردی گئی ہے۔ اور اساتذہ کے لیے کسی مستند فوجی سکول کا تربیت یافتہ ہونا بھی ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح جونیر مڈل اسکولوں میں سکوٹنگ کو رواج دیدیا گیا ہے۔ اپریل ۳۶ء میں اسی غرض سے وزارت تعلیم نے تمام ثانوی مدارس کو فوجی تربیت اور سکوٹنگ پر سختی سے عمل پیرا ہونے کی تاکیدی ہدایات جاری کیں۔

لازمی جسمانی تربیت

جنوری ۳۶ء میں وزارت تعلیم نے ثانوی مدارس میں لازمی جسمانی تربیت کے متعلق ضمنی قواعد نافذ کئے، ان قواعد کے جاری ہونے کے وقت سے ثانوی مدارس میں سکول کا کام تین بجے شام کو بند کر دیا جاتا ہے جس کے بعد طلبہ کو کھیلوں اور ایسے ہی دوسرے مشغلوں میں حصہ لینا پڑتا ہے۔ ہر صبح کو طلبہ کیلیے ورزش لازمی کر دی گئی ہے۔

جولائی ۳۶ء میں وزارت تعلیم نے ثانوی مدارس میں حفظان صحت کی ترقی کے لیے ضمنی قواعد جاری کیے، اسکولوں میں حفظان صحت کو رواج دینے کا مقصد یہ ہے کہ طلبہ بیماریوں سے بچنے کا صحیح علم اور تندرست رہنے کے اصول بخوبی جان لیں، ہر ایک اسکول میں طلبہ کی صحت کی نگہداشت کے لئے کم از کم ایک نرس کا ہونا لازمی کر دیا گیا ہے۔ اگر ہر ایک اسکول علیحدہ علیحدہ ایک ڈاکٹر نہ رکھ سکتا ہو، تو ایک مقام کے چند یا تمام مدارس کو ملکر ایک ڈاکٹر رکھنا پڑتا ہے، ہر ایک

طالب العلم سے حفظانِ صحت کے مصارف کے لئے ایک ڈالر سالانہ لیا جاتا ہے جس میں سے ۴۰ سنٹس تو طالب العلم کو خود ادا کرنا پڑتے ہیں اور باقی ۶۰ سنٹس اسکول کی طرف سے ادا کیے جاتے ہیں۔ اسکول میں حفظانِ صحت کے نصاب میں حفظانِ صحت طبی معائنہ متعدی بیماریوں سے بچنے کا طریقہ، امراض کی تشخیص اور ان کا علاج نیز اپنے گرد و نواح کو بہتر بنانا وغیرہ مضامین کا خاص طور پر اضافہ کیا گیا ہے۔ حفظانِ صحت کی تدریس کو آسان بنانے اور علاج معالجہ کرنے کا ضروری سامان بھی مہیا کیا گیا ہے۔

گذشتہ چند سالوں سے صنعتی تعلیم میں بھی خاصی ترقی ہوئی ہے۔ چونکہ بعض اسکولوں میں سرمایہ کی کمی تھی، اس لیے ایسے (نادار) اسکولوں کے معملوں کو وسعت دینے، انکے ورکشاپوں اور ایسے ہی دوسرے ذرائع میں آسانیاں پیدا کرنے کے لیے وزارت تعلیم نے ۴۰۰،۰۰۰ ڈالر قومی خزانے سے صرف کرنا منظور کر لیا ہے۔ چنانچہ سال ۱۹۵۳ء میں ۲۹ انڈسٹریل اسکولوں ۱۲ زراعتی اسکولوں ۳ تجارتی اسکولوں اور فقط ایک اصول خانہ داری کے اداروں کو مالی امداد بھی دی گئی ہے۔

وزارت تعلیم نے لندن اور پیرس کے پولی ٹیکنیکل اسکولوں کے طرز کے مرکزی قومی پولی ٹیکنیکل اسکول کھولنے کا بھی ارادہ کیا ہے۔ اس اسکول میں آرٹ اور سائنس کی تعلیم کے علاوہ انجینیرنگ کے مختلف شعبوں اور دوسرے صنعتی مضامین کی تعلیم بھی دی جائیگی۔ یو کسلرانڈسٹی فنڈ کی مجلس انتظامیہ نے حکومت برطانیہ کی وساطت سے ۲،۵۰۰،۰۰۰ ڈالر اور قومی خزانہ نے ۵۰۰،۰۰۰ ڈالر اس انسٹی ٹیوٹ کے قائم کرنے کیلئے دیدئے ہیں۔ اس اسکول میں جو مضامین پڑھائے جائینگے۔ ان کی عارضی تقسیم چار شعبوں میں کی گئی ہے۔ جو عام انجینیرنگ سول انجینیرنگ۔ الیکٹرک انجینیرنگ اور اپلائیڈ کیمسٹری ہیں، اس انسٹی ٹیوٹ کو سال ۱۹۵۶ء سے کھولنے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔

تعلیم کو کارآمد اور مفید بنانے کی غرض سے وزارت تعلیم نے صنعتی رہنمائی کی توسیع کے لئے ضوابط کا تمام ملک میں نفاذ کر دیا ہے۔ اور اسی مسئلے پر وزارت استصواب کے لئے کتابیں

بھی طبع کرکے شائع کرتی رہتی ہے۔ مختلف صوبوں کے محکمہ ہائے تعلیم میں اور اضلاعی اور بلدیاتی تعلیمی شعبہ جات میں صنعتی رہنمائی کے لیے ایک علیحدہ شعبہ کا اضافہ بھی کیا گیا ہے اور صنعتی رہنمائی کے لیے مستقل افسر بھی مقرر کردئے گئے ہیں۔ ان افسروں کا کام مندرجہ ذیل حصوں پر مشتمل ہے۔

۱۔ تعلیم جاری رکھنا، مضامین کا انتخاب اور پیشوں کا تبدیل کرنا اور ایسے ہی دوسرے معاملات میں طلبہ کی رہنمائی۔

۲۔ ضلع کے اسکولوں کی حالت کی تحقیق۔

۳۔ ضلع کے مخصوص پیشوں کی اقتصادی اور فنی حالت کی تحقیق۔

۴۔ ضلع کے طلبہ کے رجحانات طبع اور انکی ذہانت کا صحیح اندازہ کرنا۔

۵۔ روزگار تلاش کرنے والوں کی تعداد اور ان کی کھپت کے اعداد و شمار کا مہیا کرنا۔

۶۔ صنعتی رہنمائی میں اسکولوں کی امداد۔

۷۔ مختلف انجمنوں کی طرف سے ملازمین کی بھرتی کے لیے امتحانات کا انتظام۔

۸۔ مختلف پیشوں اور صنعتوں پر مقالات پڑھے جانے کا انتظام کرنا

۹۔ استصواب کے لیے ضروری کتابیں بہم پہنچانا اور ایسے ہی دوسرے ذرائع کا مہیا کرنا۔

درسی کتابوں کا جانچنا

صنعتی تعلیم کو توسیع اور ترقی دینے کے لیے وزارت تعلیم نے مختلف مضامین پر ملک کے مشہور قدیمی پبلک اور نجی کے مدارس کی درسی کتابیں جمع کیں اور انکے ملاحظہ اور محاسبہ کے لئے ماہرین تعلیم مقرر کئے۔ چنانچہ مارچ ۱۹۳۳ء میں پچاس کے قریب کتابیں منتخب ہوئیں جو تمام صنعتی اسکولوں میں ان کے آئندہ استعمال کے لیے تقسیم کی گئیں۔

نین کنگ میں جمہوری حکومت کے قیام سے ثانوی مدارس کی تنظیم کا ازسرنو آغاز ہوا۔ اور ایسے ذرائع استعمال کئے گئے جو ایک طرف تو وقت کی ضرورت کو پورا کرتے ہیں اور دوسری طرف نظام تعلیم کے لیے ایک ٹھوس بنیاد کا کام بھی سرانجام دیتے ہیں۔

اشتہار

کتب لائبریری

برائے پرائمری و لوئر مڈل کلاسز

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت	نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱	کہانیوں کی پہلی پروفیسر رام سروپ کوشل	۴ر۱۱ پائی	۲۰	دلچسپ تاریخی کہانیاں حصہ سوم	۷ر
			۲۱	کام کی باتیں حصہ اول	۳ر۹ پائی
۲	″ ″ دوسری ″	۶ر۱ ″	۲۲	″ ″ ″ ″ دوم	۲ر۳ ″
۳	″ ″ تیسری ″	۷ر۶ ″	۲۳	قصص ہند حصہ اول	۳ر۲ ″
۴	پیاری کہانیاں اول	۶ر	۲۴	″ ″ ″ دوم	۲ر۸ ″
۵	″ ″ دوم	۵ر	۲۵	قصص ہند کا مجموعہ زنانہ	۱۱ر
۶	″ ″ سوم	۷ر	۲۶	حسینہ اور وحشی ..	۱ر۵ ″
۷	میٹھی کہانیاں اول	۲ر	۲۷	شہزادہ مہربان	۲ر۱۰ ″
۸	″ ″ دوم	۵ر	۲۸	راما سیتا	۱ر۱۰ ″
۹	″ ″ سوم	۷ر	۲۹	جادو کا مٹکا مسٹر رلیا رام	۳ر
۱۰	″ ″ چہارم	زیر طبع	۳۰	درو پدی	۸ ۸ ″
۱۱	″ ″ پنجم		۳۱	مہاراجہ رنجیت سنگھ	۴ر۶ ″
۱۲	امرت کہانیاں نمبر ۱	۲ر۹ پائی	۳۲	خلیفہ ہارون الرشید ..	۴ر
۱۳	″ ″ نمبر ۲	۳ر۱۰ ″	۳۳	راجہ اشوک	۵ر
۱۴	″ ″ نمبر ۳	۲ر۵ ″	۳۴	مہارانا پرتاپ	۲ر۱۰ پائی
۱۵	انوار سہیلی کے انمول موتی حصہ ۱	۲ر۸ ″	۳۵	شیر شاہ سوری -	۲ر۱۱ ″
			۳۶	شہاب الدین شاہجہان	۲ر۱۰ ″
۱۶	″ ″ حصہ ۲	۴ر۱۰ ″	۳۷	نصیر الدین ہمایوں	۲ر۱۰ ″
۱۷	″ ″ حصہ ۳	۲ر۵ ″	۳۸	اورنگ زیب عالمگیر ..	۲ر۹ ″
۱۸	دلچسپ تاریخی کہانیاں حصہ اول	۷ر۷ ″	۳۹	نورالدین جہانگیر ..	۲ر۳ ″
۱۹	″ ″ ″ دوم	۸ر۱۱ ″	۴۰	شہاب الدین غوری ..	۲ر۸ ″

آئین ادب

(رہبر اُردو)

برائے امیدواران امتحان ورنیکلر فائنل

۱۔ تقریباً ایک ہزار محاورات کا مطلب اور استعمال (فقرات و اشعار میں) واضح کیا گیا ہے۔

۲۔ تصحیح اغلاط کے متعلق بیس مثالیں دے کر تقریباً سو (۱۰۰) غلط فقرات کو صحیح کر کے دکھایا گیا ہے اور اس سلسلہ میں تذکیر و تانیث۔ ہجوں خطوط۔ وحدت و جمع۔ ترکیب اور دیگر عام اغلاط کو علیحدہ علیحدہ بیان کر کے درست کر دیا گیا ہے +

۳۔ سو (۱۰۰) سے زیادہ نامکمل فقرات کو مکمل کر کے دکھایا گیا ہے۔ اور یہ تمام فقرات اخلاقی نصائح پر مشتمل ہیں +

۴۔ تذکیر و تانیث اور وحدت و جمع کے متعلق علیحدہ باب قائم کر کے مکمل واقفیت دلائی گئی ہے +

۵۔ افعال لازم، متعدی اور معروف مجہول کے متعلق ۱۰ مشقیں دے کر وضاحت کی گئی ہے +

۶۔ خاکہ سے کہانی لکھنے کا طریق سمجھایا گیا ہے اور ۱۰ کہانیوں کو خاکوں سے مکمل کر دیا گیا ہے +

۷۔ خط و کتابت کے متعلق ضروری ہدایات دیکر ۳۵ نمونے کے خطوط اور عرضیاں درج کی گئی ہیں +

۸۔ پرچہ ادب ورنیکلر فائنل کے ۴۰ موڈل پیپرز اخیر پر لگائے گئے ہیں +

۹۔ شکل عبارت۔ اشعار اور نظم کا مطلب لکھنے کے متعلق مثالیں دیکر ہدایات دی گئی ہیں +

۱۰۔ ہندوستان کے بہترین شعرا اور ادیب حضرات کی نظم و نثر کے اقتباسات دیئے گئے ہیں۔ جنہیں پڑھ کر طالب علم اردو کی مختلف طرزوں کو سمجھ سکتا ہے +

گویا یہ کتاب ۱۰ کتابوں کا مجموعہ ہے۔ اسے ایک ایسے قابل ہیڈ ماسٹر نے لکھا ہے جو اپنے امتحان میں پنجاب سے اول درجہ پر رہ چکا ہے اور بیس سال سے اس کا کوئی شاگرد فیل نہیں ہوا۔ اس کتاب کے ہوتے ہوئے امیدواران ورنیکلر فائنل کو اردو کی کسی دوسری کتاب کی ضرورت نہیں + حجم ۳۴۰ صفحے کاغذ عمدہ قیمت ۱۲ ر ۹ پائی

المشتہران

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز تاجران کتب لاہور

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت	نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۴۱	سلطان علاؤالدین خلجی	۲ر۱۱پائی	۶۶	بہادر شہزادہ . . .	۲ر۱۱پائی
۴۲	فیروز الدین تغلق . .	۳ر	۶۷	جوتی موتی	۲ر۱۰ ″
۴۳	امیر تیمور	۲ر۷ ″	۶۸	جواہرات کا خزانہ .	۳ر۷ ″
۴۴	پرتھوی راج	۲ر۸ ″	۶۹	چھوا اور سونا ہوا بالتصویر	۲ر
۴۵	محمود غزنوی . . .	۲ر۶ ″	۷۰	علی بابا چالیس چور . .	۴ر
۴۶	مصر کی داستان .	۳ر	۷۱	علاؤ الدین و عجیب وغریب لیمپ	۴ر۶پائی
۴۷	جاپان کی کہانی . .	۴ر			
۴۸	چین کی کہانی . .	۳ر۶پائی	۷۲	ملا دو پیازے کا سفر	۳ر
۴۹	مستورات چین وجاپان .	۴ر	۷۳	سادھو کشور سدھارتھ یعنی مہاتما بدھ کا دھرم گیان	۳ر
۵۰	ایران کی کہانی . . .	۲ر			
۵۱	ایشیائی روم . . .	۲ر۷پائی	۷۴	نیشا پور کا سوداگر . .	۲ر۱۱پائی
۵۲	ٹرکی (یورپی روم) .	۲ر۸ ″	۷۵	پرستان کا موچی . .	۳ر
۵۳	لنکا	۱ر۱۱ ″	۷۶	سندر پیاری . . .	۳ر
۵۴	بصرہ وبغداد . . .	۵ر	۷۷	چاندی کی کنجی . . .	۳ر
۵۵	یونان	۲ر	۷۸	سلک جواہر نمبر۱ (حکمرانی کا گر)	۲ر۶پائی
۵۶	تین سوال	۲ر۷پائی	۷۹	″ ″ نمبر۲ (اوج وپستی)	۱ر۱۱ ″
۵۷	امرت ورشا . . .	۳ر۱۰ ″	۸۰	″ ″ نمبر۳ (شہید الفت)	۱ر۶ ″
۵۸	زمانہ سلف کے قصے کہانیاں نمبر۱ داؤد بادشاہ	۲ر۶ ″	۸۱	سلک جواہر مرد میدان	۱ر۶ ″
			۸۲	″ ″ نیک وبد	۱ر۹ ″
۵۹	کہانیاں بتیس پتلیاں حصہ اول	۳ر۹ ″	۸۳	″ ″ عیب وہنر	۱ر۴ ″
			۸۴	″ ″ جہاں گرد	۱ر۶ ″
۶۰	″ ″ دوم ″	۴ر۵ ″	۸۵	″ ″ جواب باصواب	۱ر۱۰ ″
۶۱	خوفناک خواب . . .	۲ر	۸۶	″ ″ سخاوت کی انتہا	۱ر۲ ″
۶۲	ہیرا لال	۲ر۶ ″	۸۷	″ ″ حسن تدبیر	۱ر۹ ″
۶۳	دولت کی پٹاری . . .	۲ر۱ ″	۸۸	ڈرامہ نئی بستی یعنی شہریت	۱ر۳ ″
۶۴	سادھو کی چکی . . .	۴ر			
۶۵	نیلا باز	۲ر۱۱ ″	۸۹	ڈرامہ غم خوار عالم . .	۱ر۷ ″

نمبر	نام کتاب	قیمت
۹۰	مہاراجہ بکرماجیت اور اس کا تخت	۱ر۹ پائی
۹۱	سنہری گیت حصہ اول	۲ر۴
۹۲	" " " دوم	۲ر۴
۹۳	" " " سوم	۲ر۷
۹۴	جو مانگو	۳ر
۹۵	اسرارِ دل	۵ر
۹۶	جارج واشنگٹن ..	۱ر۶ پائی
۹۷	سکا دڑوں کا بادشاہ ..	۱ر۸
۹۸	لوہے کا بادشاہ ..	۱ر۶
۹۹	صابن کا بادشاہ ..	۱ر۱
۱۰۰	آزادی کا بادشاہ ..	۱ر۱۱
۱۰۱	ڈاکو کی مرمت	۲ر۶
۱۰۲	چھو منتر	۴ر۵
۱۰۳	فرصت کے کام	۳ر۴
۱۰۴	دنیا کے کام کاج ..	۵ر۵
۱۰۵	آداب و اخلاق ...	۱۰ر
۱۰۶	موقعہ	۵ر۶
۱۰۷	نیک اطوار	۲ر
۱۰۸	خوشی کا کھیل ...	۳ر۱۰ پائی
۱۰۹	بہادر محمود	۱ر۷
۱۱۰	سہراب و رستم ...	۲ر۱
۱۱۱	دھوپ چھاؤں ...	۳ر
۱۱۲	راجہ ہریش چندر ..	۲ر
۱۱۳	سنہری پرندہ ...	۲ر۱ پائی

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱۱۴	کورو کے پانچ بہن ..	۱ر۸ پائی
۱۱۵	کرشن جی کا بچپن ..	۱ر۴
۱۱۶	تبدیل قسمت ...	۱ر۹
۱۱۷	جادو کا قلعہ	۳ر
۱۱۸	راجہ گوپی چند ...	۱ر۷
۱۱۹	بندر کی ہوشیاری	۱ر۶
۱۲۰	بارہ بھائی	۱ر۱۰
۱۲۱	مشاہیر عالم حصہ اول	۳ر
۱۲۲	" " دوم	۳ر
۱۲۳	" " سوم	۳ر

کتب لائبریری
برائے لوئر و اپر مڈل سکولز

نمبر	نام کتاب	قیمت
۱	رسوم ہند حصہ اول	۶ر۲ پائی
۲	" " دوم	۷ر۳
۳	تخت سلیمانی ..	۸ر۷
۴	الہ دین چراغ ..	۴ر۶
۵	رامائن کی کہانی ...	۸ر۲
۶	مہابھارت کی کہانی ..	۵ر۶
۷	پیارا گورو نانک ..	۳ر۷
۸	سید انشاء اللہ خاں انشا	۴ر۱
۹	سوانح عمری نواب مرزا خاں داغ	۴ر۲

راے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز ایجوکیشنل پبلشرز لاہور

Printed and published by L. Moti Ram, Manager, for Messrs. R.S.M. GULAB SINGH & SONS, at the Mufid-i-'Am Press, Chatterji Road, Lahore.

رجسٹرڈ نمبر ایل ۳۷۹۷

منظور کردہ جناب ڈائرکٹر صاحب بہادر سررشتہ تعلیم پنجاب
بموجب سی ایم نمبر ۳۵۴۴/۱۱ اسی مورخہ ۲۲ مئی ۱۹۳۶ء

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اردو ایڈیشن

زیر ادارت

خان بہادر شیخ نور الٰہی، ایم اے، آئی ای ایس
بشیر احمد ہاشمی ایم اے - ایم - ای - ڈی - پی - ای - ایس
پروفیسر گوپال داس کھنہ، ایم اے، بی ٹی

Vol. 5. July, 1938. No. 4.

سالانہ چندہ : چار روپے

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اُردو ایڈیشن

جلد (۵) | جولائی ۱۹۳۸ء | نمبر (۴)

فہرست مضامین

ایڈیٹوریل

حال ہی میں حکومتِ ہند نے اپنی سالانہ تعلیمی رپورٹ شائع کی ہے، جس میں ابتدائی تعلیم سے متعلق چند حالات درج ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ وُہ قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث ہونگے۔ رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۳۶ء میں ہندوستان میں ابتدائی تعلیم پر کل ۶٫۸۲٫۸۸٫۱۶۰ روپے صرف ہُوے۔ ۱۹۳۵ء کے اخراجات سے یہ رقم بقدر ۱۳٫۲۹٫۷۵۲ روپے زاید تھی۔ اسی سال کے دوران میں مختلف صوبجات کی حکومتیں کوشاں رہیں کہ اُن کے مختلف مدارس میں طلبہ کی تعداد بڑھے۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء میں بمقابلہ ۱۹۳۵ء کے ۲۰۱٫۱۱۲ طلبہ زیادہ داخل ہُوے۔ اس بات کی بھی کوشش ہوتی رہی کہ خواندگی کی اوسط پچھلے سالوں سے زیادہ ہو اور چند صوبوں میں یہ کوشش ایک حد تک مشکور بھی ہُوئی۔ مدراس میں یہ اوسط ۳۱ سے ۳۲ فیصدی، بمبئی میں ۴۱ سے ۴۵ فیصدی اور صوبجات متوسط میں ۲۵ سے ۲۶ فیصدی بڑھ گئی۔ لازمی تعلیم کی طرف بھی توجہ دی گئی اور سال مذکور میں ۱۶۰ شہری حلقوں اور ۱۰۳۵۵ دیہات میں لازمی تعلیم رائج کی گئی۔

مندرجہ بالا حالات کے پیشِ نظر ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں ابتدائی تعلیم روبہ ترقی ہے۔ وہ بھی زمانہ تھا کہ کل ہندوستان میں ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ غرضکہ ہر قسم کی تعلیم پر سرکار کی طرف سے صرف چند لاکھ روپے صرف کرنے کی اجازت تھی اور یہ بھی زمانہ ہے کہ صرف ابتدائی تعلیم پر سات کروڑ روپے کے لگ بھگ خرچ اُٹھتا ہے۔ تاریخ

کی روشنی میں ہم دیکھیں، تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے لے کر آج تک ملک میں تعلیم بتدریج ترقی کرتی ہُوئی نظر آتی ہے، لیکن یہ تاریخ، تعلیم کی اصلی حالت کا صحیح اندازہ لگانے میں ہماری دستگیری نہیں کرتی۔ اس سے تو صرف اتنا ہی ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں پچاس یا سو برس پہلے ملک کے مدارس میں طلبہ کی ایک خاص تعداد تعلیم پاتی تھی، اب اس سے کئی گنا زیادہ ہو گئی ہے، لیکن جب وقت اس تعداد کا مقابلہ ملک کی کل آبادی سے کیا جائے، تو حالات مختلف نظر آتے ہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندوستان میں کل ۹ فیصدی انسان تعلیم یافتہ ہیں اور باقی ۹۱ فیصدی کی اکثریت اس زمانے میں، جبکہ دنیا کا گوشہ گوشہ علم کی روشنی سے جگمگا رہا ہے، جہالت کے عمیق سمندر میں ڈوبی ہُوئی ہے۔ ہمارے بدنصیب ملک کے مقابلے میں دنیا کا اور کوئی مہذّب ملک ایسا نہیں، جہاں تعلیم کی حالت اس قدر پست ہو۔ اس سے بھی بڑھ کر افسوسناک بات یہ ہے کہ ایک تو ہمارے ملک کی مالی حالت اجازت نہیں دیتی کہ ہم تعلیم کو عام کر سکیں اور دوسرے جو سرمایہ ہم اس پر خرچ کر رہے ہیں، اس سے ہمارے بچّے پورا پورا فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ رپورٹ مذکور کے مطابق صرف ۲۷ فیصدی طلبہ اور ۱۴ فیصدی طالبات ابتدائی تعلیم کو پورا کرتی ہیں۔ باقی ۷۳ فیصدی طلبہ اور ۸۶ فیصدی طالبات کی اکثریت اس سے بے بہرہ رہتی ہے۔

دوسرے ملکوں میں صورتِ حالات بالکل برعکس ہے۔ ذیل کی فہرست سے معلوم ہوگا کہ طلبہ کتنی کثیر تعداد میں ابتدائی تعلیم سے مستفید ہوتے ہیں۔

نام ملک	فی صدی طلبہ جو ابتدائی تعلیم حاصل کر رہے ہیں
انگلستان	۹۹
روس	۹۸

نام ملک	فی صدی طلبہ جو ابتدائی تعلیم حاصل کر رہے ہیں
سوئٹزرلینڈ	۹۹
سویڈن	۹۲
نوروے	۹۷
اٹلی	۹۲
یونان	۹۹
جرمنی	۹۹
فرانس	۹۵
ڈنمارک	۹۳
چیکوسلوبکیا	۹۳
بلجیم	۹۹

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے ملک میں ابتدائی تعلیم کی حالت اس قدر افسوسناک کیوں ہے۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ اس تعلیمی پستی کا کوئی علاج بھی ہے، یا نہیں؟ اور اگر ہے، تو وہ کیا ہے۔ حکومت ہند کی موجودہ رپورٹ میں اس تشویشناک بیماری کی مندرجۂ ذیل وجوہ بیان کی گئی ہیں :۔

۱۔ بلدیات اور ڈسٹرکٹ بورڈوں نے، جن کے ذمّے ابتدائی تعلیم کا انتظام تھا۔ اپنی ذمّے داری کو پورے طور سے محسوس نہیں کیا۔ سرمایہ کی کمی شاید تعلیم کے راستے میں اس قدر حارج ثابت نہیں ہوتی، جس قدر کہ ان مجالس کی غفلت اور تعلیمی معاملات میں ناتجربے کاری۔

۲ - تعلیم کا معیار بہت اُونچا نہیں ہے -

۳ - ٹرینڈ اساتذہ کی کمی - آج کل دُنیائے تعلیم میں ایک انقلاب آرہا ہے - جدید تحریکیں پوری قوت کے ساتھ گامزن ہیں - تدریس و تعلیم کے نئے نئے طریقے ایجاد ہو رہے ہیں - بچّے کی داخلی اور خارجی زندگی کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جاتا ہے اور طرزِ تعلیم کو اُس کے رجحان اور اُس کی صلاحیت کے موافق ڈھالا جاتا ہے، لیکن چونکہ ہندوستان میں پرائمری مدارس میں ٹرینڈ اساتذہ کی بہت کمی ہے، اس لیے ہماری ابتدائی تعلیم جوں کی توں ہے اور اس انقلاب کی بڑی سے بڑی حرکت بھی اُسے متاثر نہیں کرتی -

۴ - طلبہ مدارس میں روزانہ باقاعدگی کے ساتھ حاضر نہیں ہوتے - چونکہ دیہات میں طلبہ کے والدین خود بالعموم جہالت کا شکار ہوتے ہیں، اس لیے وُہ اس بات کو محسوس ہی نہیں کرتے کہ بچّوں کو باقاعدگی کے ساتھ اسکول بھیجا جائے - اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے کہ وُہ اتنے غریب ہوتے ہیں کہ بچّوں کو اسکول بھیجنے کے بجائے اپنے کھیتوں کی رکھوالی یا ڈھور ڈنگر کی دیکھ بھال میں لگانا زیادہ بہتر سمجھتے ہیں - اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گاؤں کے بہت سے بدنصیب بچّے تعلیم سے بے بہرہ رہتے ہیں - بعض حالات میں مدارس کا بچّوں کے گاؤں سے بہت دور واقع ہونا بھی اس نقص کو پیدا کر دیتا ہے -

۵ - بہت سے مدارس کی عمارتیں بہت گندی ہوتی ہیں اور ان کا بچّوں کی صحت پر بُرا اثر پڑتا ہے -

۶ - مدارس کا نظم و نسق تسلّی بخش نہیں ہے - جن مقاصد کو مدِّنظر رکھ کر ابتدائی تعلیم

دی جاتی ہے، اُن کی تعلیم کے لیے ضروری ہے کہ اساتذہ کی وقتاً فوقتاً رہنمائی کی جائے اور اُن کے کام کی باقاعدہ دیکھ بھال ہو اور یہ جبھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے اسکولوں کے انسپکٹر صاحبان خود جدید تعلیمی تحقیق سے آگاہ رہیں اور اس تحقیق کے موافق اساتذہ کی رہنمائی اپنا فرضِ اولین سمجھیں۔

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اگر بیماری کی تشخیص ہو جائے، تو اُس کے دور ہونے میں چنداں دیر نہیں لگتی۔ اس میں شک نہیں کہ ہماری بیماری بہت پُرانی ہے، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ بیماری کی تشخیص ہو چکی ہے۔ آج کل سارے ہندوستان میں تعلیم کا چرچا ہو رہا ہے اور ہم اس دن کا انتظار کر رہے ہیں، جب ہم بھی اپنا سر دوسرے مہذّب ملکوں کے سامنے اُونچا کر سکیں گے اور فخر کے ساتھ یہ کہہ سکیں گے کہ جہاں تک ابتدائی تعلیم کا تعلق ہے، ہمارے ملک کے سو فیصدی بچّے اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔

عادت

از

حفیظ ہوشیارپوری، ایم اے
اسسٹنٹ سکرٹری انجمنِ اُردو پنجاب

۱۔ اچھی اور بُری عادتیں

عادت کی اہمیت کو سمجھنا اُستادوں کے لیے بہت ضروری ہے اور اس بات میں "علم النفسیات" بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ہم گفتگو میں اچھی اور بُری عادتوں کا ذکر کرتے ہیں، لیکن عام طور پر ہم "عادت" کا لفظ استعمال کرتے ہیں، تو ہم میں سے اکثر کا اشارہ "بُری عادت" کی طرف ہوتا ہے۔ ہم تمباکو نوشی کی عادت، قسم کھانے کی عادت اور شراب پینے کی عادت کا ذکر تو کرتے ہیں، مگر پرہیزگاری کی عادت، اعتدال کی عادت اور جرأت کی عادت کا نام نہیں لیتے۔ حقیقت میں جس طرح ہماری عادتیں بُرائیاں کہلاتی ہیں، اسی طرح ہماری نیکیاں بھی عادتوں میں شامل ہیں۔ ہماری تمام زندگی عملی، جذباتی اور ذہنی عادتوں کا مجموعہ ہے، جنھیں ہمارے رنج و راحت

کے لیے تربیت دیا جاتا ہے اور جو کسی مزاحمت کے بغیر ہماری تقدیر پر اثرانداز ہوتی رہتی ہیں۔

چونکہ بچّے اس کو مقابلۃً چھوٹی عمر ہی میں سمجھ سکتے ہیں اور چونکہ اس کا سمجھنا اُن کے احساسِ ذمّہ داری کو کافی حد تک تیز کرتا ہے، اس لیے یہ بہت مفید ہوگا کہ اُستاد خود اُن سے عادت کے فلسفے کے متعلق ان عام الفاظ میں باتیں کرے، جیسا کہ میں بیان کرنے والا ہُوں۔

ہم عادت کے اصول کے زیرِ اثر اس وجہ سے ہیں کہ ہم گوشت پوست کے بنے ہُوئے ہیں۔ ہمارے "عصبی نظام" کے زندہ مواد کی جلد تغیر پذیر ہونے کی خاصیت اس بات کی ذمّے دار ہے کہ کوئی کام پہلی مرتبہ کرنے میں ہمیں دشواری پیش آتی ہے لیکن رفتہ رفتہ کافی مشق کے بعد اس میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے اور آخر کار ہم وہی کام مشین کی مانند غیر شعوری طور پر کرنے لگ جاتے ہیں۔ ہمارے عصبی نظام جن طریقوں میں استعمال ہوتے ہیں، انھیں طریقوں کے عادی ہو جاتے ہیں اور ان کی مثال اُن کاغذ کے پرزوں کی مانند ہے، جو ایک دفعہ مختلف حصّوں میں تہ ہونے کے بعد پہلی تہوں کے نشانات کی وجہ سے اُنھیں تہوں میں دوبارہ آسانی سے تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔

۲۔ عادت طبیعت کا دوسرا نام ہے

جہاں تک بالغ انسان کی زندگی کا تعلق ہے، "عادت" فطرت ثانیہ ہوتی ہے، بلکہ اس سے بھی دس حصّے زیادہ۔ کیونکہ جو عادتیں ہم مشق سے حاصل کرتے ہیں، وہ سنِ بلوغ کو پہنچتے وقت اُن قدرتی رجحانات میں اکثر کا خاتمہ کر دیتی ہیں، جو شروع شروع

میں موجود ہوتے ہیں۔صبح اُٹھنے کے وقت سے لے کر رات کو سونے کے وقت تک تقریباً ننانوے فی صدی بلکہ نوسو ننانوے فی ہزار غیر اختیاری اور عادت کا نتیجہ ہوتے ہیں۔کپڑے پہننا اور اُتارنا، کھانا پینا، ملنے اور جُدا ہونے کی رسومات، عورتوں کے آگے بڑھنے کے لیے راستہ چھوڑنا اور ہماری معمولی بات چیت کے طریقے تکرار کی وجہ سے اس حد تک ہماری روزانہ زندگی کا جزو بن جاتے ہیں کہ انھیں غیر شعوری یا فطری عمل کہا جا سکتا ہے۔ہر خارجی اثر کے جواب میں ہمارے پاس ایک ایسا بنا بنایا ردِّ عمل موجود ہوتا ہے، جو خود بخود ظہور میں آجاتا ہے۔

جہاں تک ہماری زندگی صرف عادتوں کا مجموعہ ہے، ہم نقّال اور نہ بدلنے والی مخلوق ہیں اور جو کچھ ہم کرتے رہے ہیں، وہی کرنا پسند کرتے ہیں اور چونکہ ہر حالت میں ہماری طبیعت کا رُجحان یہی ہوتا ہے، اس لیے اُستاد کا سب سے ضروری فرض یہ ہونا چاہیے کہ وُہ شاگردوں میں ایسی عادتوں کے بیج بوئے، جو اُن کی تمام زندگی میں مفید ثابت ہوں۔تعلیم چال چلن کی تربیت کے لیے دی جاتی ہے اور چال چلن کی بنیاد عادات ہیں۔

۳۔اچھی عادتوں کا فائدہ

تعلیم میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہم نظامِ عصبی کو دشمن کے بجائے اپنا دوست بنائیں یا دوسرے لفظوں میں اپنی قابلیتوں اور استعدادوں کو جمع کریں اور اُن کے بھروسے پر آرام کی زندگی بسر کریں۔اس مقصد کے لیے جتنی جلدی ہو سکے، اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ مفید کاموں کا عادی بنانا چاہیے اور اس بات کی بڑی احتیاط کرنی

چاہیے کہ ہم ایسی عادتوں سے بچیں، جن کے نقصان دہ ثابت ہونے کا اندیشہ ہو۔ جس قدر ہم اپنی روزانہ زندگی کی تفصیلات کو خود بخود انجام پانے کا عادی بنائیں گے، اُسی قدر ہمارے ذہن کے اعلیٰ قویٰ زیادہ آزادی کے ساتھ اپنے مخصوص فرائض کو پورا کرینگے۔ اُس سے زیادہ قابلِ رحم کوئی انسان نہیں ہوگا، جو کسی امر کے متعلق فیصلہ نہ کر سکنے کی عادت کے سوا اور کسی بات کا عادی نہیں اور جس کے لیے ہر سگرٹ کا جلانا، ہر پیالے کا پینا، ہر روز جاگنا اور سونا اور ہر چھوٹے سے چھوٹے کام کا شروع کرنا اختیاری تأمّل کا موضوع بن جاتا ہے۔ ایسے آدمی کا آدھا وقت اُن اُمور کے متعلق فیصلہ کرنے یا پچھتانے میں گزر جاتا ہے، جن کا اس طرح عادی ہونا چاہیے کہ شعوری اور عملی طور پر ہمیں اُن کے وجود کا احساس تک بھی نہ ہو۔ اگر قارئین میں سے بعض حضرات ایسے ہیں، جو اپنے روزانہ فرائض کو باقاعدگی کے ساتھ انجام دینے کے عادی نہیں، اُنھیں چاہیے کہ وُہ اسی وقت اس بات کی طرف متوجّہ ہوں۔

۴۔ "عادت" کے اصول

پروفیسر بین (Bain) نے "اخلاقی عادات" کے عنوان کے تحت قابلِ تعریف عملی نکتے بیان کیے ہیں اور مسئلۂ زیرِ بحث کے متعلّق چند بہت بڑے اصول اخذ کیے ہیں:۔

(۱) پہلا اصول: "کسی نئی عادت کے اختیار کرنے یا کسی پُرانی عادت کے چھوڑنے میں ہمیں اس بات کی احتیاط کرنی چاہیے، کہ جہاں تک ہو سکے، ہمارا اقدام مضبوط اور فیصلہ کُن ہو"۔ اُن تمام ممکن

حالات پر قابو پالینا چاہیے، جو صحیح مقاصد کی تائید کریں۔ اپنے آپ کو تن دہی کے ساتھ اُس ماحول کے حوالے کر دینا چاہیے، جو نئی عادت کے لیے حوصلہ افزا ہو۔ ایسے مشاغل اختیار کرنے چاہییں، جو پُرانی عادت کے موافق نہ ہوں۔ اگر حالات اجازت دیں، تو علی الاعلان حلف اُٹھانا چاہیے۔ مختصر یہ کہ اپنے ارادے کو ہر ممکن ذریعے سے تقویت پہنچانی چاہیے۔ یہ تمام باتیں نئی "عادت" کو اتنا مضبوط کر دینگی کہ اسے ترک کرنے کا خیال اتنی جلدی پیدا نہیں ہوگا، جتنا اُن کی عدم موجودگی میں؛ اور اس خیال کے روزانہ التوا کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نئی عادت کے چھوٹنے کے امکانات روز بروز کم ہوتے چلے جائیں گے۔

بہت عرصہ ہُوا آسٹریا کے ایک اخبار میں کسی آدمی کی طرف سے یہ اعلان شائع ہوا تھا کہ "جو شخص آج کے بعد مجھے شراب کی فُلاں دکان پر دیکھے گا، اُسے مَیں اتنی رقم انعام کے طور پر دونگا۔ مَیں یہ اعلان ایک وعدے کی بنا پر کر رہا ہوں، جو مَیں نے اپنی بیوی کے ساتھ کیا ہے۔" پُرانی عادت کو چھوڑنے اور نئی عادت اختیار کرنے کا یہ طریقہ نہایت مفید ہے۔

(۲) دُوسرا اصول: "جب تک نئی عادت مضبوطی کے ساتھ جڑیں نہ پکڑے، کسی بات کو اس کے تواتر میں خلل انداز نہ ہونے دیا جائے۔ اس بارے میں معمولی سی چُوک بھی خطرناک ثابت ہوگی۔" اس کی مثال اُس گیند کی مانند ہوگی، جس پر کوئی شخص دھاگا لپیٹ رہا ہو۔ ایک دفعہ ہاتھ سے نکل جانے میں اس کے اتنے بل کُھل جائیں گے، جن کی کمی کئی مرتبہ لپیٹنے کے بعد بھی پوری نہیں ہو سکیگی۔ کسی بات کے سیکھنے میں تسلسل کو قائم رکھنا نظامِ عصبی سے صحیح طور پر کام لینے کا بہت بڑا ذریعہ ہے، جیسا کہ پروفیسر بین نے کہا ہے :-

"علمی استعدادوں کے برخلاف اخلاقی عادتوں کی یہ خصوصیت ہے کہ ان میں دو مخالف طاقتیں موجود ہوتی ہیں، جن میں سے آہستہ آہستہ ایک کو دوسری پر فتحیاب کرنا ہمارا فرض ہے۔ ایسے موقع پر سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ہم ہار نہ مانیں۔ کیونکہ "غلط طاقت" کی ہر فتح "صحیح طاقت" کی بے شمار فتوحات کے اثر کو زائل کر دیتی ہے۔ ایک نہایت اہم احتیاط یہ ہے کہ دونوں مخالف طاقتوں کو اس طرح منظم کیا جائے کہ "صحیح طاقت" مسلسل طور پر کامیاب ثابت ہوتی رہے۔ یہاں تک کہ کثرت تکرار اسے ہر حالت میں "غلط طاقت" کا مقابلہ کرنے کے قابل بنادے۔ نظری طور پر یہ ذہنی ترقی کا بہترین طریقہ ہے۔"

(۳) تیسرا اصول: "جس وقت بھی دل میں کوئی نیا ارادہ یا نئی عادت کے متعلق جذباتی تحریک پیدا ہو، ایک لمحہ ضائع کیے بغیر فوراً اُس پر عمل کرنا شروع کر دیا جائے۔" یعنی ع

جو کرنا ہے کر، آج، اس وقت، ابھی!

دماغ کو نئے ماحول سے روشناس کرنے کے لیے دل میں صرف ارادوں اور امنگوں کا پیدا کرنا ہی ضروری نہیں، بلکہ اُن کا "حرکی اثرات" کی صورت میں ظاہر ہونا یا دوسرے لفظوں میں اُنھیں عملی جامہ پہنانا سب سے ضروری ہے۔

خواہ کسی کے پاس ان اصولوں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہو اور اُس کے دلی جذبات بھی ان کی تائید کرتے ہوں، لیکن جب تک وہ ان پر عمل کرنے کے ہر ممکن موقع سے فائدہ نہیں اٹھائیگا، اُس کی "سیرت" میں کوئی بہتر تبدیلی پیدا نہیں ہوگی۔ مشہور روایت ہے

"نیک ارادے دوزخ کی شاہراہ ہیں، جو اصول مَیں نے بیان کیے ہیں، اُن سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ بقول جے ایس ملِ (J. S. Mills) "سیرت ارادے کی تکمیل کا نام ہے۔" اور اُس کے نزدیک ارادہ اُن رجحانات کا مجموعہ ہے، جو ہمیں زندگی کے تمام نازک اور اہم لمحات میں استقلال، سرعت اور تعیّن کے ساتھ کام کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اعمال میں جس قدر تواتر اور تسلسل ہوگا، اُسی قدر جلد وُہ ہماری "سیرت" کا جزو بنتے جائیں گے اور ہمارا دماغ اُن کا عادی ہو جائیگا۔ کسی اچھے ارادے یا کسی عمدہ جذبے کی جھلک کو اُس سے عملی فائدہ حاصل کیے بغیر بے توجہی کی نذر کر دینا ایک اچھے موقع کو ہاتھ سے کھو دینے سے بھی بُرا ہے۔ کیونکہ یہ آئندہ ارادوں اور جذبوں کو بھی عملی صورت اختیار کرنے سے محروم رکھے گا۔ اُس بے حوصلہ، جذبات زدہ اور خیال پرست آدمی سے زیادہ نفرت انگیز انسانی سیرت کی مثال اور کیا ہوگی، جو احساسات کے سمندر میں بے بس ہو کر بہ رہا ہے اور مردانہ وار کام نہیں کرتا۔

(۴) چوتھا اصول: "شاگردوں کو حد سے زیادہ نصیحتیں نہ کرو اور چکنی چپڑی باتوں سے پرہیز کرو۔" اس کے بجائے عملی موقعوں کا انتظار کرو اور جو موقعے نظر سے گزریں، اُن سے فوراً فائدہ اُٹھاؤ اور اس طرح اپنے شاگردوں کو بیک وقت فکر، احساس اور عمل کا عادی بناؤ۔ اعمال "سیرت" کو نئی زندگی بخشتے ہیں اور اچھی عادتوں کو مستحکم کرتے ہیں۔ اس کے برعکس زیادہ نصیحتیں اور باتیں جلد بے اثر اور صبر آزما ہو جایا کرتی ہیں۔

۵- ڈارون (Darwin) کی مثال

ڈارون کی مختصر خودنوشتہ سوانح عمری میں ایک پیراگراف ہے، جس کا اکثر

ذکر کیا جاتا ہے اور چونکہ یہ موجودہ موضوع کے نقطۂ نظر سے اہم ہے اسلیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی اسے نقل کیا جائے۔ ڈارون لکھتا ہے :۔

"تیس سال یا اس سے زیادہ عمر تک مَیں کئی قسم کی شاعری سے محظوظ ہوتا رہا اور اسکول کے زمانے ہی میں شیکسپیئر کی تصنیفات خصوصًا اُس کے تاریخی ڈراموں میں بڑی دلچسپی لیتا تھا۔ مصوّری سے کافی حد تک اور موسیقی سے بہت زیادہ لذّت اُٹھاتا رہا ہوں، لیکن اب کئی سال سے میں ایک شعر بھی نہیں پڑھ سکتا۔ مَیں نے شیکسپیئر پڑھنے کی بہت کوشش کی، لیکن اس کی تصنیفات میرے لیے ناقابلِ برداشت طور پر خشک اور غیر دلچسپ ثابت ہوئیں۔ طبیعت بہت بدمزہ ہُوئی۔ اب مجھ میں مصوّری اور موسیقی کا مذاق بھی نہیں رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا ذہن ایک مشین بن کر رہ گیا ہے، جس کا کام بے شمار حقائق سے کلّیہ قاعدے مرتب کرنا ہے، لیکن یہ بات نہیں سمجھ سکا کہ میرے دماغ کا وہی حصّہ کیوں ماؤف ہوگیا ہے، جو اعلیٰ اور لطیف حظوظ سے تعلق رکھتا ہے۔ اگر میرے لیے گزشتہ زندگی کو ازسرِ نو بسر کرنا ممکن ہوسکتا، تو مَیں ہفتے میں کم ازکم ایک بار راگ سُننے اور شعر پڑھنے کو اپنا وظیفۂ زندگی بنا لیتا تاکہ دماغ کے خوابیدہ حصّے دوبارہ بیدار ہو جاتے۔ ان حظوظ کا ناقابل تلافی فقدان زندگی کی مسرّتوں سے محرومی ہے اور ممکن ہے کہ فطرتِ انسانی کے جذباتی عنصر کی یہ کمی ذہن کیلیے

اور اس سے بھی زیادہ اخلاق کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگا۔

چھوٹی عمر میں ہم وُہ سب کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں، جو انسان کی تکمیل کیلیے ضروری ہے۔ ہمیں شاعری، مصوّری اور موسیقی سے لطف اندوز ہونے اور روحانی و مذہبی خیالات سے رُوشناس ہونے کی خواہش اور اُمید ہوتی ہے۔ یہانتک کہ اپنے زمانے کے اعلیٰ فلسفیانہ افکار کو بھی ہم اپنے مذاق کی حدود کے اندر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جوانی میں ہم یہ سب کچھ کرتے ہیں، لیکن ادھیڑ عمر میں جاکر کتنے مردوں اور عورتوں کی یہ دلی خواہش اور اُمّید پوری ہوتی ہے؟ یقیناً بہت کم لوگوں کی یہ آرزو پوری ہوتی ہے! اور اس کے ذمّے دار "عادت" کے اصول ہیں۔ ہر شخص میں مناسب وقت پر ان میں سے کسی چیز کے متعلق خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اگر اس کی غذا کے طور پر مناسب اور متواتر مواد مہیّا نہ کیا جائے، تو یہ ایک طاقتور اور اہم "عادت" کی صورت اختیار کرنے کے بجائے بیکار ہو جاتی ہے اور آخر وہ حریف خواہش جن کو ہم روزانہ خوراک پہنچاتے ہیں، اُسے فنا کر دیتی ہیں۔ اسی طرح کسی خواہش کی تکمیل کی عملی شرائط سے بیگانہ ہو جانے سے انسان کی حالت آہستہ آہستہ ڈاروِن کی سی ہو جاتی ہے۔ کہنے کو تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "مَیں شاعری سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں۔ مجھے اس بات کی پوری آرزو ہے کہ موسیقی کے مذاق کو زندہ رکھوں۔ ایسی کتابیں پڑھوں، جو تازہ ترین افکار و خیالات پر روشنی ڈالیں اور روحانی قوتوں کو بیدار کریں۔" لیکن ہم ان باتوں پر عمل پیرا نہیں ہوتے اور یہ کام "آج" شروع نہیں کرتے۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ ہر وہ اچھی چیز جو حاصل کرنے کے قابل ہے، روزانہ کوشش ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ہم آج کا کام کل پر چھوڑتے چلے جاتے ہیں،

یہاں تک کہ وہ جی لبھانے والے امکانات مفقود ہو جاتے ہیں۔ اس کے خلاف اگر ہم دن میں دس منٹ شاعری، روحانی مطالعہ یا تفکّر کے لیے اور ہفتے میں ایک یا دو گھنٹے موسیقی، مصوّری یا فلسفے کے لیے مقرر کر دیں، بشرطیکہ ہم "ابھی سے شروع کرنے" کے قائل ہوں اور درمیان میں کوئی وقفہ نہ آنے دیں، تو یقیناً مناسب وقت میں یہ سب کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ ہم ضروری محنت اور لگاتار مشق کو نظر انداز کر کے اعلیٰ امکانات کی قبر کھود لیتے ہیں۔ یہ ضروری بات ہے۔ استادوں کو چاہیے کہ اپنے ہونہار شاگردوں کو وقت پر اس حقیقت سے آگاہ کر دیں کہ انسان کا مستقبل اس بات پر منحصر ہے کہ اُس کے قویٰ کو روزانہ غذا ملتی ہے یا نہیں؟

(۵) پانچواں اصول۔ "کسی معاوضے کی توقع کے بغیر تھوڑی بہت روزانہ مشق کے ذریعے اپنی قوتِ عمل کو زندہ رکھو۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی اور معمولی معمولی باتوں میں بھی ہمّت اور باقاعدگی سے کام لو۔ ہر روز کوئی نہ کوئی کام صرف اس لیے کرو کہ آئندہ ضرورت کے وقت وہی کام کرنے میں آسانی ہو اور آزمائش کے موقع پر گھبراہٹ اور مایوسی کے عالم میں یہ نہ کہنا پڑے۔ ع

"مری ناتجربہ کاری، مری ناتجربہ کاری!"

اس قسم کی ریاضت اُس روپے کی مانند ہے، جو ہم اپنے سامان اور مکان کا بیمہ کرانے پر صرف کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ رقم ہمیں کوئی فوری فائدہ نہیں پہنچا سکتی اور بہت ممکن ہے کہ کبھی کوئی فائدہ نہ پہنچائے۔ لیکن اگر مکان میں آگ لگ جائے، تو یہی رقم اُسے تباہی سے نجات دلانے کی ضامن ہو گی۔ یہی مثال اُس آدمی کی ہے، جو ہر روز کچھ نہ کچھ کر کے اپنے آپ کو ان تھک توجّہ، اٹل ارادے اور دل لگا کر کام کرنے کا عادی بنا

لیتا ہے۔ جب قرب وجوار کی ہر چیز متزلزل ہوگی اور جذبات زدہ لوگ اس طرح بے بس ہونگے، جیسے ہوا میں روئی کے گالے، اُس وقت یہ شخص چٹان کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہے گا۔

۶۔ ایک اعتراض کا جواب

مجھ پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ عادت کے موضوع کے تحت میں ہم نے پُرانی عادتوں کے دوبارہ ظاہر ہونے کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ اس نظریے کی رُو سے نئی عادتیں ڈالنا اور کسی فوری اصلاح یا تبدیلی کا واقع ہونا ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ کبھی کبھی فوری تبدیلیاں بھی رُونما ہوتی رہتی ہیں اور مَیں نے جو عام اصول پیش کیے ہیں، وہ انسانی "سیرت" کی بڑی سے بڑی فوری تبدیلی کے امکان کی بھی عین تائید کرتے ہیں۔ میں صاف طور پر کہہ چکا ہوں کہ نئی عادتیں ڈالی جاسکتی ہیں۔ بشرطیکہ نئے محرّکات اور نئے اسباب موجود ہوں اور زندگی میں ان کی کمی نہیں۔ بعض دفعہ تو یہ اس قدر اہم اور انقلاب انگیز ثابت ہوتے ہیں کہ اُن تمام معیاروں کو یکسر بدل کر رکھ دیتے ہیں، جن سے بُری اور اچھی چیزیں تمیز کی جاسکتی ہے اور انسان کے خیالات کی دُنیا میں ہلچل ڈال دیتے ہیں۔ ان حالتوں میں عادات کے پُرانے نظام کو سخت صدمہ پہنچتا ہے اور اگر نئے محرکات دیرپا ثابت ہوں، تو نئی عادتیں ظہور پذیر ہوکر طبیعت میں نئے رجحانات کی بنیاد رکھ دیتی ہیں۔

نفسیاتی حالات کا جسمانی مطالعہ بھی اس بات میں اخلاقیات کا ہمنوا ہے کہ وُہ دوزخ جس کا ذکر مذہب میں ہے، اس دوزخ سے یقیناً بدتر نہیں ہوگا، جو ہم اپنی سیرتوں کو غلط سانچوں میں ڈھال کر اس دنیا میں اپنے لیے آپ تیار کرتے ہیں۔ اگر چھوٹی عمر

ہی میں اس بات کا احساس ہو جائے کہ بہت جلد انسان عادتوں کا چلتا پھرتا پتلا بن جاتا ہے، تو اس کم عمری کے زمانے ہی میں "سیرت" کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ ہم اپنی خوش قسمتی یا بدبختی کے خود ذمے دار ہیں۔ نیکی یا برائی کا معمولی سے معمولی کام بھی اپنا مستقل اثر چھوڑ جاتا ہے۔ اپنی ہر تازہ غلطی پر یہ کہہ کر خاموش ہو جانا کہ "میں آئندہ ایسا نہیں کروں گا" کافی نہیں۔ ہم "ایسا کریں یا نہ کریں" اور ممکن ہے کہ قادرِ مطلق بھی "ایسا نہ ہونے دے"۔ لیکن "ایسا ہوتا رہیگا"۔ کیونکہ ایک دفعہ "ایسا ہو چکا ہے"۔ اس کے اثرات ہمارے اعصاب کی گہرائیوں میں محفوظ رہیں گے اور آئندہ آزمائش کے وقت ہمارے خلاف استعمال کیے جائیں گے۔ مختصر یہ کہ جو غلطی ہم ایک دفعہ کر بیٹھتے ہیں، صحیح معنوں میں اس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔

۷۔ تصویر کے دو پہلو

اس تصویر کے اچھے اور برے دونوں رُخ ہیں، جیسے آہستہ آہستہ شراب پینے سے انسان مستقل شرابی بن جاتا ہے، اسی طرح تھوڑا تھوڑا کام کر کے اخلاقی طور پر وُہ نہایت پارسا اور عملی و علمی نقطہ ہائے نظر سے بہت تجربہ کار اور معتبر شخصیت بن سکتا ہے۔ کسی نوجوان کو کسی قسم کی تعلیم حاصل کرنے کے دوران میں پریشانی کا بالکل اظہار نہیں کرنا چاہیے۔ اگر وہ اس کی تحصیل کے لیے ہر روز ایمانداری سے کام کرتا رہا ہے، تو اُسے انجامِ کار کے متعلق بے فکر ہو جانا چاہیے۔ وہ پورے یقین اور اطمینان کے ساتھ اُس صبح کا انتظار کر سکتا ہے، جب وُہ بیدار ہوتے ہی اپنے آپ کو اُس میں ماہرِ فن پائیگا، جس میں وُہ مہارت حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ تحصیل کے دوران میں اس فن سے متعلقہ

اشیا اور امور کو جانچنے کی قوت خاموشی کے ساتھ اپنا کام کرتی رہتی ہے اور اُس کے اندر معلومات کا ایک ایسا ذخیرہ جمع کر دیتی ہے، جسے دنیا کی کوئی طاقت چھین نہیں سکتی۔

نوجوانوں پر شروع ہی میں یہ بات واضح کر دینی چاہیے۔ بہت سے اولوالعزم اور بلند ہمت نوجوانوں کی ناکامی اور مایوسی کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ وُہ اس راز کو نہیں جانتے۔

[ماخوذ از "ولیم جیمز"]

تربیتِ اطفال

از

سردار موہن سنگھ ایم اے، ہیڈ ماسٹر خالصہ ہائی اسکول، پٹیالہ

والدین کے سر پر بچوں کی ابتدائی تعلیم و تربیت کا اچھا خاصہ بوجھ پڑتا ہے۔ بچے پہلے پانچ سال میں کم و بیش کورے کاغذ کی مانند ہوتے ہیں اور ان پر ہر نقش کھینچا جاسکتا ہے۔ اس عمر میں بچے ماحول سے بہت جلد متاثر ہوتے ہیں۔ حال کی تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ جو اہمیت بچے کے پہلے پانچ چھے سال کی تربیت کی ہوتی ہے، وہ مابعد کی بیس سال کی تعلیم کی بھی نہیں ہوتی۔ اگر پہلے پانچ چھے سال میں تربیت اچھی ہوئی ہو، تو بچہ خوش خلق، ہونہار، نیک اور لائق ہوگا، ورنہ اس کا نقطۂ نگاہ ایسا ہو جائیگا جس سے اس کو اور سوسائٹی کو ان اہم مشکلات کا سامنا کرنا پڑیگا، جن کا ایک حل جیل خانہ ہے۔

ان پہلے پانچ سال میں والدین ہی اُستاد کے قائم مقام ہوتے ہیں۔ انگلستان اور دوسرے ملکوں میں چھوٹے بچوں کیلیے بھی اسکول ہیں۔ جن میں چھوٹے بچوں کی نگہداشت اور تربیت ہوتی ہے۔ مگر عام طور پر شہروں میں بچوں کی دنیا گھر تک محدود رہتی ہے، اس لیے یہ فرض ماں باپ پر ہوتا ہے کہ بچوں کے اندر سوچنے، محسوس کرنے اور کام کرنے کی اچھی عادات پیدا کریں۔

اعتماد کی ضرورت بچے کو سب سے بڑی ضرورت اعتماد کی ہے۔ اس کو یقین ہونا چاہیے کہ ماں باپ اسے پیار کرتے ہیں اور اس کی مشکلات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں

اور اُن کے تحمل میں فرق نہیں آتا۔ بچّوں سے یہ کہا جائے کہ اگر تم فلاں کام کروگے، تو تمھارے ماں باپ تمھیں پیار نہیں کرینگے یا اگر تم شرارت کروگے، تو تم کو اسکول بھیج دینگے۔ ایسی باتوں کا بچّے کے دماغ پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ماں باپ آپس میں لڑتے رہتے ہیں اور غصّے کا غبار بچّے پر نکلتا ہے۔ ایسی حالت میں بچّہ بڑی کشمکش میں پڑجاتا ہے کہ کس کا ساتھ دے۔ ذیل کی مثال ملاحظہ ہو۔

زید آٹھ برس کا اکلوتا بچّہ ہے۔ ماں باپ میں تقریبًا شروع ہی سے اَن بَن چلی آتی ہے۔ صبح شام لڑتے گزرتی ہے۔ پیدائش ہی سے ماں کا سارا دھیان زید کی طرف رہا ہے اور وُہ اس کی حد سے زیادہ نگہبانی کرتی ہے اور اُسے گلی میں بھی باہر جانے نہیں دیتی۔ جب باپ گھر آتا ہے، تو اُس کو کہتی ہے کہ تم بچّے کی ذرا پروا نہیں کرتے اور نہ اس کو پیار کرتے ہو۔ ماں کا مطلب شاید یہ ہو کہ بچّے کے دل میں باپ سے نفرت پیدا ہو جائے۔ مگر زید باپ کی دل سے تعظیم کرتا ہے، کیونکہ وہ قدآور اور مضبوط ہے اور کئی ایسے کام کرسکتا ہے، جو اس سے اور اس کی ماں سے نہیں بن پڑتے۔ مگر بچّے کی تربیت اس طرح ہوتی ہے کہ اس کا ماں کے بغیر ایک دم بھی گزارہ نہیں ہوسکتا۔ اس کشاکش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچّے کی نیند میں خلل واقع ہوتا ہے اور اُسے بولنے میں لکنت پڑتی ہے۔ وُہ بدمزاج ہے اور روٹھ کر کھانا کھانے سے انکار کرتا ہے۔ اس بچّے کی ذہنی صحت کے لیے یہ امر نہایت ضروری ہے کہ اس کی ماں اس کا زیادہ خیال نہ رکھے اور ماں باپ کے درمیان یکجہتی پیدا ہو جائے۔

گھر میں بیشتر ایسا اتفاق بھی ہوتا ہے کہ ماں باپ اکثر چھوٹے بچّوں کی زیادہ طرفداری کرتے ہیں۔ ایک کی زیادہ تعریف ہوتی ہے اور دوسروں کو موقع بےموقع بُرا بھلا کہا جاتا ہے۔ ہر موقع و محل پر اُن کا باہمی مقابلہ کیا جاتا ہے۔ بار بار ایک کی نکتہ چینی اور عیب جوئی کیجاتی ہے

اور دوسرے کی مدح سرائی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس بچّے کو ہر وقت بُرا بھلا کہا جاتا ہے،
اُس کو اپنی ذات پر بھروسہ نہیں رہتا اور اُس کے دل میں ماں باپ کی طرف سے اپنے
حق میں محبّت کا احساس کم ہو جاتا ہے اور وُہ اپنے آپ کو بہتر بنانے کی کوشش
چھوڑ دیتا ہے۔

بچّوں کی شخصیت | بچّوں کی دوسری ضرورت یہ ہوتی ہے کہ ان کی شخصیت کی
قدر کی جائے، کیونکہ ماں باپ کی طرح بچّوں کی بھی جداگانہ ہستی ہوتی ہے اور خدائے
تعالیٰ نے اُن کو کسی خاص مقصد کے پورا کرنے کے لیے پیدا کیا ہوتا ہے۔ ہم نے اکثر
والدین سے سُنا ہے کہ ہم اپنے بچّوں کو ڈاکٹر بنائیں گے۔ اگر بچّے کی اپنی طبیعت شعرو
شاعری کی طرف لگتی ہو، تو اُس کو سختی سے منع کیا جاتا ہے کہ ایسی باتوں میں وقت
ضائع مت کرو۔ سر والٹر سکاٹ پر اگر اُن کے باپ کا بس چلتا، تو وُہ وکیل ہو گئے ہوتے،
مگر خیر گزری کہ وُہ بچ نکلے اور لاکھوں کروڑوں آدمیوں نے اُن کی تصنیفات سے حظ اُٹھایا۔

کئی دفعہ باپ کو جب اپنے ارادے میں کامیابی نہیں ہوتی، تو وُہ اس بات پر
زور دیتا ہے کہ بچّے کو فُلاں کام سکھاؤں گا۔ ہم نے اکثر سُنا ہے کہ والد صاحب فرماتے ہیں
کہ ہم اپنے بچّوں کو انجنیر بنائیں گے۔ چنانچہ اسی وقت سے اُس کی ریاضی کی تعلیم کا خاص
خیال رکھا جاتا ہے۔ اگر خدا نخواستہ بچّہ حساب میں ذرا کمزور رہا، تو والد بزرگوار ٹھنڈی
آہ کے ساتھ فرماتے ہیں کہ افسوس ہمارا بچّہ نالائق نکلا۔ شروع شروع میں بچّوں کی لیاقت
مخفی ہوتی ہے۔ اگر ضرورت ہو، تو تین سال کی عمر کے بعد خاص امتحان ذہنی Mental Tests
کے ذریعے یہ بات ممکن ہے کہ ان کی لیاقت اور رجحانِ طبیعت کا اندازہ لگایا جا سکے،
بلکہ لائق والدین سے ہم سفارش کرینگے کہ وُہ اپنے بچّوں کا ذہنی امتحان کرایا کریں۔

یہ ہم مانتے ہیں کہ اس بات کا ہندوستان میں رواج نہیں اور نہ ہی فی الحال ماہرین علم النفس دستیاب ہو سکتے ہیں، جو واجبی قیمت پر اس بات کا امتحان لے کر نتائج سے مطلع کریں۔ مگر انتظام کیا جا رہا ہے کہ کم از کم پنجاب میں ایسے امتحانوں کیلیے ایک مرکز قائم کیا جائے، جس سے عوام فائدہ اُٹھا سکیں۔ ایسے امتحانوں کا ایک نتیجہ یہ ہوا کرتا ہے کہ آپ کو معلوم ہو جائیگا آپ کے بچے کی طبیعت کا رجحان کس طرف ہے اور آئندہ کس کس ترقی کی اُس سے اُمید ہو سکتی ہے۔

والدین کے لیے سب سے مشکل کام یہ ہوتا ہے کہ وُہ بچے کی ذاتی استعداد کی نشو و نما میں اسی کے حامی و مددگار ہوں، تاکہ وُہ اتنا لائق و فائق آدمی بن سکے، جتنا کہ قدرت کو اسے بنانا منظور ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بچے کی آئندہ زندگی میں اس کی خوشی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ وُہ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ کیسے نباہ کر سکتا ہے اور یہ والدین کا فرض ہے کہ وُہ حتی الوسع بچے کی رہنمائی کرتے رہیں، تاکہ بچے کا طرز زندگی سماج میں شامل ہونے کے لیے موزوں ہو یا بچہ اپنے طبقے کے موافق آداب مجلسی سے واقف ہو جائے۔

اکثر دیکھنے کا اتفاق ہُوا ہے کہ بچہ روتا ہُوا گھر میں آیا کہ مجھے فلاں لڑکے نے مارا ہے۔ اب ماں باپ غیظ و غضب میں بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور جا کر اچھا خاصا میدانِ کارزار گرم کر دیتے ہیں۔ ایسے بچوں کو سکول میں اور آئندہ زندگی میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ بھی نہ سمجھ لینا چاہیے کہ بچے کی ہر ایک خواہش کا پورا کر دینا ہی ضروری ہے۔ ہر ایک ماں باپ کو بڑے غور و خوض سے یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ بچے کی کونسی خواہشات ناجائز ہیں اور کون سی جائز۔ اگر والدین بچوں کی جائز اور ناجائز خواہشات

کا صحیح توازن کر کے امر و نہی کا استعمال کرینگے، تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اُن کے احکام مدبّرانہ ہونگے۔

بعض ماں باپ غور و تدبیر سے ہدایات جاری نہیں کرتے، تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اگر آپ خوش ہیں، تو بچّوں کو جائز و ناجائز سب کچھ کرنے کی اجازت ہے اور اگر کسی وجہ سے بھرے بیٹھے ہیں، تو ذرا ذرا سی بات پر برسنے لگتے ہیں۔ عام طور پر بچّوں کو صرف اُنھیں چند باتوں سے منع کرنا چاہیے، جو واقعی نامعقول ہوں۔ اس طرح سے بچّہ تھوڑی سی دیر میں ان کے احکامات کی معقولیت کو تسلیم کرنے لگیگا اور اُس میں فرمانبرداری کا صحیح احساس پیدا ہو جائیگا۔

بچّوں کی خواہشات ہم بتا آئے ہیں کہ نہ تو بچّوں کی ہر بات ماننی چاہیے اور نہ ہی ذرا ذرا سی بات میں ٹوک جھوک کرنی چاہیے۔ کئی ایسی باتیں ہیں، جن کی بابت بچّے خود فیصلہ نہیں کر سکتے۔ جہاں سوال بچّوں کی صحت اور ان کی جان کی حفاظت یا دوسروں کی آسایش کا ہو، وہاں دخل دینے میں تاخیر نہ کرنی چاہیے۔ مثلاً بچّوں کو یہ فیصلہ کرنے کی ہرگز اجازت نہ ہونی چاہیے کہ سونے کے وقت کو ٹال دیں اور دیر تک جاگیں اور نہ ہی یہ کہ بچّہ اگر ڈاکٹر کے پاس جانے سے ضد کرے، تو اُس کی ضد کو مان لیں۔ علیٰ ہٰذا القیاس بچّوں کو ایسی سڑکوں پر جانے سے جہاں موٹروں کی آمد و رفت ہو یا ایسے کھیل سے جس میں جان کا خطرہ ہو، روکنا ماں باپ کا فرض ہے۔

بچّوں کو یہ سکھانا بھی ضروری ہے کہ وُہ دوسروں کی آسائش کا خیال رکھیں، مثلاً جب کوئی گھر میں بیمار ہو، تو ایسے نمونے بچّوں کے سامنے پیش کرتے رہیں کہ بچّوں کو قول و عمل سے یہ تعلیم ملتی رہے کہ بیمار کے پاس شور نہیں کرنا چاہیے اور ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کہ اس کے آرام میں فرق نہ آئے۔ ایسی باتوں کی تعلیم اگر بچّوں کو متانت اور سنجیدگی سے دی جائے، جس میں دھمکی اور سرزنش کا پہلو نہ ہو، تو اثر پذیر ہو کے رہتی ہے۔

بچّوں کو وجہ بھی بتا دیں والدین اور گھر کے اور آدمی بچّوں کی رہنمائی کے ذمّے دار ہوتے ہیں، لیکن جب وُہ اس قابل ہو جائیں کہ جو کچھ اُن سے کہا جائے، اُسے سمجھنے لگیں، تو اس صورت میں اگر بچّوں کو من مانی کرنے سے منع کیا جائے، تو حکم امتناعی کی وجہ بھی صاف صاف بتا دینی چاہیے۔ اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ وجہ بتاتے وقت غصّہ کا اظہار نہ ہو اور الفاظ سیدھے سادے ہوں، جو بچّوں کی سمجھ میں آ سکیں۔ جتنی مرتبہ بھی آپ حکم دیں، اتنی مرتبہ اس کی وجہ بھی دہرائیں۔ بچّوں کے لیے یہ دُہرانا نہایت ضروری ہے، جب آپ چاہیں کہ بچّے ٹین نہ کھٹکھٹائیں، تو کہو کہ اس سے تمھاری ماں کی نیند خراب ہوتی ہے یا ننھے میاں اپنا گڈّہ اندر رکھ دو، کیونکہ اگر رات کو مینہ آیا، تو تمھارے گڈّے کا رنگ خراب ہو جائیگا۔

اگر ماں باپ بچّوں کو ایک کام سے منع کرتے وقت کسی دوسرے کام کی طرف دلچسپی دلائیں، تو حکم ماننا بہت آسان ہو جاتا ہے، مثلاً بچّے کے ہاتھ میں ہتھوڑی ہے اور میز پر چوٹ لگانا چاہتا ہے، تو امّی جان کو فرمانا چاہیے۔ دیکھو بچّے میز پر کیل نہیں گاڑا کرتے، کیونکہ اس سے اس کا خوبصورت روغن خراب ہو جاتا ہے، مگر یہ لکڑی کا ٹکڑا لے لو اور اس پر جتنے کیل چاہو، گاڑ لو۔ یا جب قینچی سے کپڑا کاٹنے لگے، تو اس سے کہو۔ دیکھو اس کپڑے سے تمھارا کرتا بنے گا، مگر اس پٹاری میں کپڑوں کی کترنیں رکھی ہیں، ان میں سے جس پر چاہو مشق کر لو یا جب آپ چاہتے ہیں کہ بچّے دیواروں کو کوئلوں سے خراب نہ کریں، تو بچّوں کے لیے ایک بلیک بورڈ کسی دیوار پر لگوا دیں، جس پر وہ جب جی چاہے لکھ سکیں۔

بچّہ چھوٹی عمر میں بہت نازک طبع ہوتا ہے اور جلد اثر قبول کر لیتا ہے۔ آپ جس سانچے میں اُسے ڈھالنا چاہیں، آسانی سے ڈھل جاتا ہے، اس لیے والدین کو بڑی احتیاط سے خیال رکھنا چاہیے کہ وُہ بچّے کی اس قبولیت کا ناجائز فائدہ نہ اُٹھائیں، بلکہ جس طرح قدرت کو

منظور ہے اور جہاں تک ممکن ہے، اُس کی نشوونما ہونے دیں۔ بچّے گھر کی فضا کی زینت ہیں، ہم کو اُنھیں اپنی غرض کا غلام نہیں بنانا چاہیے۔

والدین کی آسانی یا بچّے کا فائدہ والدین اپنے بچّوں کی اکثر ضروریات سے زیادہ رہنمائی کرتے ہیں۔ ہمیشہ کہا جاتا ہے۔ دیکھو، ایسا مت کرو۔ شریف بچّے یہ کام نہیں کرتے۔ اصل بات یہ ہے کہ ماں باپ اپنے ذہن میں ایک تصویر بنا لیتے ہیں کہ اگر ہمارا بچہ ہمارے لیے باعثِ فخر ہو، تو اُس کی شکل و شباہت اُس کی روش و کردار اور اُس کی خصلت اور لیاقت یہ ہونی چاہیے اور پھر سارا زور اپنی خیالی تصویر کے کھینچے جانے پر لگا دیتے ہیں اور اس بات کی مطلق پروا نہیں کرتے کہ اس شوق کے پورا کرنے میں، ہم بچّے کی کونسی استعداد کے نقوش کو مٹا رہے ہیں۔ شروع شروع میں تو بچّے کی مدد اور رہنمائی کی ضرورت بہت ہوتی ہے۔ اس کو صفائی کے متعلق بہت کچھ سیکھنا پڑتا ہے۔ کپڑے پہننے کے لیے بھی وہ اوروں کا محتاج ہے۔ اپنے کھلونے وغیرہ بھی قرینے سے نہیں رکھ سکتا۔ مگر چاہیے کہ ہم اپنے بچّے کو اس کے کام کرنے میں اس خوبصورتی سے مدد دیں کہ وُہ خود بخود صاف رہنا، کپڑے سنبھالنا اور کھلونوں کو قرینے سے رکھنا سیکھ جائے۔ آہستہ آہستہ ان سب باتوں کا ذمہ خود اس کے سر پر ہو جائے۔ بچّہ اس اظہار سے خوش ہوتا ہے کہ اب مَیں بڑا ہو گیا ہوں اور اپنے کپڑے خود پہن سکتا ہوں۔ اپنی چیزیں خود لے سکتا ہوں اور پھر ان کو اپنی جگہ پر رکھ سکتا ہوں اور اپنی بڑھتی ہوئی قابلیتوں کو دیکھ کر شادماں ہوتا ہے اور خودداری کا موقع پا کر پھولا نہیں سماتا۔ شروع شروع سے ہی اس کو ایسے فیصلے کرنے کا عادی بنا دینا چاہیے کہ آج تم رنگین کرتہ پہنو گے یا سفید، یا آج ہم رنگدار تصویر بنائیں گے۔ ہمیں فرش کو صاف اور بیداغ رکھنے کے لیے کیا کرنا چاہیے۔

بچّے کی ان طفلانہ دقّتوں کا حل اس کے لواحقین نہ کریں، بلکہ بچّے کو خود ان کے فیصلے کا موقع دیں، تو اس کو ذمّے داری کا احساس ہوتا رہیگا اور وُہ اپنے معاملات میں اپنی عقل کا استعمال کریگا۔ زندگی میں بچّے کو ایسے فیصلے کرنے کے بہت سے موقعے ملنے چاہییں۔ اسی کا نام تعلیم ہے اور اسی سے ذمّے داری کا وہ مادہ پیدا ہوتا ہے، جس کی کمی کا احساس ہم پنجابیوں کو زندگی میں اکثر ہوتا ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت ہی نہیں کہ ایسی ذمّے داریوں کا احساس آہستہ آہستہ ہونا چاہیے اور بڑی سوچ بچار کے بعد بچّے کو ایسی ذمّے داری بالکل نہ دینی چاہیے۔ جو اس کے برتنے سے باہر ہو اور نہ ہی اس کی طاقتوں کا غلط توازن کرنا چاہیے۔

والدین کی تکلیف یہ تو ہم مانتے ہیں کہ اس قسم کا طریقہ تربیت، والدین کے لیے آرام دہ نہیں ہے۔ ان کو بہت زیادہ غور و فکر سے کام لینا ہوگا۔ بہت زیادہ متحمل رہنے کی ضرورت پیش آئیگی۔ یہ کہہ دینا تو آسان بات ہے کہ بس یہ ہمارا حکم ہے اور اس کی اطاعت تمھارا فرض۔ مشکل تو یہ ہے کہ بچّے کو سمجھا دیں کہ فلاں بات کرنے سے کیا ہرج ہے اور فلاں بات میں کیا فائدہ ہے اور حقیقت میں یہی مشکل اس کو بتدریج ہمارا ہم خیال بنا دیگی۔

اس عمل کے دوران میں بچّے کو عمل کی ضرورت ہو گی۔ اس لیے ماں باپ کو اپنی ضروریات اور مصروفیات کو فراموش کر کے تحمل اور صبر کے ساتھ بچّے کی ضروریات کا مطالعہ کرنا چاہیے اور جب بھی کوئی غلطی اس سے سرزد ہو، تو اس کے نقطۂ خیال کا احساس کرتے ہوئے بطور ہمدردی اسے غلطی سے آگاہ کرنا چاہیے، تاکہ جو نتیجہ ماں باپ اظہارِ عتاب یا استعمال چوب سے پیدا کرنا چاہتے ہیں، وہی نتیجہ بچّے کا ذہن خود پیدا کر سکے۔ مثلاً اگر بچّہ اُودھم مچائے کہ گھر میں اور کوئی کام ہو ہی نہ سکے، تو شروع شروع میں پہلے دو چار منٹ

کے رلیے اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کا سبق دیں۔ پھر آہستہ آہستہ اس نئی قابلیت کے استعمال کا وقفہ بتدریج بڑھاتے جائیں۔

برخلاف اس کے اگر باپ غصّے ہوتا ہے یا مارتا ہے، تو گویا وہ خود بے قابو ہوجاتا ہے اور مغلوب الغضب ہونے کا نمونہ بچے کے سامنے پیش کرتا ہے۔ بچّہ قدرتاً یہ سمجھیگا کہ اس بے قابو ہونے میں بزرگی ہے اور اگر شرارت سے درگزر بھی کرے، تو اُس کے دل میں یہ خیال گھر کرجائیگا کہ جب موقع ملے، دل کا غبار نکالے۔ اس کی بہت سی مثالیں ہمارے تجربے میں آئی ہیں۔ ایک والد بزرگوار جو بظاہر فارغ البال تھے، اپنے بچّے کو معمولی جیب خرچ سے بھی تنگ رکھتے تھے۔ ہم نے بچّے کے مُنہ سے ایک دن سُنا۔ "کوئی حرج نہیں، یہ تمام اثاثہ ایک دن ہمارے ہاتھ لگیگا، اُس وقت تمام کسریں نکال لیں گے۔"

یہ کہہ دینا تو آسان ہے، فلاں کام مت کرو۔ مگر وُہ کام نہ کیا جائے، تو کیا کیا جائے۔ اس کا جواب دینا ذرا مشکل ہے اور خاص کر جب یہ بھی مقصود ہو کہ دوسرا کام بے ضرر ہو، کیونکہ بچے نچلے نہیں بیٹھ سکتے۔ اگر جائز کام اُن کے رلیے موجود نہیں، تو شرارت کریں گے۔ بچّے کی آئندہ زندگی کے رلیے یہ نہایت ضروری ہے کہ وُہ شروع سے ہی اپنی ذمّے داری کی اہمیت کو سمجھنے لگے اور مختلف صورتوں میں سے ایسی صورتیں اختیار کرنے کا عادی ہو جائے کہ خود بھی زندہ رہے اور اوروں کو بھی زندہ رہنے دے۔ اس طرح آئندہ زندگی میں شہریت کا رکن اور سوسائٹی کی زینت ہو۔

ورنیکلر معلّمین اور اُردو ادب و انشا
کا
صحیح مذاق

از

محمد شریف ہیڈ ماسٹر مڈل سکول، بلھڑوال

ہمارے ورنیکلر مدارس میں "اُردو ادب و انشا" کی طرف سے جو افسوسناک غفلت پائی جاتی ہے اور روز بروز یہ ضروری مضمون مدرسین کے تغافل اور کم نگہی کا شکار ہو رہا ہے۔ اُس کا اندازہ اگر کرنا ہو، تو امتحان ورنیکلر فائنل کے پرچہ اُردو کے اگزامینر بن جائیے۔ اُمیدواروں کی تحریریں ایسے "معجزاتِ ادب" اور خوارق انشا آپ کے سامنے پیش کرینگی کہ آپ حیران ہو جائیں گے۔ یہی وُہ اُردو ہے، جس کی تعلیم متواتر آٹھ سال تک طالب علم حاصل کرتا رہا ہے۔

اگر صداقت کی تلخ نگاری کو گوارا کر لیا جائے، تو مَیں اپنے تجربے کی بنا پر یہ کہہ دینے کے لیے تیار ہوں کہ اگر محکمہ تعلیم اُردو پرچہ الف، پرچہ ب اور اُس کی جزئیات (نامکمل عبارت کی تکمیل، وحدت، جمع، تذکیر و تانیث، کہانی لکھنا، خطوط نویسی، مضمون نگاری اور نظم و نثر کی تسہیل مطالب وغیرہ) کو اُڑا دے اور ایک معمولی پرچہ دے کر صرف اس امر کا صحیح اندازہ لگایا جائے کہ آٹھ سالہ تعلیم نے طالب علم میں کس قدر اُردو ادب و انشا کا صحیح ذوق پیدا کیا ہے، تو نتیجے کے طور پر افسوس کی ایک آہ آپ کے مُنہ سے نکل جائیگی کہ

امیدوار نہ صحیح فقرات لکھ سکتا ہے، نہ اوسط درجے کی مشکل عبارت کو سمجھ سکتا ہے۔

مَیں بیس سال سے اُردو پڑھا رہا ہوں اور بہ حیثیت ہیڈ ماسٹر کے اپنے اسکول اور دیگر سنٹر کے طالب علموں کی قابلیت کو دیکھتا رہا ہوں۔ مَیں محسوس کرتا ہوں کہ اُردو ادب انشاء کا تنزل روز بروز بڑھتا جاتا ہے۔ ہمارے مڈل مدارس کا فارغ التحصیل طالب علم اپنے خیالات کو موزوں الفاظ میں ظاہر نہیں کر سکتا اور وہ ۸ سال کی تعلیم حاصل کر کے ۲ سال کے اس بچے سے زیادہ بے سمجھ نظر آ رہا ہے، جس نے کسی اسکول میں تعلیم نہیں پائی۔ جسے زبان کی باقاعدہ تعلیم نہیں دی گئی، محض تقلید سے اتنا ملکہ حاصل کر گیا ہے کہ اپنے خیالات کو بیان کر سکتا ہے اور اپنی خواہش کی تفسیر اپنے الفاظ میں کر لیتا ہے۔

معلوم ہوا کہ بچّہ ۲ سال تک جن اشخاص کی زبان کی تقلید کرتا رہا۔ وُہ اس زبان کا ذوق صحیح رکھتے تھے اور تقلید بچّے کا فطری خاصہ تھا، اس لیے اس کے الفاظ میں طاقت اور خیالات میں وسعت پیدا ہو گئی اور اُن کے اظہار میں اُس نے جھجک اور رکاوٹ محسوس نہ کی۔ لیکن برعکس اس کے اُردو کے طالب علم نے آٹھ سال تک جن اصحاب کی تقلید کی، وہ خود ذوق صحیح سے نا آشنا تھے۔ چونکہ معلمین کی اکثریت صحیح مذاق نہ رکھتی تھی، اس لیے طالب علموں کی اکثریت ان سے کیسے مؤثر نہ ہوتی؟

مَیں صحیح المذاق معلمین کی توہین نہیں کر رہا، مجھے ان کا احترام مقصود ہے۔ میں معلمین کی توہین کو نسل آئندہ کی توہین سمجھتا ہوں اور دل سے چاہتا ہوں کہ معلّم انسانی سماج میں کوئی رفیع درجہ اور وقیع پوزیشن حاصل کریں، لیکن حکم ہمیشہ اکثریت پر لگایا جاتا ہے اور مجھے کہنا پڑتا ہے کہ اُردو ادب و انشاء کے متعلق خود معلمین حضرات کا ذوق "بیگانۂ ادب" ہو چکا ہے۔ وہ خود اپنے خیالات کے اظہار پر قادر نہیں۔ تحریر اور تقریر ہر دو صورت میں وہ نیکلر

مدرسین کی ادبی بے مائگی ظاہر ہے۔ دراصل کسی فن کی کثرت اسے پیشہ بنا دیتی ہے اور وُہی فن آخرکار ذریعہ معاش ہو کر رہ جاتا ہے۔ معلمی ایک فن تھا، نہایت آسودہ اور پاکیزہ فن۔ اس کی کثرت نے اسے پیشہ بنا دیا اور ذریعۂ معاش بننے کی وجہ سے صحیح ذوقِ معلمی جاتا رہا۔ مدرسین نے امتحان میں ۳۳ فیصدی نمبر دلانا اپنا فرض سمجھ لیا ہے۔ اس ۳۳ فیصدی نے صحیح قابلیت کا ستیاناس کر دیا ہے اور تمام سال کچھ پڑھائے بغیر صرف تذکیر و تانیث، وحدت و جمع، عبارت کی تکمیل وغیرہ کی چند مشقیں ازبر کرانے کے بعد طالب علم کو اُردو کے امتحان میں پاس کرا دیا جاتا ہے۔

اُردو انشاء کے تنزل کے اسباب میں سب سے بڑی وجہ معلّمین کا عدمِ ذوق ہے اور جب ذوق ہی نہ ہو، تو وہ مطالعہ کیوں کریں۔ مدرسین نے مطالعہ ترک کر دیا اور تحریر و تقریر کی قابلیت سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

اُردو کی تحریری انشا کے متعلق مَیں یہ سطور معلمین کے لیے حوالۂ قلم کر رہا ہوں۔ اگر اُنھوں نے ان کا مطالعہ فرمانے کی زحمت گوارا فرمائی اور ادبِ اُردو کے صحیح ذوق کی تپش سے ناآشنا ہو گئے، تو اِن کے شاگرد ان سے مؤثر ہُوئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

تحریر کی اوّلین غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ ہم اپنے مافی الضمیر اور خیالات کی تصویر الفاظ کے ذریعے کھینچ سکیں کہ ہماری آواز قائم، خیالات ثابت اور مافی الضمیر ضبط ہو کر رہ جائے۔ کوئی شک نہیں کہ زبان اور عہدِ حاضرہ کی ایجادات مثلاً ٹیلیفون اور تار وغیرہ سے ہم اظہارِ خیالات کر سکتے ہیں لیکن وُہ لفظ قائم نہیں رہ سکتے۔ ادھر لفظ مُنہ سے نکلا، اُدھر ہوا میں منتشر ہو کر اُڑ گیا۔ برعکس اس کے قلم سے جو کچھ لکھا جائیگا۔ وُہ ثابت و قائم رہیگا اور اسی ثبات و قیام کو مدِّنظر رکھتے ہُوئے ضروری ہے کہ ہمارے الفاظ جذبات، خیالات کی صحیح

نمائندگی اور درست ترجمانی کریں۔ جس طرح خیالات میں روانی، سلاست اور تسلسل ہوتا ہے، تحریر میں بھی وہی رنگ پیدا ہو جائے۔

تحریر میں روانی مشق سے پیدا ہوتی ہے اور قلم کی جھجک متواتر سعی سے دور ہوتی ہے۔ جب ہم کسی زبان مثلاً فارسی یا انگریزی کے جملے کا ترجمہ اسی زبان میں کرتے ہیں، تو پہلے ذہن میں اسے اپنی مادری زبان اُردو میں منتقل کرتے ہیں۔ پھر اس مفہوم کو دوسری زبان کے الفاظ میں ادا کرتے ہیں۔ اور جب اس غیر زبان کی کافی مشق ہو جاتی ہے، تو پھر زبان اور قلم کی جھجک دور ہو جاتی ہے اور ہم بے تکلّف وُہ زبان بول اور لکھ سکتے ہیں۔

ہر لفظ دو صورتیں رکھتا ہے۔ ایک صورت مکتوبی اور دوسری اصلی یا ذہنی۔ مثلاً ہاتھی کا لفظ ہے۔ ہ، ا، تھ، ی حروف کی ترکیب سے جو صورت پیدا ہوتی ہے۔ یہ اس کی مکتوبی صورت ہے، لیکن لفظ ہاتھی کے پڑھنے سُننے یا دیکھنے اور لکھنے سے جو تصوّر، آواز اور مفہوم ہمارے ذہن میں پیدا ہوتا ہے، اسے لفظ کی صورتِ اصلی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہم اگر لکھتے وقت ہر لفظ کی صورتِ اصلی اور مکتوبی کو نگاہِ بصیرت سے دیکھیں، تو اس تحریر میں سراسر پُرلطف کیفیت پیدا ہوتی ہے، جس سے وہی دل و دماغ آشنا ہیں، جو ادب و انشاء کا کافی ذوق رکھتے ہیں اور جن کے قلم آزاد ہیں۔

اس کے علاوہ تحریر کی سلاست اور روانی کے لیے دلی توجہ، شغف اور ذہن کی ضرورت ہے، یعنی جو کچھ آپ لکھنا چاہیں، لکھتے وقت اس کی تصویر آپ کے سامنے ہو۔ ہر لفظ کی مکتوبی اور مفہومی صورت آپ کے مدِّ نظر رہے۔ آپ خط لکھ رہے ہیں، تو اس طرح کہ مکتوب الیہ گویا آپ کے پاس بیٹھا ہُوا ہے۔ ادیب اور حقیقی شاعر کا اندازہ آپ ان کے جواہراتِ کلام سے لگا سکتے ہیں۔ جو فقرات اور شعر ان کی توجہ قلب اور ذہنِ حاضر

سے نکلتے ہیں، ضرور ہے کہ وُہ دل میں اثر کریں اور جگر کے پار ہوجائیں۔ اسی حقیقت کو
ترجمانِ حقیقت ڈاکٹر اقبالؒ نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے ؎

بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

آپ جب مطالعہ کریں، تو ایک ایک لفظ پر غور کریں۔ یہ لفظ اس جگہ کیوں ہے، یا اس کے بجائے اس کا دوسرا مترادف لفظ رکھنے میں کیا قباحت ہے۔ پھر آپ پر روشن ہو جائیگا کہ کامیاب محرر کا ایک ایک لفظ اپنے اندر جذبات کی دنیا لیے ہُوے ہے اور جب موزوں الفاظ متحد ہو کر ایک جملہ بن جاتے ہیں، تو خیالات و معانی کی عالمگیر وسعتیں اس کے اندر ہوتی ہیں۔ اس لیے تحریر کی کامیابی کے لیے موزوں الفاظ کا ذخیرہ اور اُن کا موزوں انتخاب لازم ہے۔ ہر لفظ اپنے موقع و محل پر استعمال ہو۔ الفاظ کی ایسی ہی ترتیب و ترکیب، نشست وانتخاب سے مقرر یا محرّر کی فصاحت و بلاغت اور خطابت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

جملہ مرکب ہے الفاظ سے۔ اگر الفاظ کا انتخاب ان کی ترتیب و نشست موزوں ہوگی، تو جملہ بامعنی ہوگا۔ ورنہ بے معنی "میرا دل برف کی طرح سرد ہو چکا ہے اور اب کوئی طاقت اس میں حرارت پیدا نہیں کر سکتی۔" اس میں ہر لفظ موقع و محل پر ہے اور اپنے سابق ولاحق (اگلے پچھلے الفاظ) سے مربوط نظر آتا ہے۔ اب اسی جملے کی ترکیب الٹ دیں کہ میرا برف کی ہو چکا ہے دل طرح سرد وغیرہ، تو اس فقرے کا حُسن اور معنی دونوں گم ہو جاتے ہیں۔ ہر لفظ تنہا رہ جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ ہر لفظ بغیر اپنے سابق ولاحق کے کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا۔ نہ اپنی اہمیت واضح کر سکتا ہے، یعنی اگر وُہ اپنے موقع و محل پر نہ ہو، تو وُہ ایک پھول ہے، جس میں خوشبو نہیں۔ ایک جسم ہے، جس میں روح نہیں۔ گویا وہ لفظ اپنی زندگی کھو

چکا ہے۔ یہی حال فقرات کا ہے۔ ہر فقرہ اپنا ایک مفہوم رکھتا ہے، لیکن جب وُہ دیگر فقرات کے ساتھ موزوں ترکیب و ترتیب سے مربوط و ملحق نہ ہو، وہ کوئی زندہ مفہوم پیدا نہیں کر سکتا۔ اگر لکھتے وقت ان قواعد پر نظر نہ رکھی جائے، تو تحریر بالکل غیر مربوط، غیر دلچسپ اور بے معنی ہو گی اور ممکن ہے کہ اس کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھنے کی زحمت بھی کوئی گوارا نہ کرے۔ لیکن برعکس اس کے اگر عبارت کا ہر لفظ، ہر فقرہ اور ہر پیراگراف ایک صحیح ترکیب و ترتیب رکھتا ہو، تو ایسی تحریر (اُن اشخاص کے لیے جنھیں صحیح دماغ، عقلِ سلیم اور ذوقِ ادب تمام ازل کی طرف سے عطا ہوئے ہیں)، اپنے اندر ایسا ذوق، کیفیت، جوش، ولولہ اور حرارت مضمر رکھتی ہے، جس سے دل و دماغ عرصے تک مسحورِ لذت رہ چکے ہیں اور یقین کرنا پڑتا ہے کہ یقیناً بعض بیان سحر و جادو ہوتے ہیں، اس لیے زبان کے قواعد پر عبور، محاورات اور صرف و نحو سے واقفیت لازمی امر ہے۔

تحریر میں جوش، ندرت، لوچ (نزاکت) اور رنگینی پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ مشکل الفاظ یا مغلق (پیچیدہ) تراکیب استعمال کی جائیں، بلکہ جہاں تک ممکن ہو، اپنا مفہوم سادہ اور زوردار الفاظ میں بیان کر دیا جائے۔ اگر غیر مانوس اور مشکل الفاظ کی جستجو کی جائیگی، تو تحریر عام اس سے کہ وُہ نثر ہے یا نظم، پیچیدہ ہو کر رہ جائیگی اور اسی حد تک غیر دلچسپ بھی۔ آپ مشہور اربابِ قلم و مشاہیر ادب کے مضامین ملاحظہ کریں، جہاں اُنھیں ندرت، جوش اور زور پیدا کرنا ہوتا ہے، وہ بالکل سادہ الفاظ سے کام لیتے ہیں۔ ان کے فقرات مختصر ہوتے ہیں۔ ویسے بھی جب انسان جوش میں ہوتا ہے، اُس پر کوئی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ (بلا لحاظ اس کے کہ وُہ کیفیت جوش و غضب کی وجہ سے ہے، یا وفورِ محبت کے باعث) تو وہ مشکل الفاظ اور طویل فقرات نہیں بولتا، بلکہ اُس کے الفاظ سادہ اور مختصر

ہوتے ہیں ۔ میرا مقصود اس سے یہ ہے کہ جو کچھ بیان کرو ، بے ساختہ بیان کرو۔ طبیعت میں آمد (جو کچھ بغیر زور ڈالے قلم یا زبان سے نکلے) کا جوش ہو۔ آورد (زور ڈال کر نکالنا) کا ضیق (تنگی) نہ ہو۔ ایک خاص جوشش کے ماتحت لکھو، پھر دیکھو وہ الفاظ اور فقرات کس قدر مؤثر، دل نشین اور پیارے معلوم ہوتے ہیں، مثلاً غالب کا یہ شعر ؎

اب شوق جبہ سائی کی مدّت بھی ختم ہے
یا آج سنگِ در نہیں یا آج ہم نہیں

اپنے اندازِ بیان کے اعتبار سے نہایت پُر جوش، ہنگامہ خیز اور ولولہ انگیز ہے۔ الفاظ نہایت پُر شکوہ ہیں۔ اسی مفہوم کو عہدِ حاضر کا ایک شاعر اس طرح ادا کرتا ہے ؎

آج سجدوں کی انتہا کر دوں
شوق مٹ جائے یا جبیں نہ رہے

ہر چند مفہوم غالب کے شعر سے لیا گیا ہے، لیکن الفاظ کی سادگی اور وزن کے اختصار نے ایسا اثر جذب و کشش اور زور پیدا کر دیا ہے کہ بے اختیار شعر دہرانے اور وردِ زبان بنانے کو جی چاہتا ہے۔

یہی کیفیت نثر کی ہے۔ فرض کرو کہ ایک دوست آپ کو بہت انتظار کے بعد ملتا ہے۔ آپ اُسے دیکھ کر کہتے ہیں "مدّت مدید، عرصۂ بعید منقضی ہونے کو ہے کہ آپ کے شرفِ زیارت سے مشرف نہ ہو سکا۔"

لیکن اگر یہی مفہوم اس طرح ادا کریں کہ "درشن کے لیے آنکھیں ترس گئیں۔" تو ان سادہ الفاظ میں آپ نے اپنا شوق، محبّت، خلوص اور انتظار سب کچھ بیان کر دیا اور مؤثر و بہترین طریق سے۔

تحریر میں ایسی روانی، ندرت، رنگینی اور جذب و کشش پیدا کرنے کے لیے وسیع مطالعے اور کافی تجربے کی ضرورت ہے، کیونکہ جو تحریر صداقت سے خالی ہوگی، اس کے لیے موزوں الفاظ نہ مل سکیں گے اور جب الفاظ موزوں نہ ہونگے، تو آپ کی تحریر میں جوشس مفقود، تاثیر گم اور ندرت غائب ہوگی۔

اس لیے ضرورت اور سخت ضرورت اس امر کی ہے کہ مشاہیر ادب کے مضامین کو بغور مطالعہ کیا جائے۔ ان کے اندازِ بیان، اسلوب نگارش اور خصوصیات ادب سے واقفیت پیدا کی جائے۔ پھر جس کا طریق تحریر آپ کو مؤثر اور دلچسپ معلوم ہو، اس کی تقلید کی جائے۔ اس کے علاوہ مناظرِ قدرت کا بغور مشاہدہ کیا جائے۔ تاکہ تحریر میں وسعت، ذوق میں اصلاح اور احساس میں صحت پیدا ہو جائے۔ آپ اگر ان سادہ اصولوں پر غور کریں گے اور عمل کرنے کی کوشش کرینگے، تو جلد ایک وقت آئیگا کہ آپ کے قلم کی جھجک دور ہو جائیگی۔ اس وقت آپ کے قلم سے جو نکلے گا، وُہ معیارِ ادب پر پورا اُتریگا۔

جب معلم میں ذوقِ ادب پیدا ہو جائیگا، تو اُس کی تعلیم بے کیف نہ رہیگی اور یقیناً اس کے شاگرد اس کے کیف سے مؤثر ہُوے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ اپنے دل میں ادب اُردو کا کیف پیدا کیے بغیر آپ ہزار سر کھپائیں۔ طلبہ کو لغات، فرہنگ اور خلاصوں سے معنی و مطلب یاد کرائیں۔ کاپیوں کے اوراق سیاہ کریں، اُردو انشاء کی ایسی قابلیت ہرگز پیدا نہ ہو سکیگی، جیسے طالب علم کے ذوق کی بیداری نے پیدا کیا ہو اور طالب علم کا ذوق ادب بیدار نہ ہوگا، جب تک معلّم ادب اُردو کے کیف سے متکیف نہ ہو۔

حال کے معلّم نے "غیر مربوط ہذیان" کو زبان سمجھ لیا ہے، وُہ خود زبان کی چاشنی سے محروم ہے۔ اُردو زبان کا طریقہ تدریس اس کے نزدیک یہی ہے کہ "لڑکو! کون سا بیان پڑھنا ہے؟"

پڑھو۔ طالب علم پڑھتا ہے اور مدرس مشکل الفاظ کے معانی (جو بھی اُس کے اپنے ذہن نے اختراع کیے ہیں)، بتا دیتا ہے۔ بس سبق ختم اور مدرّس اپنی ذمّے داری سے بری!!!

یقیناً ۹۰ فیصدی معلّم میٹرک تک اسی طرح اُردو پڑھاتے ہیں۔ غور فرمائیے، یہ بے ذوق تدریس اور بے معرفت تعلیم طلبہ کے ذوق و وجدان کو کس طرح بیدار کرسکتی ہے؟ امتحان کے موجودہ سسٹم کو دیکھتے ہوئے مدرّس کو کسی کاوش میں پڑنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ جب ایسے ارزاں، سہل اور غیر محنت طلب طریقہ تعلیم سے اس کے طالب علم امتحان میں پاس ہو جاتے ہیں، تو اُسے طالب علم کو زیادہ قابل بنانے سے کیا حاصل؟

یوں تو محکمہ تعلیم ہر لحاظ سے بے روح ہوتا چلا جارہا ہے، لیکن السنہء شرقیہ کی تعلیم و تدریس کے کھیت کو چڑیوں نے اس طرح چُگ لیا ہے کہ اب پچھتانا بھی فعلِ عبث ہو کر رہ گیا ہے۔ ان زبانوں کی تعلیم کے معلّم بے ذوق، حکامِ معائن بیگانہء ادب اور طالب علم بے بس۔

مَیں نے لکھ دیا، جو لکھنا چاہتا تھا۔ میرے معلّم بھائی اسے پڑھیں اور غور فرمانے کی زحمت گوارا کریں کہ آیا زبان کی تعلیم کا یہی منتہا ہے؟ کہ طالب علم کو کتاب کے اخیر کا غلط فرہنگ لفظ بہ لفظ یاد ہو۔ اگر یہ نہیں اور یقیناً نہیں، تو خدا کے واسطے مطالعے سے اپنے ذوق کو بیدار کریں اور معلّمی کی لاج رکھ لیں ؎

کاش اُتر آئے کسی لفظ پہ تصویرِ خیال
دردِ دل ان کو دکھانے کی نئی صورت ہے

مدرسوں میں فنونِ لطیفہ کی تعلیم

از

میرزا سجاد حسین آرٹ ماسٹر، ٹریننگ کالج، مسلم یونیورسٹی

(گزشتہ سے پیوستہ)

نصاب

عموماً مدارس یہ محسوس کرتے ہیں کہ کورس میں تھوڑی تھوڑی مختلف چیزیں شامل کردیں اور یہ کہ اگر انھوں نے ایسا نہ کیا، تو گویا اپنے فرضِ منصبی کو پورا نہ کیا۔ بظاہر اس میں کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا، بشرطیکہ جو طریقہ وُہ اختیار کریں، وُہ بچّوں کے لیے مُفید ہو، مگر فی الحقیقت ایسا نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں فی زمانہ شہروں اور قصبوں میں سالانہ نمایش کا انتظام کیا جاتا ہے۔ علاوہ پیشہ ور لوگوں کی صنعتی و حرفتی اشیا کے طالب علموں کی نقاشی کے نمونے بھی ان نمائشوں میں بھیجے جاتے ہیں۔ ڈرائنگ ماسٹر طالب علموں سے مشہور لوگوں کے فوٹو گراف یا چھپی ہُوئی تصویروں کی نقل کرواتے ہیں۔ مجموعی حیثیت سے بچوں میں اتنی قابلیت نہیں ہوتی کہ وُہ خود ان کاموں کی تکمیل کریں۔ چنانچہ کام میں زیادہ حصّہ اُستاد کا اور برائے نام شاگرد کا ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہر اسکول کے اُستاد کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اُس کے شاگردوں کے کام بہ نسبت دوسرے اسکولوں کے طالب علموں کے بہتر ہوں تاکہ انعام کا زیادہ حصّہ اُس کے اسکول میں آئے اور اس طرح وُہ ہیڈ ماسٹر کی

خوشنودی حاصل کرے تعلیمی نقطۂ نگاہ سے اس سے بدتر کوئی طریقہ ہو ہی نہیں سکتا۔ نیز ہر بچے کو محض انسانی تصاویر کی نقالی سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ فائدہ تو بچوں کو اس صورت میں پہنچیگا، جبکہ وہ خود کسی چیز کی بنا قائم کر کے اُس کو تکمیل تک پہنچائیں، خواہ وہ انسانی تصاویر (Linocuts)، (Stenoilling) یا اور صنعتی و حرفتی قسم کی چیزیں ہوں۔ اگر تصویر رنگین ہے، تو رنگ بھی بچوں کو اسی نسبت سے استعمال کرنا چاہییں اور اس خاص کام کے بارے میں جو مضامین مختلف کتابوں میں درج ہوں، اُن کا بھی بچے مطالعہ کریں۔ غرضکہ ان کو ہر وہ صورت اختیار کرنی چاہیے، جو ان کو آئندہ زندگی میں اسی قسم کے کاموں کی تکمیل میں اختیار کرنی پڑیگی۔ اس کے لیے اگر ایک سبق کافی نہ ہو، بلکہ متعدد اسباق کے بعد کامیابی ہو، تو دراصل یہ بہترین کامیابی ہوگی، کیونکہ اس طرح اُن کے تجربات میں غیر معمولی اضافہ ہوگا اور ایک خاص طریقے سے ان کو کام کرنے کی عادت ہو جائیگی۔

تاہم ہر ایک اسکول کے لیے نصاب کا ہونا لازمی ہے۔ (بلکہ نصاب ایک ہی قسم کا نہیں ہوگا)۔ یہ نصاب اُستادوں کی متفقہ رائے سے تیار ہونا چاہیے، جو اُستاد اس فن کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہوں، اُن کی رائے کو دوسروں کی رائے پر ترجیح دینا چاہیے۔ نصاب میں پھیلاؤ کی گنجائش بھی ہونا ضروری ہے، تاکہ حسب ضرورت موقع اور محل کے لحاظ سے اس میں فوری تبدیلیاں کی جاسکیں۔

طرزِ تعلیم

طالب علموں کے مختلف رجحانات اور شخصی قابلیتیں اُستاد کی دقتوں کو اور بڑھاتی

ہیں اور اگر نصاب میں پھیلاؤ کی گنجائش نہیں ہے، تو مسئلہ اور پیچیدہ ہو جاتا ہے اسکول کے کسی درجے کو لیجیے، اس میں فنونِ لطیفہ سے متعلق طالب علموں کی تین قسم کی قابلیتیں ہونگی :۔

(۱) غیر معمولی ذہین طلبہ۔ (۲) اوسط درجے کی ذہنیت کے طلبہ۔ (۳) کند ذہن طلبہ۔ اوّل اور سوم قسم کے طلبہ کی تعداد عموماً کم ہوتی ہے۔ زیادہ تعداد میں اوسط درجے کی ذہنیت کے بچّے ہوتے ہیں۔ اب اگر نصاب اوسط درجے کے بچّوں کے لحاظ سے مرتّب کیا جائے، تو اوّل قسم کے بچّے محض اپنی تیزی اور طراری کی وجہ سے درجے میں بیکار رہیں گے اور تھوڑے ہی عرصے میں گھبرا جائیں گے۔ تیسری قسم کے بچّے اپنی ناقابلیت اور کمزوری کی وجہ سے اس پر قابو نہ پاسکیں گے۔ لہٰذا ماہرینِ فن کی رائے کے موافق اس ضمن میں دو صورتیں اختیار کی جاسکتی ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ اگر درجہ چھوٹا ہے اور اس میں تقریباً ۲۵، ۳۰ طلبہ سے زیادہ نہیں، اُس کو آپ بلاخوف تین حصّوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ مگر بچّوں کی قابلیتوں کے لحاظ سے ہر حصّے کا طرزِ تعلیم مختلف ہوگا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اگر درجہ بڑا ہے، تو مندرجہ بالا تقسیم بے سود ثابت ہوگی۔ ایسے درجے کا لحاظ مجموعی حیثیت سے کرنا پڑیگا، مگر یہ ملحوظ خاطر رہے کہ گزشتہ چند سال کے تجربات کی بنا پر مجموعی حیثیت سے کسی بڑے درجے میں آرٹ کی تعلیم ناقص ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے فی زمانہ یورپ میں ہر بچّے کی طبیعت کے رجحان کے لحاظ سے الگ الگ شخصی تعلیم کا سلسلہ زیادہ ہر دلعزیز ہو رہا ہے۔

درجے میں جن بچّوں کو آرٹ سے قدرتی دلچسپی ہے، اُن کی ہمّت افزائی کرنے کی غرض سے ہر قسم کی سہولت بہم پہنچانی چاہیے۔ مثلاً تصویر کشی کا سامان اور دیگر لوازمات

کئی الماریوں کے خانوں میں چُن دیے جائیں اور ایک ایک خانہ ایک ایک بچّے کے سپرد کر دیا جائے۔ قدرتی انہماک اور دلچسپی کی وجہ سے یہ بچّے چیزوں کو ضائع نہیں کرینگے، بلکہ پورے شوق سے انھیں استعمال میں لائیں گے۔ بجائے اس کے اگر ماسٹر انھیں اپنی مرضی کے موافق اُن کو کام کرنے کے لیے چیزیں دیں، تو نتیجہ حسب دلخواہ نہیں ہوگا۔ مثال کے طور پر ایک ذہین بچّہ جو اپنے کام کے شوق اور جذبے میں ڈوبا ہُوا ہے سبق کے دوران میں چاہتا ہے کہ رنگ استعمال کرے۔ اگر آپ نے اُسے محض پنسل ہی استعمال کرنے کی تاکید کی، تو اُس کا یہ شوق اور نئی اُمنگیں سب خاک میں مِل جائیں گی اور پھر اُن کی درستی کی کوئی سبیل نہ ہوگی۔

اب درجے کے دوسرے حصّے کو لیجیے، یعنی وہ حصّہ جس میں ادنیٰ ذہنیت کے بچّے ہیں۔ ان کی تعلیم کا مسئلہ بہت زیادہ پیچیدہ اور نازک ہے۔ ان میں سے بعض نقاشی اس لیے نہیں کرتے کہ ان کو ایسا کرنے کی خواہش ہی نہیں ہوتی۔ بعض اصولی قابلیت پر حاوی نہ ہونے کی وجہ سے ناکامیاب ہوتے ہیں۔ کچھ اپنی حُسن پسند اور لطیف قوتیں دوسرے اشغال میں مثل موسیقی یا شاعری کے صرف کرتے ہیں۔ چونکہ ہر بچّے کی آرٹ کی تعلیم کا مسئلہ ایک صاف جداگانہ مسئلہ ہے، اس لیے اس ضمن میں جو ناکامیابی ہو اُس کی تحقیقات بھی شخصی اور ہمدردانہ ہونی چاہیے۔ جن صورتوں میں محض قابلیت اور رغبت کے نہ ہونے کے باعث ناکامیاب ہوں، اُن صورتوں میں بہتر یہی ہوگا کہ اُن کو کسی دوسرے کام میں لگایا جائے۔ بعض بچّے جن کی حالتیں مندرجہ بالا صورتوں سے ذرا بہتر ہوں، اُن کا وقت فائدہ مند طریقے سے صرف کیا جا سکتا ہے۔ مگر آرٹ کی اعلیٰ تعلیم میں اُن سے کامیابی کی اُمید رکھنا بے حاصل ہے۔ ان میں سے جن کا رجحان مشینری کی طرف ہو، وہ لکڑی

کے سانچوں سے اور (Stencills) سے چھاپنے کا کام کرسکتے ہیں۔ ان سے سادے کاغذ پر پٹری کی مدد سے لکیریں کھنچوا کر خانے بنوائے جائیں تاکہ دوسرے قابل بچے ان خانوں میں کسی خاص مقصد کے لیے حسب دلخواہ خاکے تیار کریں۔ نیز یہ اسکول کے استعمال کے لیے (Port folios) بنا سکتے ہیں، یا آلات کی مدد سے چھوٹے پیمانے سے بڑے پیمانے پر خاکے تیار کرسکتے ہیں۔ اس طریقے سے بعض بچوں میں جو سیدھی لکیریں اور جیومیٹری کے اصول سے دائرہ نما شکلیں پیدا کرنے کا دبا ہُوا مادہ ہوتا ہے، اُستاد کو اُس کے اُبھارنے میں مدد ملیگی۔ بارہ تیرہ سال سے لے کر اور زیادہ سن والے طلبہ میں سے اکثر مصوری کی تواریخ، فن عمارت، جغرافیہ، تواریخ، سوانح عمری اور طبقات الارض کے علم سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اُن کے کام کا سلسلہ اس ضمن میں جاری کرنا چاہیے۔ ان میں سے کسی کو درجے کا Librarian امین کتب خانہ مقرر کردینا چاہیے۔ بجائے اس کے کہ بچوں پر دباؤ ڈالا جائے، خواہ وہ حکمتِ عملی سے کتنا ہی پوشیدہ کیوں نہ ہو۔ اگر اُن سے مندرجہ بالا طریقوں سے کام لیا جائے، تو اُن کی دبی ہُوئی قوتیں اُبھر آئینگی اور اُستاد کو یہ اندازہ کرنے کا موقع ملیگا، کہ فن کی کس شاخ کی طرف اُن کی طبیعت مائل ہے۔

یورپ میں کافی عرصے تک تجربات حاصل کرنیکے بعد ماہرین نے بچوں سے کام لینے کے مختلف طریقے اخذ کیے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک خاص طریقہ پیش کیا جاتا ہے، جس کو مختلف سن کے بچوں کی ضروریات کے لحاظ سے اختیار کیا جاسکتا ہے۔ فرض کیجیے کہ بچوں سے "چائے دانیاں" بنانے کے لیے کہا جائے اور ۴۵ - ۴۸ منٹ کے ہفتے میں تین چار گھنٹے بچوں کو اس کام کی تکمیل کے لیے دیے جائیں۔ پہلے اُستاد بچوں سے دریافت کرے کہ اُنھوں نے کتنی قسم کی چائے دانیاں دیکھی ہیں۔ سب کے سب بچے ایک قسم کی چائے دانی

جاننے کی بابت اقرار کرینگے۔ بہت سے دو تین قسم کی چائے دانیاں جانتے ہونگے کچھ ایسے ہوں گے، جو پانچ چھے قسم کی چائے دانیوں کی صورت دیکھ چکے ہونگے۔ وہ بچّہ جو صرف ایک ہی قسم کی چائے دانی جاننے کی بابت اقرار کرے، اُسے اس کو تختۂ سیاہ پر کھینچنے کے لیے کہا جائے۔ اس کے بعد اس شکل کو ان بچّوں سے جو اُن کو صحیح طور پر بنانے کی آمادگی ظاہر کریں، صحیح کروایا جائے۔ اس کے بعد چائے دانی کے مختلف حصّوں کے بارے میں مثل ٹونٹی اور کنڈے وغیرہ کے بحث ہو۔ جن بچّوں نے کئی قسم کی چائے دانیوں کے علم کا اظہار کیا تھا، اُن سے اُن کو بنوایا جائے۔ حتّٰی کہ چائے دانیاں پوری تعداد میں بن جائیں۔ اب ان چائے دانیوں کی شکلوں میں سے اُستاد ایک شکل جس سے بچّے بخوبی واقف ہوں، منتخب کرلے اور اس کو صحیح کروائے۔ یہانتک کہ تصحیح کی گنجائش باقی نہ رہے۔ عین اُسی وقت اُستاد اسی وضع قطع کی ایک چائے دانی پیش کرے اور تختۂ سیاہ پر جو شکل کھینچی ہوئی ہے، اُس سے اس کا مقابلہ کرے۔ اُس کے مختلف حصّوں کی مناسبت، اُونچائی، چوڑائی، ٹونٹی کی لمبائی، ڈھکنے کی لمبائی وغیرہ پر بحث کی جائے، حتّٰی کہ بچّوں کو اُس کی بناوٹ، وضع قطع سے پوری واقفیت ہوجائے۔ اس کارروائی میں تقریبًا ۲۰ منٹ صرف کرنا چاہییں۔ یہ ۲۰ منٹ کی جدّوجہد سب بچّوں کے لیے معمولی حیثیت سے غیر معمولی دلچسپی کا باعث ہوگی کچھ بچّے ایسے ہونگے، جن کے لیے یہ نقش پتّھر کی لکیر ہوجائیں گے۔

باقی ماندہ بیس منٹ میں ہر ایک بچّہ اصلی چائے دانی کی شکل محض حافظے سے کھینچے یا رنگ سے بنائے۔ ذہین بچّے اچھا خاصہ صحیح خاکہ تیار کریں گے۔ کند ذہن بچوں کا ڈرائنگ نسبتًہ کمزور ہوگا اور شاید پورے خط و خال بھی یہ حافظے سے نہیں بنا سکینگے۔

مگر ہر دو ذہنیت کے بچے شروع کی بیس منٹ کی تیاری کے بعد اصل چیز کو محض حافظہ سے ہی کہیں زیادہ بہتر بنائیں گے، بہ نسبت اس کے کہ وہ بغیر کسی تیاری کے اس چیز کو دیکھ کر بناتے۔ اعلیٰ ذہنیت کے بچے مقررہ وقت سے بہت پہلے اپنا کام ختم کر دینگے۔ باقی وقت میں ان سے کوئی چائے دانی جس کو یہ پسند کریں بنوانا چاہیے۔

بیس منٹ کے آخر میں بہترین کاموں کی نمائش بھی ہونا چاہیے اور تعریف بھی۔ چند نمونوں کی خاص درجے میں بچوں سے غلطیاں دور کروانا چاہییں، یا اُن بچوں کے کام کو جن میں غلطیاں ہوں، ذہین بچوں کے سپرد کر دینا چاہیے، تاکہ وہ ان غلطیوں کو دور کر دیں، مگر غلطیاں دُور کرنے میں اُن کو ہلکے خطوط لگانا چاہییں، کیونکہ یہ لازم نہیں ہے کہ تصحیح سے کام ہمیشہ بہتر ہی ہو جائے۔ اگر کسی شکل کے بارے میں بچوں میں اختلاف رائے ہو تو درجے میں جو بہت اچھا طالب علم ہو، وہ یا اُستاد اپنی رائے کا اظہار کرے۔ اس کے بعد کام کو آخری طور پر مکمل کرنے میں چند منٹ صرف کرنا چاہییں۔ بچوں کو چھٹی دینے سے پہلے یہ صلاح دینی چاہیے کہ دوسرے دن کام کے لیے وہ اور مختلف قسم کی چائے دانیوں کی وضع قطع کو اچھی طرح دیکھ بھال کر آئیں۔ (علاوہ چائے دانی کے دوسری چیزیں بھی مثل پاندان، سنگاردان وغیرہ کے نمونے اسی طرح کام میں لائے جا سکتے ہیں۔)

مغرب میں معلّمین کی فنّی تربیت

از

بشیر احمد ڈار، ایم اے، بی ٹی

اس موضوع کا عنوان کچھ تشریح طلب ہے۔ تربیت اساتذہ کے متعلق ضمناً کچھ ذکر آچکا ہے۔ یہاں میرا مقصد یہ ہے کہ مغربی ممالک میں جس طرح معلّموں کو اولاً عام تعلیم اور بعد میں فنّی تربیت دی جاتی ہے، اس کو ذرا تشریح سے واضح کیا جائے۔ اس مضمون میں یہ موضوع صرف ابتدائی مدارس کے معلّمین تک محدود ہوگا۔

جب تعلیم کے اس خاص حصّے پر نظر ڈالی جائے، جس کا تعلق معلّمین کی تربیت سے ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ مغربی ملکوں نے صرف زمانے کی ضروریات، وقتی مفاد اور حکومت کے استحکام کے پیشِ نظر اس کی طرف توجہ کی۔ نہ صرف یہ بلکہ خود ابتدائی تعلیم کو عام کرنے کا خیال بھی انھیں وجوہ کے باعث پیدا ہوا۔ مثلاً جنگِ عظیم سے بہت پہلے پرشیا (Prussia) میں فریڈرک اعظم نے جب اس ضرورت کو محسوس کیا کہ حکومت کا صحیح استحکام اور اقتصادی خوشحالی اور فوجی نظام اس بات کے مقتضی ہیں کہ عوام میں تعلیم پھیلائی جائے۔ اسی طرح روس اور جمہوریہ ترکیہ میں بھی حالات کی یکسر تبدیلی نے حکومت کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ لوگوں کو جہالت کے گڑھے سے نکال کر قوم اور معاشرے کے لیے فائدہ مند افراد پیدا کرے۔ محض تعلیمی اہمیت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے شاید کسی ملک نے بھی اس میدان میں قدم نہیں رکھا۔ حتیٰ کہ فرانس میں بھی، جہاں انقلاب کے باعث تعلیم اور آزادی کے خیالات ہر چہار سو وسعت اور

تیزی کے ساتھ پھیل چکے تھے، نپولین نے ۱۸۰۲ء میں تعلیم کو صرف افادی نقطۂ نگاہ سے دیکھا۔ چنانچہ ۱۸۰۸ء میں اُس نے پیرس میں ایک نارمل اسکول قائم کیا۔ اس کا واحد مقصد یہ تھا کہ یہاں کے فارغ التحصیل نئے مدارس میں جا کر تعلیم دے سکیں، جہاں فرانس کی نئی پود کو نپولین کے حسب منشا تعلیم دی جانے لگی تھی۔ ایسی حالت میں معلّمین کی ذاتی اور فنی قابلیت یقیناً بالکل صفر تھی اور اس کے لیے مدرسے کی چار دیواری ہی ساری دُنیا تھی۔ اس کا علم صرف ان چند بے جان درسی کتب تک ہی محدود تھا، جو اس بیچارے نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں رٹی تھیں۔ ایسے معلّمین سے فنّی استعداد اور بچّوں کی سیرت کی صحیح تشکیل کی اُمید کرنا عبث تھا، کیونکہ وُہ تو حکومت کی مشین میں ایک بے حِس پرزے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے تھے۔

(ل) ۱۹۱۴ء سے پہلے مغربی ممالک میں ابتدائی مدارس کے معلّمین کی اپنی ابتدائی تعلیم صرف ابتدائی درجے تک محدُود تھی اور اس کی وجہ مندرجہ بالا واقعات کی رُوشنی میں واضح ہو جاتی ہے۔ حتیٰ کہ فرانس، اطالیہ اور پرشیا (Prussia) نے ۱۹۱۴ء تک اسی حکمت عملی کی پُرزور تائید کی۔ جنگ عظیم کے آغاز سے کچھ دن پہلے اطالیہ میں ایک بل پیش ہوا، جس میں معلّمین کو اعلیٰ تعلیم دینے کی تجویز تھی۔ انگلستان اور امریکہ میں بھی تقریباً یہی حالت تھی۔ اگرچہ حکومت معلّمین کی اعلیٰ تعلیم کے خلاف نہ تھی، لیکن چونکہ ایسی تعلیم ان کی فنّی تعلیم کے لیے لازمی نہ تھی، اس لیے شاذ و نادر ہی کوئی معلّم اعلیٰ تعلیم حاصل کرتا تھا۔

لیکن جنگِ عظیم کے ختم ہوتے ہی ان تمام ملکوں نے بڑی تندہی سے اس معاملے کی طرف توجہ کی، تاکہ معلّمین ان بدلے ہُوئے حالات کے موافق اپنا کام خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکیں۔

(ا) فرانس :- پچھلے پندرہ سالوں میں جہاں تک معلمین کی عام تعلیم کا تعلق ہے، فرانس

میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ ہو سکی۔ عام طور پر ان کی تعلیم ابتدائی درجوں کے مدارس میں ہوتی ہے، جہاں وہ بارہ یا تیرہ برس کی عمر تک رہتے ہیں۔ اس کے بعد خاص کر دیہاتی علاقوں میں وہ ابتدائی مدرسوں ہی کے بعد ابتدائی درجوں یا اعلیٰ ابتدائی مدارس میں سولہ یا سترہ برس کی عمر تک تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ یہ سب تعلیم ابتدائی درجے تک ہی محدود ہے۔ اعلیٰ ابتدائی مدارس میں عام، صنعتی، تجارتی اور زراعتی شعبے ہوتے ہیں، لیکن معلمین کے لیے عام شعبہ مخصوص ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت اس چیز پر مصر ہے کہ ابتدائی درجے کے اندر اندر معلمین کی تعلیم جہاں تک ہو سکے، لبرل (Liberel) ہونی چاہیے۔ اعلیٰ ابتدائی مدرسوں میں تعلیم مفت ہے، لیکن بورڈنگ ہاؤس میں رہنے والے طلبہ کے کھانے وغیرہ کے اخراجات خود طالب علموں کے ذمے ہوتے ہیں۔ صرف غریب طلبہ کی ضرورت کے لیے وظائف مقرر ہیں، امتحانِ مقابلہ کے بعد دیے جاتے ہیں، لیکن وظیفہ یاب ہونے سے یہ لازم نہیں کہ طالب علم بعد میں ضرور معلم ہی بنیں۔

(۲) جرمنی (۱۹۱۸ء۔ ۱۹۳۳ء) عام تعلیم کے نئے خیالات کی نشر و اشاعت سے جرمن نظامِ تعلیم میں کئی ایک اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان میں سے تین تبدیلیاں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ چونکہ ان سے معلمین کی تعلیم پر خاص اثر ہوا:۔ (ا) ۶ اور ۱۰ برس کی عمر کے بچوں کے لیے عام مشترک ابتدائی مدرسوں کا قیام۔ (ب) فعالیت، امدادِ باہمی اور قومی کلچر کے اصول کے مطابق پبلک سکول (۶ سے ۱۸ سال کی عمر تک) کے آخری چار سال میں نصاب اور طریقۂ تعلیم کی اصلاح۔ (ج) ہر ریاست میں معلمین کی تربیت کے طریقے اگرچہ مختلف تھے، لیکن سب اسی ایک اصول پر کاربند تھے کہ معلمین کی عام تعلیم ثانوی درجے تک ہونی چاہیے۔

اس وقت فنّی تعلیم میں اختلاف کے باوجود معلّمین کی عام تعلیم کا انتظام سبھی ریاستوں میں یکساں ہے۔ ۶ اور ۱۰ سال کی عمر میں وُہ ابتدائی مدرسے میں تعلیم پاتا ہے اور اس کے بعد نو سال کی عام تعلیم کے لیے کسی ثانوی مدرسے میں داخل ہوتا ہے۔ وُہ لڑکے جو کسی خاص وجہ سے دس برس کی عمر میں کسی ثانوی درجے کے مدرسے میں داخل نہیں ہو سکتے، تین سال بعد کسی شش سالہ ثانوی مدرسے میں داخل ہو سکتے ہیں۔ معلمین کے لیے اصولی طور پر ہر قسم کی تعلیم کافی سمجھی جاتی ہے۔ خاص کر ایسے مدرسوں میں جہاں لبرل (Liberel) تعلیم پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے انقلاب کے وقت ایک خاص قسم کے مدرسے قائم کیے گئے (Dentsche Oberschule)، جن میں قومی لٹریچر اور کلچر کی تعلیم دی جاتی ہے۔

(۱۹۳۳-۳۵ء) اگرچہ اب تک نازیوں نے نظامِ مدارس کو تبدیل کرنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی، پھر بھی ماہرینِ تعلیم نے مختلف موقعوں پر اپنی تقریروں میں یہ چیز واضح کی ہے کہ وُہ لبرل ثانوی تعلیم کے خلاف ہیں۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ معلمین کے لیے ایسا نصاب مقرر کیا جائے، جس کی مدد سے وُہ صرف اپنا علم ہی وسیع نہ کر سکیں، بلکہ اس کے مطالعے کے بعد قوم، ملک اور حکومت سبھی کے لیے فائدہ مند ثابت ہوں۔ اس مقصد کے لیے حکومت نے نئے نئے مدارس قائم کیے ہیں، جہاں کا نصاب اس طریقے سے انتخاب کیا گیا ہے کہ اس کے بجائے افراد کے قوم اور اُس کی ضروریات کی اہمیّت واضح ہو جائے۔

(۳) اطالیہ۔ جنیٹیلے (Gentile) کی اصلاحات (۱۹۲۳ء) کے بعد سے معلّمین ۶ سے ۱۰ برس کی عمر تک تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ۱۹۲۰ء سے ہر اس قسم کے مدارس جہاں بچے دس برس کی عمر کے بعد داخل ہوتے ہیں، ثانوی تعلیم کا ایک حصہ سمجھے جاتے ہیں۔ اگرچہ فرانس اور جرمنی میں ایسے مدرسے اعلیٰ ابتدائی مدرسوں کے نام سے مشہور ہیں۔ وُہ بچّے

جن کے والدین انھیں معلّم بنانا چاہتے ہیں، دس برس کی عمر میں ثانوی مدرسے کے ادنےٰ درجے میں داخل ہوتے ہیں اور ۱۴ برس کی عمر میں اعلیٰ درجے میں منتقل ہو جاتے ہیں، جہاں خواندگی کی مدّت تین سال ہے۔ پچھلے تین سال میں فلسفے کا مضمون بھی نصاب میں شامل ہوتا ہے، لیکن فلسفۂ تعلیم پر خاص زور دیا جاتا ہے۔ ابتدائی درجے کے مدارس کے معلمین کے لیے تعلیمات کے عام اصول کا علم صرف اسی سہ سالہ مضمون پر موقوف ہے۔

(۴) **اضلاع متحدہ امریکہ**۔ یہاں معلمین کی درسی تعلیم کا مسئلہ کچھ پیچیدہ ہے، چونکہ مختلف اضلاع کے تفصیلی انتظامات میں بہت کچھ اختلاف ہیں۔ نارمل اسکول میں داخلے کے لیے کم از کم یہ شرط ہے کہ اُمیدوار ہائی سکول کا سندیافتہ ہو، جہاں تعلیم بالکل مفت ہے۔ بعض اضلاع میں ہائی اسکول کی خواندگی کے آخری ایک یا دو سالوں میں ہی یہ کام سرانجام دیا جاتا ہے۔

(۵) **انگلستان**۔ فرانس کی طرح انگلستان میں بھی معلّمین کی درسی تعلیم کے لیے کوئی خاص تعلیمی نصاب مقرر نہیں کیا گیا، لیکن اس کے باوجود (فرانس کی طرح) چند عام اصول مقرر کیے گئے ہیں، جن کے مطابق نارمل اسکول میں داخل ہونے والے طلبہ کے لیے ایک خاص معیار قائم کیا گیا ہے۔ تعلیمی بورڈ نے معلّمین کی تربیت کے لیے چند قوانین جاری کر رکھے ہیں۔ نارمل اسکول میں داخل ہونے کے لیے لازمی ہے کہ اُمیدوار ثانوی تعلیم کے بعد ۱۶ برس کی عمر میں کسی یونیورسٹی کے ابتدائی پبلک امتحان میں کامیاب ہو چکا ہو۔ عام طور پر ایسے طالب علم مرکزی مدرسے میں تعلیم پاتے ہیں، جہاں نصاب میں تجارتی رجحان پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور بعض حالتوں میں وہ ایسے ثانوی مدارس میں تعلیم حاصل کرتے ہیں، جو تعلیمی ایکٹ ۱۹۰۲ء کے بعد معلّمی کی تربیت حاصل کرنے والوں کو ثانوی تعلیم دینے کے لیے قائم کیے گئے تھے۔

نارمل اسکول میں بعض ایسے اُمیدوار بھی داخل ہوتے ہیں، جنھیں ہم pupil - teacher کے نام سے پکارتے ہیں، لیکن انگلستان میں ان کی حیثیت اور ان کا کام ہمارے ہاں کے طلبہ سے مختلف ہوتا ہے۔ ایسے طالب علم سترہ برس کی عمر تک کسی ثانوی درجے کے مدرسے میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس کے بعد وہ کسی ابتدائی مدرسے میں ایک سال کے لیے معلمی کا کام سرانجام دیتے ہیں، لیکن اس دوران میں ان کا تعلق اپنے پرانے مدرسے سے باقاعدہ قائم رہتا ہے اور ہفتے میں ایک بار وہ وہاں جاتے ہیں۔ وہ کسی ابتدائی مدرسے میں تعلیم دیتے ہیں اور اسی مدرسے کا ہیڈ ماسٹر ان کے کام کی نگرانی کرتا ہے۔ ایسے طالب علموں کو عام طور پر وظیفے کے طور پر تنخواہ بھی دی جاتی ہے۔

ان تمام مندرجہ بالا بیانات سے یہ چیز واضح ہے کہ تمام مغربی ملکوں نے جنگِ عظیم کے بعد سے تعلیم کو عام کرنے اور اُس کی بنیادیں اُستوار کرنے کے لیے جہاں ابتدائی تعلیم کے نصاب وغیرہ میں تبدیلیاں کی ہیں، وہاں اس سوال کا اہم ترین حصّہ یعنی ابتدائی مدارس کے معلّمین کا مسئلہ بھی فراموش نہیں کیا گیا۔ شاید اس بات سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ معلّمین کی درسی اور فنّی تعلیم اگر زمانے کی رفتار کے مطابق نہیں ہوگی، تو یقیناً نظامِ تعلیم کی دوسری تبدیلیاں، خواہ وہ کتنی ہی عمدہ اور دلکش کیوں نہ ہوں، وہ اثر پیدا نہیں کر سکتیں، جو ان تبدیلیوں سے پیدا کرنے کی توقع ہو سکتی ہے، اس لیے شاید کسی تعلیمی انقلاب پیدا کرنے سے پہلے معلمین کی تربیت کی طرف توجّہ کرنا سب سے زیادہ اہم کام ہے، جس کو یہ ملک کچھ تو سرانجام کر چکے ہیں اور کچھ اس کو متوقع راستے پر لا رہے ہیں۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ ابتدائی مدارس کے معلمین قوم کے متوسط طبقے سے لیے جائیں اور ان کو زیادہ سے زیادہ لبرل اور کلچرل تعلیم دی جائے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انگلستان، امریکہ اور دیگر

ایسے ممالک میں معلمین کا مطمع نظر صرف درسی مضامین یا فنی طریقوں کے علم تک محدود نہیں رہتا، بلکہ وہ دنیا کی روزمرہ کی زندگی میں اسی شوق اور جاذبیت سے حصہ لیتے ہیں، جس طرح ان کے ساتھ ثانوی درجے کے وہ طالب علم جو دنیا کے دیگر دائروں میں داخل ہو چکے ہیں۔ جسمانی ورزشوں اور کھیلوں میں حصہ لینا، ان ممالک کی قومی زندگی کا ایک اہم ترین حصہ ہو چکا ہے، اس لیے تمام باشندے خواہ وہ کسی محکمے میں کام کرتے ہوں، قومی زندگی کے اس شعبے میں شامل ہو کر سبھی یگانگت محسوس کرتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ معلمین کو اس چیز کا احساس مستحکم ہو جاتا ہے کہ وہ دوسروں کی طرح قوم کی تعمیر میں شاندار حصہ لے رہے ہیں اور زمانے کے اقتضا اور واقعات کی رفتار سے واقف ہو کر ان بچوں کی سیرت کی تشکیل میں بہترین مدد دے سکتے ہیں، جن کی تعلیم و تربیت کا بار حکومت نے ان کی گردن پر ڈالا ہے۔

(ب) ابتدائی مدارس کے معلّمین کی فنّی تعلیم و تربیت

کچھ تو قومی روایات کے ماتحت اور کچھ تعلیمی نظریے کے زیرِ اثر مختلف ملکوں میں فنّی تربیت میں بہت کچھ اختلاف نظر آتے ہیں۔ بعض میں فنّی تربیت سے مراد درسی علم کی توسیع لی جاتی ہے۔ یعنی تربیت کے دوران میں طلبہ کو وہی تعلیم دی جاتی ہے، جو انھوں نے مدرسوں میں حاصل کی، لیکن اس میں کچھ وسعت اور گہرائی پیدا کیے جانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بعض ملکوں میں فنّی تربیت کا مطلب محض فنّی کمال کی تحصیل سمجھا جاتا ہے، یعنی نارمل اسکول کے دوران میں بچوں کے حاصل کردہ علم کو کافی سمجھا جاتا ہے اور محض تعلیم دینے کے عملی اصولوں کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تمام مغربی ملکوں کو فنّی تربیت کے لحاظ سے انھیں دو عام حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جن میں سے بعض میں عام تعلیمی اصولوں

سے بالکل اغماض کیا جاتا ہے اور کہیں کہیں طلبہ کو ان سے سطحی طور پر واقف کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ۱۹۲۰ء تک فرانس اور ۱۹۲۳ء تک اطالیہ میں پہلے نقطۂ نگاہ سے تعلیم دی جاتی رہی۔ اس کی ضرورت اس لیے محسوس ہوتی تھی کہ ان ملکوں میں ابتدائی مدارس کے معلمین کے لیے اعلیٰ تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا اور نہ حکومت کو اس چیز کی ضرورت کا احساس تھا۔ اس لیے ان معلمین میں وسعت نظر پیدا کرنے کے لیے لازمی تھا کہ فنّی تربیت کے دوران میں ان کے علم میں وسعت اور گہرائی پیدا کی جائے، لیکن فرانس میں ۱۹۲۰ء میں نارمل اسکول میں اصلاح کی گئی، جس کے بعد اب فنّی کمال کی تحصیل پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اسی طرح اطالیہ میں جنٹیلے (Gentile) کی اصلاحات کے بعد، جب تعلیم ایک روحانی عمل تصوّر کیا جانے لگا، تو ثانوی مدارس میں بہت کچھ ردّ و بدل کر دیا گیا۔ انگلستان میں ابتدائی حالت میں دوسرے نقطۂ نگاہ پر زیادہ زور دیا جاتا رہا، لیکن یورپ کے دیگر ممالک کے نارمل مدارس کی اصلاحات نے ذمّہ دار لوگوں کے خیالات میں نمایاں تبدیلی پیدا کر دی اور اس وقت نارمل اسکولوں میں دونوں باتوں پر یکساں زور دیا جاتا ہے۔ موجودہ دور میں یونیورسٹی کے محکمۂ تربیت معلمین کے زیر اثر اب تعلیم کے عام اصولوں کو بھی فراموش نہیں کیا جاتا۔ اضلاع متحدہ امریکہ میں بھی تقریباً ایسی ہی حالت ہے۔ جرمنی میں جنگِ عظیم سے پہلے انھیں دونوں باتوں پر فنّی تربیت کا دار و مدار تھا۔ ۱۹۱۸ء کے انقلاب کے بعد سے درسی نصاب یا صحیح الفاظ میں درسی زندگی کے مختلف کاموں کو بچّوں کی نفسیاتی ضروریات کے مطابق بنانے کی طرف خاص توجّہ دی جاتی رہی۔ نازی استیلا کے بعد سے کوشش کی جا رہی ہے کہ بچّوں کے فطری اقتضا کے مطابق ان کو آگاہ کر دیا جائے کہ معاشرے کی ہمہ گیری میں ان کی حیثیت کیا ہے۔ جمہوریہ اشتراکیہ روس میں معلّمین کی

تربیت کی ساری بنیاد مزدوری اور دستکاری میں پورا حصہ لینے پر موقوف ہے۔ چونکہ وہاں تعلیم کو معاشرتی اور اقتصادی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اس لیے لازمی ہے کہ وہاں کے آئندہ معلّمین کی تربیت کا انتظام دوسرے مغربی ممالک کے انتظام سے مختلف ہو۔

(۱) فرانس ۔جب طالب علم اعلیٰ ابتدائی مدرسے کے عام شعبے کی تعلیم ختم کر لیتا ہے، تو ۱۵ اور ۱۹ برس کی عمر میں وہ نارمل اسکول میں داخل ہو سکتا ہے، بشرطیکہ اس کی جسمانی صحت اور اخلاقی حالت تسلی بخش ہو۔ فرانس کے ہر محکمے میں ایک نارمل اسکول آدمیوں کے لیے اور ایک عورتوں کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ چنانچہ ایسے کل مدارس کی تعداد ۸۸ ہے۔ ان کے علاوہ الجیریا اور ٹیونس میں تین ایسے مدرسے آدمیوں کے لیے اور چار عورتوں کے لیے قائم ہیں۔ داخلہ محدود ہوتا ہے اور اس کا فیصلہ ضرورت کے مطابق وزیرِ تعلیم کے سپرد ہوتا ہے۔ ان طلبہ کے لیے جو ابتدائی سند کے امتحان میں اعلیٰ نمبر حاصل کرتے ہیں، چند وظائف مقرر ہیں۔

اس مدرسے کی خواندگی تین سال کی ہے اور اس دوران میں اعلیٰ ابتدائی مدرسے کی تعلیم کو جاری رکھا جاتا ہے، لیکن یہ علم محض بے فائدہ اطلاعات کے رٹ لینے پر موقوف نہیں ہوتا، بلکہ طلبہ کو انفرادی طور پر تحقیق کرنے کا طریقہ سکھایا جاتا ہے۔ نفسیات تعلیم کے ابتدائی اصول، علم معاشرت، اصول تعلیم، علم اخلاق، اور اصول سائنس ایسے مضامین نصاب میں شامل ہیں۔ عملی تعلیم کی مشق کسی ایسے ابتدائی مدرسے میں دی جاتی ہے، جو نارمل اسکول کے ساتھ ملحق ہو، یا اس علاقے کے کسی اور ابتدائی مدرسے میں اس مقصد کے لیے مخصوص ہو۔ ہر سال طالب علم تقریباً پچاس نصف دن ابتدائی مدرسے میں بسر کرتا ہے۔

پہلے سال وُہ معلمین کے طریقۂ تعلیم کا مطالعہ کرتا ہے۔ دوسرے سال یہ مطالعہ جاری رہتا ہے اور کبھی کبھی اپنے پروفیسر یا جماعت کے معلّم کی موجودگی میں بچّوں کو پڑھاتا ہے۔ آخری سال اس کا بیشتر وقت مدرسے میں مختلف مضامین کے پڑھانے میں صرف ہوتا ہے۔ بعض دفعہ طلبہ کو کچھ عرصے کے لیے چند معلّمین کے سپرد کر دیا جاتا ہے، جو نارمل اسکول سے تعلق نہیں رکھتے اور طالب علم ان کے مشورے اور نگرانی کے ماتحت مدرسوں میں تعلیم دیتے ہیں۔

ہر سال کے اختتام پر طلبہ کو امتحان پاس کرنا ہوتا ہے اور اگر کسی امتحان میں فیل ہو جائیں، تو ان کو مدرسے سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ تینوں امتحانوں میں کامیابی کے بعد ان کو اعلیٰ سند دی جاتی ہے، جس کے بعد وُہ عارضی طور پر کسی ابتدائی مدرسے میں معلمی کر سکتے ہیں۔ اعلیٰ ابتدائی مدارس کی خواندگی کے اختتام پر یا انٹرنس کے امتحان کے پہلے حصّے کے بعد طلبہ اس اعلیٰ سند کا امتحان دے سکتے ہیں، خواہ اُنھوں نے نارمل اسکول میں تعلیم نہ پائی ہو۔ ایسی حالت میں یہ امر تعجب خیز نہیں کہ تھوڑی مدت سے نارمل اسکول کی طرف لوگوں کا رجحان کم ہو گیا ہے۔ چونکہ ثانوی تعلیم مفت قرار دے دی گئی ہے۔ ان حالات میں ممکن ہے کہ آئندہ اعلیٰ سند حاصل کرنے کے لیے طلبہ ثانوی تعلیم حاصل کریں اور اس کے بعد ابتدائی مدارس کی معلّمی اختیار کریں۔ دو سال کی عارضی ملازمت کے بعد ایک اور مشکل امتحان ہوتا ہے، جس میں ان کی فنّی قابلیت کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ اس کے پاس کرنے کے بعد اگر وُہ ۲۰ برس کی عمر تک پہنچ چکے ہوں، تو وُہ نارمل کی سند حاصل کر لیتے ہیں اور مستقل ملازمت کے قابل قرار دیے جاتے ہیں۔ لڑکوں کی حالت میں یہ سند صرف فوجی تربیت حاصل کرنے کے بعد ملتی ہے۔

(باقی آئندہ)

ڈالٹن پلین

تجویز تعلیم انفرادی

از

محمد عبدالغفور خاں، خلیق بسوی، ادیب فاضل، منشی فاضل

(گزشتہ سے پیوستہ)

صوبۂ پنجاب میں بہت کم مدارس نے اس مفید و مناسب تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی طرف توجہ کی ہے اور اگر ایک آدھ نے کی بھی ہے، تو ماحول کی ناواقفیت نے اس کو قائم رہنے نہیں دیا۔

غالباً ۱۹۲۶ء یا ۱۹۲۷ء میں مسلم ہائی اسکول انبالہ شہر کے ہیڈ ماسٹر میاں غلام محی الدین صاحب نے اسکول میں اس طریقۂ تعلیم کو اختیار کیا اور دو تین سال اس سرگرمی و تندہی سے کام کیا اور اپنے اساتذہ و طلبہ سے کام لیا کہ یہ تجویز سرسبز ہونے لگی۔ اس دوران میں جب کبھی موصوف سے اس مسئلے پر گفتگو ہوئی، یہی معلوم ہوا کہ واقعی اگر کوئی طریقۂ تعلیم صحیح معنوں میں مفید و کارآمد ہو سکتا ہے، تو وہ یہی ایک طریقۂ تعلیم ہے۔ وہ اپنے طلبہ میں مطالعے کا شوق اور مذاقِ سلیم پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے فطری جوہروں کو نمایاں ہوتے دیکھ کر خوشی کا اظہار فرمایا کرتے تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی نصابِ تعلیم کی طوالت، مدرسین کی بدشوقی اور کام چوری نیز اخراجات کی فراوانی کی شکایت ضرور فرماتے تھے۔ آپ کی رائے میں جو قوم علم کی قدر و قیمت کو سمجھ کر اس کی تحصیل

میں روپیہ خرچ کرنا جانتی ہے، وُہ چند ہی سال میں محض اس ایک طریقۂ تعلیم کو رائج کر کے اپنی قومی دنیا کو بدل سکتی ہے۔

اِنھیں ایام میں جبکہ مسلم ہائی اسکول انبالہ شہر میں یہ طریقۂ تعلیم زیرِ تجربہ تھا، راقم کا تبادلہ ایک ایسے مڈل اسکول میں ہُوا، جہاں کے طلبہ کی تعلیمی حالت ازبس ناگفتہ بہ تھی۔ اصلاحِ مدرسہ کی طرف جوں جوں توجہ ہوتی گئی، یہ حقیقت عیاں ہوتی گئی کہ بُنیادی کمزوری و خامی کا تدارک اس کے سوا کچھ نہیں کہ طلبہ کو پیچھے ہٹا کر وہیں سے تعلیم شروع کی جائے، جہاں سے وُہ خامی رُونما ہُوئی ہے۔ اس اُدھیڑبُن میں یہ انکشاف ہوا کہ طلبہ کا بلحاظ ذہنیت ایک رفتار سے آگے بڑھ چلنا ناممکن نہیں، تو دشوار ضرور ہے۔ اتفاق سے سید خورشید حسن صاحب اے، ڈی، آئی حلقہ، جو آج کل گورنمنٹ ہائی اسکول نرائن گڑھ میں ہیڈ ماسٹری کے فرائض انجام دے رہے ہیں، معائنے کی غرض سے آئے۔ اعلیٰ جماعت کے طلبہ کو حسبِ ضرورت دو تین جماعت نیچے ہٹا کر تعلیم دینے کی کیفیت اور اس تجربے سے پیدا شدہ نتائج صاحب ممدوح کے سامنے رکھے، تو اُنھوں نے بہ کمال طمانیت و مسرّت اس کاوشِ فکر و عمل پر تحسین کی اور اپنے تجربے کی بنا پر فرمایا کہ پنجاب کے دیہاتی اسکولوں کی فضا تعلیم انفرادی کے عین مطابق ہے، لیکن افسوس مدرسین کی غفلت و بے توجہی اُنھیں اس طرزِ تعلیم کو جدید شکل میں منضبط طور پر عملی جامہ نہیں پہنانے دیتی۔ مَیں نے غور کیا اور پس و پیش نظر دوڑائی، تو آپ کی رائے کو مبنی بر حقیقت پایا۔ اس لیے فوراً یہ تہیّہ کر لیا کہ اس تجویز کو اپنے مدرسے میں حسبِ توضیح مِس پارک ہرسٹ کامیاب بنایا جائے۔ چنانچہ حسبِ ایما صاحب موصوف مسلم ہائی اسکول انبالہ شہر میں ایسے وقت پہنچ کر جب کہ اس کے مطابق اُستاد اور شاگرد مصروفِ کار تھے، تجویز کے عملی پہلو کو سمجھ لیا گیا اور اس میں حسبِ حالات تھوڑی بہت ترمیم کر کے جماعت میں جاری

کر دیا۔ چونکہ کام نہایت احتیاط اور در و بست سے کیا گیا تھا، اس لیے غیر متوقع طور پر ایسی کامیابی ہوئی کہ طلبہ کی رفتارِ ترقی دیکھ کر حیرت ہونے لگی۔ یہی جماعت جب ترقی کر کے آٹھویں جماعت میں گئی، تو بہ ہیئت مجموعی بہترین جماعت نکلی اور ضلعے بھر میں بلحاظ نتیجہ امتحان فائنل اوّل رہی ایک طالب علم ضلع بھر میں اوّل رہا اور اسکول نے دو وظیفے لیے۔ اس کامیابی پر، جو دلی مسرت متعلقہ اساتذہ کو ہوئی، وہ یقیناً اس محنت و جانفشانی کا بہترین نعم البدل تھی، جو اس تجویز کو پروان چڑھانے میں ہمیں اٹھانی پڑی۔

اس کے دو تین سال بعد حسنِ اتفاق سے مؤلف کو کرسچین ہائی اسکول کھرڑ میں خدمات کا موقع ملا۔ وہاں مسٹر ڈبلیو، ایم رائبرن، ایم اے، پرنسپل اور مسٹر این، ایس میسی بی اے، بی ٹی ہیڈ ماسٹر تھے، جو متفقہ طور پر اپنے طلبہ کی صحیح تعلیم اور نتائج مدرسہ کی اصلاح کے لیے تعلیم انفرادی کو اختیار کرنے کی داغ بیل لگا رہے تھے، اب دو سے تین ہو گئے۔ اعتراضات و مشکلات کے مقابلے میں ثابت قدم رہنے کا تہیہ کر کے جرأت کر بیٹھے کہ تجویز کو تقریباً تمام مضامین میں زیر تجربہ لایا جائے اور طلبہ کو پوری پوری آزادی دے دی جائے نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے ہی سال ۱۹۳۲ء میں نتیجہ امتحان میٹریکولیشن سو فیصدی رہا۔ اب کہ تجربہ شروع کیے پانچ سال گزر چکے ہیں اور طلبہ تجویز کے نشیب و فراز کو خود بخود سمجھتے جا رہے ہیں۔ اب تک بلحاظ نتائج و ترقی اسکول کی روایات میں فرق نہیں آیا۔

ہمیں افسوس ہے کہ بعض محکمانہ پابندیوں کے باعث جس حوصلے سے مؤخر الذکر مدرسے میں اس طرزِ تعلیم کو شروع کیا گیا تھا، وہ پورا نہیں ہو سکا، ورنہ اُمید واثق تھی کہ یہ مدرسہ پنجاب کے دوسرے مدارس کے لیے نمونہ بنتا اور اب تک زیادہ نہیں، تو کم از کم پچاس ساٹھ مدارس میں جہاں حالات سازگار ہوتے، یہ طرزِ تعلیم ایسے کامیاب نوجوان اور پُرامن شہری پیدا کرتے نظر آتا، جو کشمکش حیات

میں مردانہ جوشِ عمل سے سرگرم کار ہوکر اپنے بہت سے ہم عصر نوجوانوں کو کامیابی کی راہ غیر محسوس طور پر دکھانے میں خاموش مگر معنی آفریں اُستاد ثابت ہو چکے ہوتے ۔

اس باب کو ختم کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لنڈن کے ایک زنانہ پرائمری مدرسے کی معلّمہ کے اُس بیان کا اقتباس پیش کر دیا جائے، جو اُنھوں نے لنڈن کی "ڈالٹن ایسوسی ایشن" کے جلسے میں اپنے مدرسے میں ڈالٹن پلین کے ذاتی تجربے کے متعلق دیا۔

مس ہانہ نے یہ بیان کرتے ہوئے کہ اُن کے مدرسے کی تعمیر کس طرح اس طریقۂ تعلیم کی ممدومعاون ہے فرمایا

"جماعتوں کے کمرے ایسے انداز سے تعمیر کیے گئے ہیں کہ ایک کمرے کی آواز دوسرے کمرے میں نہیں جا سکتی اور تمام کمرے اور ہال اس طرح واقع ہیں کہ بیرونی شور و شغب مطالعے میں مُخل نہیں ہو سکتا۔ جماعت ابجد خوانان سے اُوپر کی سب لڑکیاں ہی تعلیم پاتی ہیں۔ اس جماعت کی طالبات کو وقتِ مناسب پر جماعت سوم میں ترقی مل جاتی ہے، اس لیے ڈالٹن پلین لکھنے پڑھنے اور حساب ہی کے لیے استعمال کی جا سکتی ہے۔ اُوپر کی چھے جماعتوں میں اس طریقے کو زیادہ وسعت کے ساتھ برتا جاتا ہے۔ ہر فریق کے لیے ایک کمرہ مخصوص ہے، جو سال بھر کے لیے اُن کا ممعل ہے اور ایک معلّمہ ہر لڑکی کی خاص نگرانی کرتی ہے۔ ہر کام کے لیے یہ فریق ہی استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً ہال میں لڑکیاں فریق وار جمع ہوتی ہیں۔ حاضری فریق وار ہوتی ہے۔ اجتماعی اسباق مثلاً ورزش، سینا پرونا، سائنس، ڈرائنگ اور موسیقی سب فریق وار ہوتے ہیں۔

انگریزی، حساب، تاریخ اور جغرافیے کی تعلیم ڈالٹن پلین کے مطابق دی جاتی ہے۔ ان مضامین کے لیے کمرے اور مدرسین مخصوص ہیں۔ دو کمرے انگریزی کے لیے۔ دو حساب کیلیے اور ایک تاریخ جغرافیے کے لیے مخصوص ہے۔ ہر کمرے میں خاص مضمون کے سامان اور کتب سے

ایسی فضا پیدا ہوگئی ہے، جو اس مضمون کی تعلیم و تدریس کے لیے نہایت موزوں ہے۔ اسباق کی تکمیل پر نمبر نہیں دیے جاتے۔ تحریری کام یا تو معلّمہ خود درست کرتی ہے یا وہ غلطیاں لگا دیتی ہے اور طالبات معلّمہ کے سامنے اُسے درست کرتی ہیں، مگر اس کام میں تنقیدی کلمات مثلاً "اچھا"، "بہت اچھا"، "نہایت ہی اچھا" وغیرہ یا نمبر نہیں لکھے جاتے۔ چونکہ تمام طالبات کام ختم کرنے کے درپے ہوتی ہیں، اس لیے نمبروں کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی۔ البتّہ کمرے میں رنگین نقشے لٹک رہے ہیں، جن میں ہر لڑکی کے کام کا اندراج ہوتا رہتا ہے۔ یہی کافی وجہ تشویق ہے۔ اس کے علاوہ معلّمہ کے پاس ایک رجسٹر میں ہر لڑکی کے کام کی ترقّی کا حال درج ہوتا رہتا ہے۔

جو مضامین ڈالٹن پلین کے مطابق پڑھائے جاتے ہیں، ان کے مطابق لڑکیوں کو جماعتوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جب کوئی لڑکی سال کا کام ختم کر لیتی ہے، تو اُسے اُوپر کی جماعت میں ترقّی مل جاتی ہے۔ یہ ترقّیاں ہر مہینے کے خاتمے پر ہوتی ہیں۔ اس پلین کے اجراء سے لڑکیاں اپنا وقت نہایت کفایت شعاری سے استعمال کرنے کی عادی ہو گئی ہیں اور اُنھوں نے ان مضامین میں بہت ترقّی کر لی ہے۔"

مندرجۂ بالا بیانات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جہاں کہیں بھی کسی مفکرِ تعلیم کو "تعلیم انفرادی" کی ضرورت کا احساس ہوا ہے، وہ انھیں حالات کے باعث ہوا ہے، جو "مس ہیلن پارک ہرسٹ" نے بیان کیے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ ایک قدرتی طرزِ تعلیم ہے اور ہم بچے کی تربیت کرنے میں اُنھیں اصولوں پر کاربند ہوتے ہیں، جو اس تجویز کی روحِ رواں ہیں، اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ اس طریقۂ تعلیم کی ضرورت کا احساس کسی نہ کسی وقت ہر صاحبِ احساس و فرض شناس مدرس کو نہ ہو۔ یہ ایک الگ چیز ہے کہ وہ اس احساس کو قوت سے فعل میں لانے کے لیے حرکت تک نہ کرے۔ (باقی آئندہ)

کتب لائبریری

برائے پرائمری و لوئر مڈل کلاسز

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت	نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱	کہانیوں کی پہلی پروفیسر رام سروپ کوشل	۴ر۱۱ پائی	۲۰	دلچسپ تاریخی کہانیاں حصہ سوم	۷ر
			۲۱	کام کی باتیں حصہ اوّل	۳ر۹ پائی
۲	〃 〃 دوسری 〃 〃	۱ر۶ 〃	۲۲	〃 〃 〃 دوم	۲ر۳ 〃
۳	〃 〃 تیسری 〃 〃	۶ر۷ 〃	۲۳	قصص ہند حصہ اوّل	۳ر۲ 〃
۴	پیاری کہانیاں اوّل	۶ر	۲۴	〃 〃 〃 دوم	۲ر۸ 〃
۵	〃 〃 دوم	۵ر	۲۵	قصص ہند کا مجموعہ زنانہ	۱۱ر
۶	〃 〃 سوم	۷ر	۲۶	حسینہ اور وحشی	۱ر۵ 〃
۷	میٹھی کہانیاں اوّل	۲ر	۲۷	شہزادہ مہربان	۶ر۲ 〃
۸	〃 〃 دوم	۳ر۷ پائی	۲۸	راما سیتا	۱ر۱۰ 〃
۹	〃 〃 سوم	۳ر۱۱ 〃	۲۹	جادو کا مٹکا مسٹر رلیا رام	۳ر
۱۰	〃 〃 چہارم	زیر طبع	۳۰	دروپدی	۱ر۸ پائی
۱۱	〃 〃 پنجم		۳۱	مہاراجہ رنجیت سنگھ . .	۶ر۴ 〃
۱۲	امرت کہانیاں نمبر ۱	۲ر۹ پائی	۳۲	خلیفہ ہارون الرشید	۴ر
۱۳	〃 〃 نمبر ۲	۳ر۱۰ 〃	۳۳	رانا اشوک	۵ر
۱۴	〃 〃 نمبر ۳	۲ر۵ 〃	۳۴	مہارانا پرتاپ	۲ر۱ پائی
۱۵	انوار سہیلی کے انمول موتی	۲ر۸ 〃	۳۵	شہاب الدین شاہجہان . .	۱۰ر۲ 〃
	〃 〃 حصہ ۱ 〃 〃		۳۶	شیر شاہ سوری . .	۱۱ر۲ 〃
۱۶	〃 〃 حصہ ۲ 〃 〃	۴ر۱۰ 〃	۳۷	نصیر الدین ہمایوں . . .	۱۰ر۲ 〃
۱۷	〃 〃 حصہ ۳ 〃 〃	۲ر۵ 〃	۳۸	اورنگ زیب عالمگیر .	۹ر۲ 〃
۱۸	دلچسپ تاریخی کہانیاں حصہ اوّل	۷ر۷ 〃	۳۹	نورالدین جہانگیر . . .	۳ر۲ 〃
۱۹	〃 〃 〃 〃 دوم	۸ر۱۱ 〃	۴۰	شہاب الدین غوری . . .	۸ر۲ 〃

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت	نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۴۱	سلطان علاؤالدین خلجی ..	۲؍۱ پائی	۶۶	بہادر شہزادہ	۲؍۱ پائی
۴۲	فیروزالدین تغلق ...	۳؍	۶۷	جوتی موتی	۲؍۱۰ ″
۴۳	امیر تیمور	۲؍۷ ″	۶۸	جواہرات کا خزانہ ...	۳؍۷ ″
۴۴	پرتھوی راج	۲؍۸ ″	۶۹	چھوا اور خزانہ ہوا باتصویر	۲؍
۴۵	محمود غزنوی	۲؍۶ ″	۷۰	علی بابا چالیس چور	۴؍
۴۶	مصر کی داستان ..	۳؍	۷۱	علاؤالدین و عجیب وغریب لیمپ	۴؍۶ ″
۴۷	جاپان کی کہانی	۴؍			
۴۸	چین کی کہانی ...	۳؍۶ پائی	۷۲	ملّا دو پیازے کا سفر ..	۳؍
۴۹	مستورات چین و جاپان ..	۴؍	۷۳	سادھو کنور سدھارتھ یعنی مہاتما بدھ کا دھرم گیان	۳؍
۵۰	ایران کی کہانی	۲؍			
۵۱	ایشیائی روم ...	۲؍۷ ″	۷۴	نیشاپور کا سوداگر ...	۲؍۱ پائی
۵۲	ٹرکی (یورپی روم) ..	۲؍۸ ″	۷۵	پرستان کا موچی ...	۳؍
۵۳	لنکا	۱؍۱۱ ″	۷۶	سندر پیاری ...	۳؍
۵۴	بصرہ و بغداد	۵؍	۷۷	چاندی کی کنجی	۳؍
۵۵	یونان	۲؍	۷۸	سلکِ جواہر نمبر۱ (حکمرانی کا گر)	۲؍۶ پائی
۵۶	تین سوال	۲؍۷ پائی	۷۹	″ ″ نمبر۲ (اوج و پستی)	۱؍۱۱ ″
۵۷	امرت ورشا ...	۳؍۱۰ ″	۸۰	″ ″ نمبر۳ (شہید الفت)	۱؍۶ ″
۵۸	زمانہ سلف کے قصّے کہانیاں نمبر۱ داؤد بادشاہ	۲؍۶ ″	۸۱	سلکِ جواہر مردِ میدان	۱؍۶ ″
۵۹	کہانیاں بتّیس پُتلیاں حصّہ اوّل	۳؍۹ ″	۸۲	″ ″ نیک و بد	۱؍۹ ″
			۸۳	″ ″ عیب و ہنر	۱؍۴ ″
			۸۴	″ ″ جہاں گرد	۱؍۶ ″
۶۰	″ ″ ″ دوم ″	۴؍۵ ″	۸۵	″ ″ جواب باصواب	۱؍۱۰ ″
۶۱	ہیرا لال	۲؍۶ ″	۸۶	″ ″ سخاوت کی انتہا	۱؍۲ ″
۶۲	خوفناک خواب	۲؍	۸۷	″ ″ حُسنِ تدبیر	۱؍۳ ″
۶۳	دولت کی پٹاری	۲؍۱ ″	۸۸	ڈرامہ نئی بستی یعنی شہریّت	۱؍۳ ″
۶۴	سادھو کی چٹکی	۲؍			
۶۵	نیلا باز	۲؍۱۱ ″	۸۹	ڈرامہ غم خوارِ عالم ...	۱؍۷ ″

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۹۰	مہاراجہ بکرماجیت اور اُس کا تخت	۱/۶ پائی
۹۱	سنہری گیت حصہ اوّل	۴/۲ 〃
۹۲	〃 〃 دوم	۴/۲ 〃
۹۳	〃 〃 سوم	۷/۲ 〃
۹۴	جو مانگو	۳/
۹۵	اسرار دل	۵/
۹۶	جارج واشنگٹن . . .	۱/۶ پائی
۹۷	سکاؤٹوں کا بادشاہ . .	۱/۸ 〃
۹۸	لوہے کا بادشاہ . . .	۱/۶ 〃
۹۹	آزادی کا بادشاہ . . .	۱/۱۱ 〃
۱۰۰	صابن کا بادشاہ . . .	۱/۱ 〃
۱۰۱	ڈاکو کی مرمت	۶/۲ 〃
۱۰۲	چھو منتر	۵/۴ 〃
۱۰۳	فرصت کے کام	۴/۳ 〃
۱۰۴	دنیا کے کام کاج	۵/۵ 〃
۱۰۵	آداب و اخلاق	۱۰/
۱۰۶	موقعہ	۴/۵ 〃
۱۰۷	نیک اطوار	۲/
۱۰۸	خوشی کا کھیل	۱۰/۳ 〃
۱۰۹	بہادر محمود	۱/۷ 〃
۱۱۰	سہراب و رستم	۱/۲ 〃
۱۱۱	دھوپ چھاؤں	۳/
۱۱۲	راجہ ہریش چندر . . .	۲/
۱۱۳	گورو کے پانچ بچن	۸/۱ 〃
۱۱۴	سنہری پرندہ	۱/۲/۱ 〃

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱۱۵	کرشن جی کا بچپن	۱/۴ پائی
۱۱۶	تبدیلِ قسمت	۱/۹ 〃
۱۱۷	جادو کا قلعہ	۳/
۱۱۸	راجہ گوپی چند	۱/۷ پائی
۱۱۹	بندر کی ہوشیاری . .	۱/۶ 〃
۱۲۰	بارہ بھائی	۱/۱۰ 〃
۱۲۱	مشاہیر عالم حصہ اوّل	۳/
۱۲۲	〃 〃 〃 دوم	۳/
۱۲۳	〃 〃 〃 سوم	۳/

کتب لائبریری

برائے لوئر و اپر مڈل سکولز

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱	رسوم ہند حصہ اوّل . .	۲/۶ پائی
۲	〃 〃 〃 دوم . .	۴/۷ 〃
۳	تخت سلیمانی . . .	۷/۸ 〃
۴	الہ دین چراغ	۶/۴ 〃
۵	مہابھارت کی کہانی . .	۶/۵ 〃
۶	رامائن کی کہانی . . .	۲/۸ 〃
۷	پیارا گورو نانک . . .	۷/۳ 〃
۸	سید انشاء اللہ خاں انشا	۱/۴ 〃
۹	سوانح عمری نواب مرزا خاں	۲/۴ 〃
۱۰	داغ	
۱۱	〃 نذیر . . .	۶/۳ 〃
۱۲	〃 میر درد . .	۴/۳ 〃
۱۳	〃 میر تقی . .	۵ ۵

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت	نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱۴	سوانح عمری ...	۲,۳ پائی	۳۷	ہندوستان اور جنگ عالمگیر	۴,۲ پائی
۱۵	" " مولانا نذیر احمد مرحوم	۸,۳ //	۳۸	شہریت	۸,۴ //
۱۶	" " مرزا غالب	۱۰,۳ //	۳۹	آئین شہریت و قوانین صحت	۹/
۱۷	پھولوں کی ٹوکری . . .	۴/	۴۰	حیات کی قوت و طاقت کا سرچشمہ	۴/
۱۸	سچے موتی	۱,۳ //	۴۱	باغ عالم	۵,۱۳ //
۱۹	آزمائش	۴/	۴۲	ہندوستان کی تاریخی کہانیاں	
۲۰	سدا بہار کے پھول . .	۱,۳ //		" " حصہ اوّل "	۶,۱۴ //
۲۱	تاریخی کہانیوں کا سلسلہ	۸/	۴۳	" " حصہ دوم "	۹,۱۱ //
۲۲	اٹل	۹,۲ //	۴۴	انمول موتی کی مالا	۶/
۲۳	امتحان	۱۰,۵ //	۴۵	مشکلات کی عظمت . . .	۹/
۲۴	پنج رتن	۲,۴ //	۴۶	داستان وطن . . .	۶/
۲۵	بہادر مائیں	۱۰,۴ //	۴۷	مشاہیر عالم - حصہ چہارم	۳/
۲۶	غلطی کا شکار	۶/	۴۸	" " " پنجم	۴/
۲۷	سات سوال	۵,۶ //	۴۹	" " " ششم	۳/
۲۸	برہم رشی وشوامتر . . .	۵/	۵۰	" " " ہفتم	۴/
۲۹	کرشمۂ جہالت ماسٹر کنہیالال	۸/	۵۱	ہرشچندر مصنفہ رام سروپ کوشل ایم اے	۵,۲ پائی
۳۰	دلچسپ کہانیاں نمبر ۱ دوارکا پرشاد	۵/	۵۲	ہنومان " " "	۵/
۳۱	" " " نمبر ۲	۶/	۵۳	دھرو " " "	۳,۵ //
۳۲	ملکۂ مہر انگیز	۵/	۵۴	ارجن " " "	۱,۶ //
۳۳	فتنۂ عالم	۳/	۵۵	بھیشم " " "	۹,۵ //
۳۴	راجہ نل و مینتی	۴/	۵۶	پرہلاد " " "	۳,۵ //
۳۵	شکنتلا	۲,۷ پائی	۵۷	چندر ہاس " " "	۵/
۳۶	سیلاب خون . . .	۶,۶ //	۵۸	نرسی بھگت " " "	۵,۳ //

راۓ صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز ایجوکیشنل پبلشرز لاہور

Printed and published by L. Moti Ram, Manager, for Messrs. R.S.M. GULAB SINGH & SONS, at the Mufid-i-'Am Press, Chatterji Road, Lahore.

رجسٹرڈ نمبر ایل ۳۷۹۷

منظور کردہ جناب ڈائرکٹر صاحب بہادر سررشتہ تعلیم پنجاب
بوجب چٹھی ایم نمبر ۱۱۴۳۵ سی مورخہ ۲۲ مئی ۱۹۳۶ء

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اردو ایڈیشن

زیر ادارت

خان بہادر شیخ نور الٰہی، ایم اے، آئی ای ایس
بشیر احمد ہاشمی ایم اے۔ ایم۔ ای۔ ڈی پی ای۔ ایس
پروفیسر گوپال داس کھنہ، ایم اے، بی ٹی

Vol. 5. August, 1938. No. 5.

سالانہ چندہ: چار روپے

مفید اللّغات اُردُو

منظور کردہ جناب ڈائرکٹر صاحب پبلک انسٹرکشن پنجاب

بموجب سرکلر نمبر ۹- 23307 مورخہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۳۶ء

یہ کتاب محکمۂ تعلیم پنجاب کے منظور شدہ مدارس اور دیگر مکاتب کی ضروریات اور عام طلبا و شائقین کی سہولت کے لئے نہایت کوشش، محنت اور عرقریزی سے تیار کی گئی ہے۔

اس کتاب میں ہزاروں الفاظ عربی، فارسی، پنجابی، ترکی، انگریزی وغیرہ زبانوں میں جلی قلم سے مع ان اعرابوں کے نہایت صحت اور صفائی سے دیئے گئے ہیں اور ہر لفظ کے مقابلے میں اس کے معنی نہایت خوبی اور صفائی سے پیش کیے گئے ہیں۔

یہ کتاب عمدہ سفید کاغذ پر نہایت خوشخط چھپی ہے اور کپڑے کی خوبصورت سنہری جلد سے مزین ہے۔

قیمت فی جلد دو روپے (عہ)

المشتہران

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز

ایجوکیشنل پبلشرز لاہور

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اُردو ایڈیشن

جلد (۵) | اگست سنہ ۱۹۳۸ء | نمبر (۵)

فہرستِ مضامین

ایڈیٹوریل

آج کل ہندوستان کے گوشے گوشے میں تعلیمِ بالغاں کا چرچا ہو رہا ہے۔ مختلف صوبجات میں اس مطلب کے لیے کئی ایک انجمنیں قائم ہو گئی ہیں اور صوبجاتی حکومتیں بھی بڑی سرگرمی سے اس امر پر غور و خوض کر رہی ہیں کہ ان بدقسمت لوگوں کو جو زمانہ بچپن میں تعلیم سے بہرہ ور نہیں ہو سکے، اس سے مستفید کرنے کے لیے کون کون سے وسائل اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ اس قسم کی سرگرمی ہمارے ملک کے لیے بڑی ہی مبارک فال ہے، لیکن ہم ان اصحاب کو، جو اس میدان میں سرگرمِ عمل ہیں، آگاہ کر دینا چاہتے ہیں کہ تعلیمِ بالغاں ایک کافی پیچیدہ مسئلہ ہے، جس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنا اور جس کے حل کی مختلف شرائط کو بخوبی سمجھنا نہایت لازمی ہے۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ جس جوش و خروش کا ہم آجکل مظاہرہ کر رہے ہیں، کہیں وہی ہمیں نصب العین سے ہٹا کر کسی دوسری طرف نہ لے جائے۔ اس سلسلے میں شاید دوسرے ممالک کے تجربات ہمارے لیے خضرِ راہ بن سکیں، اس لیے مختصراً ہم یہاں ان کا ذکر کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔

انگلستان میں تعلیمِ بالغاں کے بانی ایلبرٹ مینسبرج ہوئے ہیں، جنھوں نے پہلے پہل ورکرز ایجوکیشنل ایسوسی ایشن (Workers Educational Association)

کی بنیاد رکھی۔ اس انجمن کے زیر اہتمام شہری اور دیہاتی اَن پڑھ مزدوروں اور کسانوں کو ابتدائی تعلیم دی جاتی ہے۔ ہر ایک طالب علم کو سال میں کم از کم بارہ اور زیادہ سے زیادہ چوبیس میٹنگوں میں شامل ہونا پڑتا ہے۔ تعلیم ضرورت کے موافق زبانی یا کتابی ہوتی ہے۔ اس بڑی انجمن کے ساتھ کئی اور چھوٹی چھوٹی انجمنیں بھی کام کر رہی ہیں، جن کا نصب العین تو ایک ہی ہے، لیکن تدریس کے طریقے مختلف ہیں۔ ان میں قابلِ ذکر مندرجۂ ذیل ہیں۔

ویک انڈ اسکول (Week-end schools)، جو عام طور پر سنیچر اور اتوار کے روز لگتے ہیں۔

وَن ڈے اسکول (One day Schools)، جو ہفتے میں صرف ایک بار لگتے ہیں۔

ورکرز ٹریول ایسوسیشن (Workers Travel Association) جس کا کام یہ ہوتا ہے کہ مزدوروں کو مشہور تواریخی مقامات پر لے جائیں اور اُن کے معلومات میں اضافہ کریں۔

ابتدائی تعلیم کے علاوہ انگلستان کی کئی ایک یونیورسٹیاں بالغ طلبہ کو اعلیٰ تعلیم دینے کا بھی انتظام کرتی ہیں۔ یہ تعلیم یونیورسٹی ٹیوٹوریل کلاسز کے ذریعے دی جاتی ہے۔ ان میں طلبہ کو تین سال تک، ہر سال میں چوبیس ہفتے اور ہر ہفتے میں دو گھنٹے تک تعلیم حاصل کرنی پڑتی ہے۔ عام مزدور یا کسان کے فارغ اوقات بہت کم ہوتے ہیں اور وُہ تعلیم کے لیے زیادہ وقت نہیں نکال سکتا۔ اس لیے جو طلبہ اس قسم کی اعلیٰ تعلیم سے فائدہ اُٹھاتے ہیں، اُن کی تعداد بہت زیادہ نہیں۔ تاہم اندازہ لگایا گیا ہے کہ انگلستان میں

پچاس ہزار طلبہ اس قسم کی تعلیم سے ہر سال مستفید ہوتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بالغ طلبہ کے لیے نصابِ تعلیم کیا ہونا چاہیے۔ یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ جو اشیا ایک بچّے کے لیے باعثِ دلچسپی ہیں، وہ ایک بالغ طالب علم کے لیے دلچسپی کا موجب نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے بالغ طلبہ کے لیے نصابِ تعلیم بالکل مختلف ہوگا۔ اس اصول کو مدِّ نظر رکھ کر انگلستان میں ایسے طلبہ کے لیے مندرجہ ذیل تین قسم کی تعلیم تجویز کی گئی ہے۔

(۱) ایسی تعلیم، جو جمہوریت کے شہری حقوق اور اصول سے واقفیت دلا سکے۔ اس غرض کے لیے شہروں اور دیہات میں مختلف انجمنیں کام کر رہی ہیں۔ مردوں کے علاوہ مستورات میں بھی اس قسم کی تعلیم کا خاص طور پر چرچا ہے۔

(۲) مختلف فنون کی تعلیم، مثلاً ڈراما اور موسیقی وغیرہ۔

(۳) دیہاتی دستکاریوں کی تعلیم۔

مندرجہ بالا سطور سے ثابت ہوتا ہے کہ تعلیم بالغاں ایک اہم مسئلہ ہے اور وقت اس بات کا مقتضی ہے کہ ہم اس کے حل کے لیے اشتراکِ عمل کریں اور پورے غور کے ساتھ ایک باقاعدہ لائحۂ عمل تیار کریں اور یہ کام تنہا محکمۂ تعلیم کا نہیں، بلکہ یہ مختلف محکموں اور انجمنوں کا مشترکہ کام ہے۔ ہمارے ملک کے روزناموں میں جو خبریں اس تعلیم سے متعلق گاہے گاہے شائع ہوتی رہتی ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ گو مختلف انجمنیں اس کام میں کافی دلچسپی لے رہی ہیں، لیکن تعلیم کا اصلی کام بڑی حد تک اسکول اور کالج کے طلبہ کے سپرد کیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ طلبہ بھی اس کام میں بہت کچھ ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ لیکن اس بات کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ تعلیم بالغاں بچّوں کا

کھیل نہیں۔ اس کے لیے انسانی فطرت کا مطالعہ، بالغ طلبہ کے ماحول کا علم، اُن کی دلچسپی سے آگہی اور نفسیاتِ تدریس پر عبور لازمی ہے۔ ان حالات کو مدِّنظر رکھتے ہُوے ہم اس تعلیم کی کامیابی کے لیے یہ رائے پیش کرنا چاہتے ہیں کہ صوبجات کی مختلف انجمنوں کے علٰحدہ علٰحدہ کام کرنے کے بجائے سارے ملک کے لیے ایک مشترکہ مرکزی انجمن کی بنا ڈالی جائے۔ جس کی غرض یہ ہو کہ تعلیمِ بالغان کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کرتی رہے اور اپنے معلومات سے صوبجاتی انجمنوں کی رہنمائی بھی کرے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس مرکزی انجمن کی موجودگی میں ہم ایک لائحۂ عمل کے موافق کام کر سکیں گے اور اپنی موجودہ سرگرمی سے پورا پورا فائدا اُٹھاتے ہُوے، اپنے نصب العین تک بخوبی پہنچ سکیں گے۔

تربیتِ اطفال

از

سردار موہن سنگھ ایم اے، ہیڈ ماسٹر، خالصہ ہائی اسکول، پٹیالہ

(گزشتہ سے پیوستہ)

عادت

عادت کی اہمیت عادت شروع شروع میں ایک تارِ عنکبوت سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی، لیکن بعد میں ایک ایسی زنجیر بن جاتی ہے جس کو توڑنا ہمارے بس کی بات نہیں ہوتی۔ عادت کی اہمیّت کا احساس ہمیں اس وقت ہوتا ہے، جب ہم معلوم کرتے ہیں کہ ہماری زندگی کے ننانوے مرحلے عادات کے ذریعے طے ہوتے ہیں اور باقی کے ایک مرحلے میں عادت ہماری رہنمائی نہیں کرتی۔ ہمارا سونا جاگنا، چلنا پھرنا، کھانا پینا، کام کرنا، تفریح، پابندیِ اوقات حتیٰ کہ تضیع اوقات بھی عادات ہی کے زیرِ اثر ہیں۔ آپ نے کئی دفعہ سُنا ہوگا کہ میاں فلاں شخص کو تو خفا ہونے اور کڑھنے کی عادت ہے۔ اسی طرح ہمارا حسنِ سلوک اور اخلاق بھی عادت ہی میں شامل ہے۔ بیشتر عادات ایسی پیدا ہو جاتی ہیں کہ ہم خود ان کے ہاتھوں نالاں ہوتے ہیں، مگر مجبور ہوتے ہیں اور اُن کو چھوڑ نہیں سکتے۔ کاش ہمارے ماں باپ اس بات کو محسوس کرتے اور بچپن ہی میں جبکہ عادات کی بنیاد پڑتی ہے، ہماری رہنمائی کرتے۔

عادت کی بنیاد عادت کی بنیاد بہت چھوٹی عمر میں رکھی جاتی ہے۔ جب لائق ماں

اپنے شیر خوار بچّے کو مقررہ اوقات پر دودھ دیتی ہے، تو وہ ایک اچھی عادت پیدا کرتی ہے۔ اس کے برخلاف بہت سی مائیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ اپنے بچّوں کو پہلے تو معمولی چیز دینے سے بھی انکار کر دیتی ہیں، مگر جب بچہ برہم ہو کر زمین پر لوٹنے لگتا ہے اور رو رو کر آسمان سر پر اُٹھا لیتا ہے، تو وہی ماں بھاگی بھاگی آتی ہے اور چپ چاپ وہی چیز اسے دیدیتی ہے۔ بعض بچّے تو چیز کو لے کر خوش ہو جائیں گے، مگر بعض مطلوبہ چیزیں لینے کے باوجود شاکی ہی رہیں گے۔ گویا اس چھوٹی سی عمر میں ہی چند بُری عادتیں ایسی جڑ پکڑ جاتی ہیں کہ باقی تمام زندگی وہ امکانی کوشش کرنے کے باوجود اپنے آپ پر قابو پانے سے قاصر رہتے ہیں۔

عادتوں کو ہماری زندگی کے روز مرّہ میں بڑا دخل ہے۔ اچھی اور بُری عادتیں سب سیکھنا پڑتی ہیں۔ اگر شروع ہی سے اچھی عادتیں سکھائی جائیں، تو یہ عادتیں نہ صرف بچّوں کی خوشی کا موجب ہونگی، بلکہ اُن کے والدین کے لیے بھی یہ عادتیں دائمی خوشی کا پیش خیمہ ہونگی۔ اچھی عادتوں کی بنیاد رکھنے میں جو جو تکالیف اُٹھانا پڑینگی، ان کا صلہ اُنھیں بچّوں کی نیکی، سادگی، خوش خلقی، ظاہری اور باطنی خوبصورتی کی شکل میں ملیگا اور بچّوں کی اپنی زندگی نیک صفات کے زیورات سے مرصّع اور تندرستی کی دولت سے مالامال ہوگی۔

<u>عادت کا ظہور</u> | کسی ایک عمل کو بار بار ایک ہی طریقے پر دہرایا جائے، تو انسان اس عمل پر عادی ہو جاتا ہے۔ اسی کا نام عادت ہے۔ لائق ماں پیدائش سے ہی بچّے میں نیک عادات ڈالتی ہے۔ مثلاً وقت مقررہ پر کھلانا، سلانا، نہلانا وغیرہ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچّے کی زندگی خاص نظم و ترتیب میں آجاتی ہے۔ بچّے کا ہاضمہ درست رہتا ہے، کیونکہ معدہ کو اپنے کام میں آرام کے لیے وقفہ بھی مل جاتا ہے۔ ایک دو دن

کے عرصے ہی میں بچّے کو وقت مقررہ پر بھوک لگنے کی عادت ہو جاتی ہے اور بعد ازاں بچّے کو کھیلنے، ہاتھ پاؤں مارنے کی خواہش ہوتی ہے اور رفع حاجت بھی وقت مقررہ پر ہونے لگتی ہے، جس سے بچہ تندرست رہتا ہے اور صفائی میں سہولت ہوتی ہے۔ یہ ہمارے مشاہدے میں آیا ہے کہ بچّوں کو اگر تنہا سونے کی عادت ڈالی جائے، تو وہ ایک ماہ کی عمر میں ہی ماں سے الگ سونے لگتے ہیں۔ وہ ساری رات آرام سے سوئے رہتے ہیں، کوئی چیز ان کی نیند میں خلل نہیں ڈالتی۔ گویا عادات چھوٹی سے چھوٹی عمر میں سیکھی جا سکتی ہیں۔ بچپن میں دماغ کے رگ و ریشے نہایت ملائم اور نرم ہوتے ہیں اور بیرونی اثرات سے بہت جلد متاثر ہو جاتے ہیں۔ اس عمر میں عادات کا بنانا بیحد آسان ہوتا ہے۔

باغ میں سیر کرتے کبھی آپ نے ایسے درخت کو بھی دیکھا ہوگا، جس کی نرم شاخ کو مالی نے رسیوں سے باندھ رکھا ہوتا ہے۔ مالی اس شاخ کی نشو و نما اپنی منشا کے موافق کرنا چاہتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اگر کچھ مدّت تک اس شاخ کو ایک خاص حالت میں رکھا جائے، حتّٰی کہ لکڑی کچھ سخت ہو جائے، تو وہ مستقل طور سے ہی خاص صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہ مثال عادت کی حالت کو ہو بہو ظاہر کرتی ہے۔

اپنے بیان کی تصدیق میں ہم ایک اور مثال پیش کرتے ہیں۔ بعض بچّوں کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب تک کوئی اُن کو بندر کی طرح نچاتا نہ رہے، اُن کو ایک پل چین نہیں آتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ساری دنیا آرام کرتی ہے، لیکن اس بچّے کے ماں باپ اُسے رات بھر لیے لیے پھرتے ہیں اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ ساری رات آنکھوں میں کاٹ دیتے ہیں۔

کیا ہم عادات پیدا کر سکتے ہیں؟ یوں تو عادت پیدا کرنے کے لیے ایک ہی طریقہ ہے کہ کسی عمل کو بار بار دہرا لیا جائے، لیکن دہرانے کے ساتھ ساتھ اگر قوّتِ

ارادی بھی شامل ہو، تو یہ عمل بہت جلد نتیجے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہم عادات پیدا کر سکتے ہیں۔ اس سوال کا جواب غور و خوض کا محتاج ہے۔ ہم عادتیں پیدا کر بھی سکتے ہیں اور نہیں بھی۔ ہمارے مطالعے میں آیا ہے کہ ایک شریف خاندان کا ایک فرد جنگِ عظیم کے دوران میں کپتان کے معزز عہدے پر ممتاز تھا۔ جنگ ختم ہُوا، تو وہ اپنے گھر واپس آ گیا۔ اس کا چچا ایک تجارتی کوٹھی کا مالک تھا۔ گھر آتے ہی چچی جان نے اُس سے پہلی بات یہ کہی کہ گھر میں پابندیِ اوقات پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ چنانچہ صبح کا کھانا آٹھ بجے ملتا ہے۔ تمھارے چچا صاحب ٹھیک نو بجے روانہ ہو جاتے ہیں۔ مگر اگلے روز ہی کپتان صاحب دس بجے بستر استراحت سے اُٹھے اور گیارہ بجے صبح کھانے کے لیے آواز دی۔ چچی صاحبہ نے کہا:

"کل تو ہم سمجھے تھے کہ سفر کی تکان کی وجہ سے دیر میں اُٹھے ہو، مگر آج بھی وہی وقت ہو گیا۔ اب اس وقت کھانا کہاں سے آئیگا۔"

"اچھا، مَیں تو سمجھا تھا کہ گھر میں آزادی ہو گی۔ مگر آج معلوم ہوا کہ مجھے الگ مکان لینا پڑے گا۔"

"نہیں ایسا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے تو خیال تھا کہ فوج میں علی الصبح جگایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ صبح اُٹھنے کی عادت ہو گئی ہو گی۔"

"نہیں چچی جان، جب صبح بیداری کا بگل بجتا تھا، تو ہم اپنے جی میں کہا کرتے تھے کہ اچھا دو چار دن اور یہ مجبوری رہیگی۔ لڑائی ختم ہو جائے، تو ہم کسر نکال لیں گے۔ عادت کو موقع ہی نہیں دیا گیا۔"

بعینہٖ یہی حالت ہمارے ہاں کے اسکولوں میں ہوتی ہے۔ مجھے خالصہ کالج

کے ایک گریجویٹ سے پوچھنے کا اتفاق ہُوا۔ "تم پاٹھ کیوں نہیں کرتے؟" جواب ملا۔ "چار سال ہم اور کیا کرتے رہے ہیں"۔ دیکھیے کہ چار سالہ مشق کے باوجود پاٹھ کرنے کی عادت نہیں ہو سکی۔

اسی سال ہم کو گوروکل کانگڑی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ قدرتی طور پر وہاں لڑکوں کو سندھیا ہُون وغیرہ پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ جب مَیں نے پوچھا کہ گوروکل چھوڑنے کے بعد کتنے فیصدی آدمی اس سندھیا ہون کو جاری رکھتے ہیں، تو یہ سُن کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ پورے اٹھارہ سال کی سر دردی بھی عادت پیدا نہ کر سکی۔ مگر ان باتوں سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکالنا چاہیے کہ اس مشق کا کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ اصول یہ ہے کہ جو عمل بار بار کیا جائے، وہ ہمیں اچھی طرح آ جائیگا۔ وہ پاٹھ ایک دکھاوا تھا اور سندھیا ہُون ظاہر داری۔ چنانچہ اس لمبی مشق نے اُن کو ظاہر داری اور زمانہ سازی میں پکا کر دیا۔

ان مثالوں کا اطلاق اس عمر کے بچّوں پر ہوتا ہے جس میں وُہ کم و بیش کسی اسکول میں تعلیم پا رہے ہوں۔ اصول گو وہی ہیں، مگر طریقے جداگانہ۔ چونکہ ہمارا مضمون پانچ برس سے کم عمر کے بچّوں سے متعلق ہے، اس لیے اب ہم ان طریقوں کا ذکر کرتے ہیں، جن کے ذریعے ماں باپ اپنے چھوٹے بچّوں کی زندگی میں خاطر خواہ عادات پیدا کر سکتے ہیں۔

چند اہم اصول

سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ بچّوں پر نصیحت کی نسبت مثال کا اثر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ دوسرے، بچّوں میں قوت متخیلہ (Imagination) مقابلۃً زیادہ ہوتی ہے۔ تیسرے، بچے قدرتی طور پر دوسروں کی مدد اور ہمدردی کے بہت زیادہ محتاج ہوتے ہیں اور ستائش اور دوسرے جذبات سے بہت جلد متاثر ہو جاتے ہیں۔

اب ہم ان اصول پر تفصیل سے بحث کریں گے۔

قانون تقلید اوپر ہم ذکر کر آئے ہیں کہ بچّوں پر مثال کا اثر لفظی نصیحت کی نسبت کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ پُرانی روایات ظاہر کرتی ہیں کہ ہمیشہ سے اس مسئلے کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ چنانچہ مشاہدے میں آیا ہے کہ بچّہ جو کچھ دیکھتا ہے، وہی کرتا ہے حتیٰ کہ بچّے کا چلنا، بولنا، دستار بندی اور مجلسی آداب ارد گرد کے لوگوں کی تقلید کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ گانے والوں کے گھروں میں بچّے باجا بجانا یا گانا بغیر کسی تعلیم کے سیکھ جاتے ہیں۔ لوہار، سنار، بنیے، کسان اپنے بچّوں کو اپنے کام کی کوئی خاص تعلیم نہیں دیتے۔ مگر جو مواقع ان کے بچّوں کو اپنے ماں باپ کی تقلید کے ملتے ہیں، وُہ اوروں کو نہیں ملتے۔ چنانچہ ان خاص فنوں میں جو مشق اُنھیں حاصل ہوتی ہے، وُہ اوروں کو نہیں حاصل ہوتی۔ ہمارے خیال میں تو پُرانی ہندوستانی جماعت بندی کی بنا اسی مسئلہ پر ہوگی۔

اس اصول کا اطلاق صرف پُرانے زمانے پر ہی نہیں، بلکہ موجودہ زمانے پر بھی ہوتا ہے۔ جب ہم کسی آدمی کو خاندانی شریف کہتے ہیں، تو ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ شریف خاندانوں میں خاص مجلسی آداب رائج ہیں۔ وُہ آداب و قواعد صرف وہی بچّے سیکھ سکتے ہیں، جو ایسے خاندانوں میں پلتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہنے سے کہ فلاں شخص خاندانی شریف ہے۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ صحبت کا تعلیمی اثر ہوتا ہے۔ عام طور پر بھی لوگ اس اصول کو مانتے ہیں اور جب کسی نیک آدمی کا لڑکا بدمزاج دیکھا جاتا ہے، تو تعجب کیا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف بہت سے لوگوں کو تو یہ یقین مشکل سے آئیگا کہ جرائم پیشہ اقوام میں بھی دیانت دار آدمی پیدا ہو سکتا ہے۔

ماں باپ کی ذمے داری ایسی حالتوں میں یہ ناممکن ہے کہ والدین جھوٹ بولیں اور

بچے جھوٹ کا سبق نہ سیکھیں۔ ماں باپ جھگڑیں اور بچّے کے دماغ میں اس تماشا کا کچھ اثر نہ ہو۔ والد صاحب دفتر سے آکر ہر ایک کو جھڑکیں اور بچّے اس کی تقلید نہ کریں۔ بعض دفعہ تو بچّوں کی کوئی خاص عادت دیکھنے سے ہمیں پہلی دفعہ احساس ہوتا ہے کہ یہ عادت خود ہم میں موجود تھی۔ مگر پہلے کبھی اس پر توجّہ نہ دی گئی۔

جب ہم پہلی دفعہ یہ معلوم کرتے ہیں کہ ہماری زندگی کا ہر نقص بچّوں کے لیے ایک مثال کا کام دیتا ہے اور ہماری چھوٹی سے چھوٹی فروگزاشت آنے والی نسل کے لیے گناہ کا بیج بن جایا کرتی ہے، تو اُس وقت ہمیں اپنی اہم ذمّہ داری کا احساس ہوتا ہے۔

جدید اسکول اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ صرف چھوٹے بچّے ہی اپنے گرد و پیش کے لوگوں کی نقل کرتے ہیں، بلکہ یہ اصول سن بلوغت تک اور مابعد بھی صحیح ثابت ہوتا ہے۔ اس بات کو مانتے ہوئے، مغرب کے اور خاص کر امریکہ کے بہت سے جدید اسکول بجائے کچھ سکھائے پڑھائے کے ایک فضائے علم پیدا کر دیتے ہیں۔ مثلاً جب بچہ پہلی دفعہ اسکول میں داخل ہوتا ہے، تو اس کو کھیل کھلونے کے کمرے میں لے جاتے ہیں یہاں ہر ایک کھلونے کے ساتھ تصویریں ہوتی ہیں اور آسان عبارت میں ان کے کھیلنے کے طریقے تشریح کے ساتھ لکھے ہوتے ہیں۔ شروع شروع میں بچہ اُستانی سے پوچھتا ہے، تو وُہ فوراً اس کو بتا دیتی ہے۔ مگر بچہ دیکھتا ہے کہ اور بچّے بہت کم سوال کرتے ہیں اور چھپی ہُوئی ہدایات سے فائدہ اُٹھا کر کھیلوں سے محظوظ ہوتے رہتے ہیں، تو اس کے دل میں بھی اس معمے کا حل معلوم کرنے کی خواہش ہوتی ہے۔ اس طریقے سے پہلا مرحلہ طے ہو جاتا ہے، یعنی پڑھنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔

مدرسے کے مظالم ہندوستان کے مشہور شاعر رابندر ناتھ ٹیگور نے جو دارالعلوم

موسومہ بہ وشو بھارتی کلکتہ کے پاس جاری کیا ہے۔ اس میں اسی اصول سے کام لیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اپنے بچپن کے تجربے کی بنا پر اسکول کے مظالم کا بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب جی چاہے کہ کہانی سُنی جائے، تو اسکول کا ٹائم ٹیبل جغرافیے کی قید لگاتا ہے اور جب طبیعت شعر و سخن پر مائل ہو، تو حساب کے سوال نکالنے پر مجبور کرتا ہے۔ اُستاد ایک خود مختار ظالم کے مانند ہر جذبے کے اظہار پر ننھّے بچّوں کے نازک جسموں کو اپنے موٹے سونٹے (مولابخش) سے تواضع کرتا ہے اور اُن کے نازک سے دل کو اپنی درشتی اور سختی سے گھائل کرتا ہے اور اس صورت سے بچّوں کی نازک ترین شخصیت استاد کی فرعونیت سے پامال ہو کر رہ جاتی ہے۔

نمونہ درسگاہ ٹیگور کو جب موقع ملا، تو آپ نے اپنی ساری جائداد ایک ایسے اسکول کے لیے وقف کر دی، جسے وُہ نمونہ بنا کر دکھانا چاہتے تھے اور اس میں دنیا کے مشہور شاعر، مصوّر، سنگتراش، ماہرانِ موسیقی، ریاضی دان اور علوم و فنون کے ماہرین کو دعوت دی۔ چنانچہ روس، جرمنی، انگلینڈ، فرانس، امریکہ، جاپان کے بہت سے لوگ وہاں رہتے ہیں اور جب ان میں سے کسی کا جی چاہتا ہے، تو کسی درخت کے نیچے اپنا ساز موسیقی لے کر بیٹھ جاتا ہے اور اس کے سُروں سے محظوظ ہوتا ہے۔ فطرت کے دلدادہ شاعر پر جب محویت کے چند لمحے آتے ہیں، تو سبزہ زار میں بیٹھ کر شعر کہنے لگتا ہے۔ مصوّر کے دل و دماغ میں جب کوئی دلفریب نظارہ کیف پیدا کرتا ہے، تو وہ اس کیف آور نظارے کو رنگوں اور خطوں کی قید میں لانے کے لیے کاغذ لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ کوئی پابندی نہیں۔ کوئی مجبوری نہیں۔ جس لڑکے کا جی چاہے، وُہ اپنی اندرونی کشش سے مجبور ہو کر ان کی کاریگری کا تماشا دیکھتا ہے اور جب جی میں ولولہ پیدا ہوتا ہے، تو اُسے وہ کام سیکھنے

کے لیے سہولت بہم پہنچا دی جاتی ہے۔ شانتی نکیتن کی وشو بھارتی میں آج تک کسی کو سزا نہیں ملی اور نہ ہی سزا کی کبھی ضرورت محسوس ہوئی۔

بچّے کا ماحول اب یہ بات تو اور تشریح کی محتاج نہیں کہ بچّے کی تربیت میں تقلید بہت کچھ اثر رکھتی ہے۔ مگر یہ بھی بھولنا نہیں چاہیے کہ بچّوں کی جبلّی فطرت جداگانہ ہوتی ہے دو بچّوں پر ایک ہی مثال کا اثر یکساں نہیں ہوتا، مگر مسئلۂ تخم تاثیر ایسا ہے اور جدّی اثرات ایسے پوشیدہ ہوتے ہیں کہ ان کی بنا پر کوئی اصلاحی تجویز اختیار نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے اُستاد یا ماں باپ کی رہنمائی کے لیے بچّے کے ماحول کو ہی قابو میں رکھنا چاہیے۔ بچے کی ارد گرد کی چیزوں میں مکان، کھلونے اور باقی لوازمات کا اتنا اثر نہیں ہوتا، جتنا ماں باپ کا۔ یعنی دوسرے الفاظ میں ماں باپ بچّے کی تربیت میں بہت کچھ دخل رکھتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جب بچّہ کچھ ہوش سنبھالتا ہے، تو وُہ اپنے آپ کو ماں کی نگرانی اور سہارے کا محتاج پاتا ہے۔ شروع شروع میں تو قطعی طور پر ماں کے رحم پر ہوتا ہے اور بغیر ماں کے شاید وہ زندہ بھی نہ رہ سکے۔ ماں ہی خوراک پہنچاتی ہے اور ماں ہی سردی گرمی کی جوکھوں سے آسائش پہنچاتی ہے اور ماں ہی دکھ تکلیف سے بچاتی ہے۔ اس لیے ماں نہ صرف بچّے کے ماحول، بلکہ اُس کی جان کا سہارا ہوتی ہے۔ بعض ماہرین علم النفس کا تو یہاں تک خیال ہے کہ کئی ماہ تک بچّہ اپنے اور اپنی ماں کے درمیان تفریق نہیں کر سکتا۔ اس لیے ایک طرف تو ماں کو اپنے بچّے کے خیالات و جذبات سمجھنے میں مہارت ہوتی ہے، دوسری طرف بچّے کو ماں کے خیالات و جذبات سے متاثر ہونے میں کمال۔

والدین اور بچّے کی یگانگت میں باپ کا درجہ ماں سے کمتر ہے۔ مگر چونکہ اس کو

ماں اور بچّے کا قرب حاصل ہوتا ہے اور ساتھ ہی ان سے بہت گہرا تعلق ہوتا ہے، اس لیے بچّے کی پرورش میں جو دخل ماں باپ کو حاصل ہے، وُہ اس کے ماحول کے کسی اور فرد کو ممکن نہیں۔ ظاہر ہے کہ والدین کا فرض صرف اس بات پر ختم نہیں ہو جاتا کہ بچّے کے ماحول میں ایک پُرلطف فضا پیدا کر دیں۔ جس میں اس کو نیک بننے کے مواقع ملتے رہیں، بلکہ خود بھی وضع داری کا نمونہ بن کر دکھائیں، تاکہ بچّہ ان کے نقشِ قدم پر چلتا رہے۔ دین و دنیا میں نیک نام ہو اور عقبیٰ کا ثواب حاصل کرے۔

(باقی آئندہ)

مغرب میں معلّمین کی فنی تربیّت

از

بشیر احمد ڈار، ایم اے، بی ٹی

(گزشتہ سے پیوستہ)

(۲) جرمنی :

۱۹۱۸ء اور ۱۹۳۳ء کے درمیانی وقت میں تربیت معلّمین کا مسئلہ جرمنی کیلیے بے حد پریشان کن تھا۔ قدیم تربیت گاہیں بند کردی گئی تھیں اور اس وقت یہ سوال پیش لرتھا کہ ان کی جگہ کس قسم کے بہترین ادارے قائم کیے جائیں۔ اس پُرانی تربیت گاہ میں لبہ کی عام تعلیم جاری رہتی تھی اور اس کے ساتھ ان کو فنّی تربیت بھی دی جاتی تھی جس ں عمومی اور خصوصی ہر دو طریق پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ معلّمین کے تعلیمی طریقوں کے للے اور خود اُن کی مشق کے لیے ایسی تربیت گاہوں کے ساتھ باقاعدہ مدرسے ملحق ھے۔ وفاقی دستور (۱۹۱۹ء) کی دفعہ ۱۴۳ پیراگراف ۲ کی رُو سے تمام ریاستوں نے ی ان تمام قدیم تربیت گاہوں کو بند کردیا اور اس لیے وہ معلمین کی تربیت کے لیے نئے طریقے اور ذرائع کی تلاش میں تھے۔ بعض ریاستوں نے تو کچھ نئے ذرائع تلاش لیے اور بعض دوسروں نے اپنی ہمسایہ ریاستوں کی ہی نقل اختیار کرلی۔

پرشیا (Prussia) میں ثانوی تعلیم حاصل کرنے کے بعد طلبہ دو سال کیلیے بیگاہ معلمین Padagogische Akademie میں فنی تربیت حاصل کرتے ہیں۔ اس بیگاہ کا جامعہ یا کسی اعلیٰ تعلیمی ادارے سے کوئی تعلق نہیں۔ بعض ریاستوں میں اسی طرح

کی دو سالہ درسگاہ ہے، جس کو Institute کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ بعض دیگر ریاستوں میں دو سال تک جامعات میں تعلیم دی جاتی ہے اور تیسرے سال میں کسی درسگاہ میں خالص فنی تربیت دی جاتی ہے۔

معلّمین کی درسگاہیں بالکل نئی قسم کے ادارے ہیں، جو جنگ عظیم کے بعد قائم کیے گئے۔ یونیورسٹی کے تعلیمی انتظام کے مقابلے میں یہ ادارے زیادہ سود مند ہیں، کیونکہ یہاں معلّمین کی کلچرل تربیت کا زیادہ عمدہ بندوبست ہو سکتا ہے۔ یہ درسگاہیں مذہبی اختلافات کو مدِنظر رکھتے ہوئے قائم کی گئی تھیں یہاں لڑکے اور لڑکیاں اکھٹے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان مدارس میں اصول تعلیم کے مضمون کو نصاب میں داخل کیا گیا ہے۔ لیکچر اور عام روایتی تعلیم کے علاوہ سیر و تفریح اور دیگر ایسے علمی کام بھی تعلیم کا لازمی جزو قرار دیے گئے ہیں، جن سے طلبہ میں ذوق مطالعہ اور آزادیِ رائے پیدا ہونے کا امکان ہے۔ معلّمین کے طریقۂ تعلیم کے مطالعے اور مشق کے لیے ملحقہ مدارس عام سے فائدہ اُٹھایا جاتا ہے۔ پہلا سال صرف مطالعہ کے لیے وقف ہوتا ہے اور تعلیم کی مشق کے لیے دوسرا سال وقف رہتا ہے۔ علمی اور فنّی مضامین پر زیادہ توجّہ دی جاتی ہے اور جسمانی ورزش تربیت کا ایک لازمی حصّہ ہے۔

تربیت کے اختتام پر طلبہ معلّمی کے پہلے امتحان میں بیٹھتے ہیں۔ جس میں طلبہ کی فنی قابلیت اور صحیح طریقوں کے استعمال کی قدرت کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد طالب علم کو عارضی ملازمت مل جاتی ہے۔ جس طرح فرانس میں ہوتا ہے۔ اس سے دو سے پانچ سال بعد معلّمی کا دوسرا امتحان ہوتا ہے، جو تمام تر فنّی اور علمی حیثیت رکھتا ہے۔ کامیاب طلبہ کے لیے مستقل ملازمت کا رستہ کھل جاتا ہے۔ ان درسگاہوں میں فیس نہیں ہوتی، لیکن اپنے رہنے سہنے کے خود طلبہ ذمّے دار ہوتے ہیں

اور افلاس کی حالت میں حکومت سے مدد بھی ملتی ہے۔

(Padagogisches Institute) یعنی مدرسۂ تربیت معلّمین۔ یہ مدرسہ کئی حیثیت سے مقامی صنعتی مدرسے سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ تعلیم بھی دیگر فنون کی طرح ایک فن ہے جس کا انتظام حکومت کے فرائض میں شامل ہے۔ پس معلمی کی تربیت دیگر اعلیٰ فنون کی تعلیم سے محض درجے میں مختلف ہے۔ نظری اور علمی مضامین اور مشق تقریباً ویسی ہی ہے جیسی کہ مندرجہ بالا درسگاہوں میں۔ علمی اور فنی مضامین اور جسمانی ورزش کو نصاب میں خاص جگہ دی گئی ہے۔ معلّمی کے پہلے امتحان میں طلبہ کو صرف اسی وقت بیٹھنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ جب پانچ ٹرم گزر جائیں۔ یہ وقت مدرسۂ تربیت معلمین کی مقررہ مدّت سے تجاوز کر جاتا ہے۔ اس قانون کا عندیہ صرف یہ ہے کہ تعلیم کے ذمّے دار افسروں کو اس چیز کا احساس ہے کہ اس مقررہ مدّت میں توسیع کی ضرورت ہے۔ ان مدارس میں کسی قسم کے مذہبی امتیازات نہیں اور لڑکے اور لڑکیاں اکھٹے تعلیم پاتے ہیں۔ صنعتی اعلیٰ مدارس کی طرح یہاں بھی فیس لی جاتی ہے لیکن حاجتمند طلبہ کے لیے ہر قسم کی آسائش موجود ہوتی ہے۔

سیکسنی (Saxony.) کے صوبے میں مدرسۂ تربیت معلمین اور جامعۂ لیپزگ دونوں نے مشترکہ طور پر معلمین کی تربیت کے لیے تین سال کی خواندگی کا انتظام کیا ہے۔ یہ طریقہ اس ریاست میں قدیم سے رائج تھا۔ جب طلبہ نارمل اسکول کی خواندگی ختم کرلیں، تو انھیں اصولِ تعلیم کے مضمون کے لیے جامعۂ لیپزگ میں بھیجا جاتا ہے۔ جامعہ میں طلبہ کو عام فنی مضامین کی اور مدرسے میں خاص فنی مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے۔ طلبہ کی تربیت کے عملی پہلو کا انتظام بھی مدرسے ہی کے ذمّے ہے۔ جامعہ اور مدرسہ دونوں میں فیس کی

شرح بہت کم ہے۔

جامعہ ہیمبرگ (Hamburg) نے تربیت معلمین کے لیے ایک علیحدہ درسگاہ (Education Seminar) قائم کی ہے۔ جس کی مدت خواندگی تین سال ہے اور طلب کے مطالعہ اور علمی کام کے لیے کئی ایک مختلف مدارس قائم کیے ہیں۔ اس درسگاہ کی خصوصیت یہ ہے کہ طلبہ کو بہت وسیع اور گہری نظری تعلیم دی جاتی ہے اور جب طالب علم عارضی طور پر معلم کی حیثیت میں کام شروع کرتا ہے، تو اس وقت اس کو عملی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان حالات میں معلمی کا دوسرا امتحان چھٹے سال کے بعد ہوتا ہے۔ علمی اور فنی مضامین کی تعلیم نظری تعلیم کے ساتھ نہیں دی جاتی، لیکن جسمانی ورزش پر بڑا زور دیا جاتا ہے۔ مگر عارضی ملازمت کے اختتام پر ان مضامین کا علم لازمی ہے۔ تمام تعلیم کے لیے فیس مقرر ہے، جو افلاس کی حالت میں معاف کی جاسکتی ہے۔

نازی حکومت کے بعد دیہاتی مدارس کے معلمین کی تربیت کی طرف زیادہ توجہ دی جانے لگی ہے اور اس مقصد کی صحیح تکمیل کے لیے بعض ایسی درسگاہوں کو دیہاتی علاقوں میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ ۱۹۳۳ء میں ایک خاص درسگاہ اس مقصد کے لیے قائم کی گئی ہے، جو صرف دیہاتی تعلیم و تعلم کے لیے وقف ہے۔ سیاسی خیالات کے زیر اثر ان تمام قدیم درسگاہوں کے نام تبدیل کر دیے گئے ہیں۔ ان کے نصاب میں بھی کافی تغیر کر دیا گیا ہے۔ علم معاشرت، فوجی جغرافیے اور سرحدی علاقوں کی واقفیت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے تاکہ آئندہ ابتدائی مدارس میں مناسب تبدیلیاں کی جاسکیں۔ ان درسگاہوں میں داخلے کے لیے کئی ایک نئی شرائط بڑھا دی گئی ہیں۔ صرف وہی طالب علم داخل ہو سکتے ہیں، جو آرین نسل کے ہوں اور جنھوں نے باقاعدہ فوجی تعلیم حاصل کی ہو اور سرکاری سیاسی سبھا کے

رکن ہوں۔ داخلے سے قبل امتحان ہوتا ہے، جس میں ان کی موسیقی کی قابلیت کا اندازہ کیا جاتا ہے اور دیکھا جاتا ہے کہ کہاں تک وہ جسمانی ورزش اور عام کھیلوں کی تعلیم دینے کے قابل ہیں۔ آخری مستقل ملازمت سے پہلے لازم ہے کہ چھ ماہ تک ہر طالب علم مفت عملی خدمت سرانجام دے چکا ہو اور یہ مدت اُس کی عارضی ملازمت کا ہی حصہ شمار ہوتی ہے۔

(۳) اطالیہ:

اطالیہ میں ابتدائی مدرسے کا معلّم اپنی فنّی تربیت ۱۸ برس کی عمر میں ثانوی درجے کے مدرسے institute magiserate میں ہی ختم کر لیتا ہے۔ جب یہ خواندگی ختم ہو جاتی ہے، تو اُسے ایک سند مل جاتی ہے۔ جس کی مدد سے وہ مدرسے میں تعلیم نہیں دے سکتا، بلکہ اس کے ذریعے ایک مقابلے کے امتحان میں بیٹھ سکتا ہے، جس میں پاس ہونے کے بعد وہ تین سال کے لیے عارضی طور پر معلّم بن جاتا ہے۔ اس مدّت کے بعد اگر مدرسے کا انسپکٹر اس کے متعلق اچھی رائے دے، تو وہ معلّمی کا حقدار تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن اس حالت میں بھی وہ نہ صرف انسپکٹر کی زیرنگرانی کام کرتا ہے، بلکہ ایک سپروائزر اس کی مدد کے لیے مقرر ہوتا ہے۔ اطالیہ میں معلّم کو کسی قسم کی علیحدہ فنّی تعلیم نہیں دی جاتی۔ جو کچھ وہ اپنے فن کے متعلق سیکھتا ہے، اپنی عارضی ملازمت کے دوران میں سیکھتا ہے۔

(۴) جمہوریہ اشتراکیہ روس:

۱۹۲۴ء سے معلمین کی تربیت کے لیے درسگاہیں (pedagogical teachnieums) قائم کی گئی ہیں، جن کی خواندگی کی مدت چار سال
کے دوران میں نظری اور عملی طور پر دستکاری کا تجربہ حاصل ک
میں علم معاشرت، نفسیات اور علم حیاتیات بہت اہم ہیں اور اس

ہوتا ہے کہ وہ اس کے بعد اپنی قوم کے لیے ایک رہنما کا کام دے سکے۔ اس سے عام طور پر یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ معلّم ایسی بلند عملی قابلیت کا مالک ہو کہ وہ اپنے علاقوں میں سائنس کی نئی نئی ایجادات کو کامیابی کے ساتھ رائج کرا سکے۔

ان درسگاہوں کی خواندگی دو دو سالوں کے دو حصّوں پر منقسم ہے۔ پہلے حصّے میں طالب علم ۱۵ اور ۱۷ برس کی عمر میں نو سالہ مدارس کی تعلیم مزید حاصل کرتا ہے جس میں اصول تعلیم کے مسائل کی ابتدا کی جاتی ہے اور دوسرا حصہ بالکل تعلیمی مسائل پر مشتمل ہوتا ہے۔ پچھلے دو سالوں میں علم معاشرت، طریقہ ہائے تعلیم اور عملی کام کی مشق کی جاتی ہے۔ عملی کام میں نواحات کی ضروریات کے مطابق ہر معلّم حصہ لیتا ہے۔ جرمنی کی طرح یہاں بھی معلّمی کی حیثیت دیگر صنعتوں کی طرح ہے۔

(۵) اضلاع متّحدہ امریکہ:

معلّمی کی سند حاصل کرنے کے لیے مختلف اضلاع نے کئی ایک مختلف طریقے اختیار کر رکھے ہیں۔ اس اختلاف کا ذکر اُوپر ہو چکا ہے۔ ایسی حالت میں ممکن نہیں کہ کوئی جامع بیان دیا جا سکے۔ معلّمی کی سند حاصل کرنے کے لیے نارمل اسکول اور کالج معلمین کے لیے قائم ہیں۔ ان میں داخل ہونے کے لیے عام طور پر چار سالہ ہائی اسکول کا سند یافتہ ہونا لازمی ہے، لیکن بعض طلبہ ہائی اسکول کی خواندگی ختم کرنے کے بعد کسی مدرسے میں عملی کام شروع کر دیتے ہیں، جس کی میعاد مقرر نہیں۔ اس عملی تعلیمی مشق کے بعد اُنھیں معلّمی کی سند مل جاتی ہے۔ مگر ایسے معلّمین کی تربیت یقیناً قابل ستائش یا تسلی بخش نہیں کہلا سکتی۔ ضلع کیلے فورنیا میں شاید دیگر سب اضلاع سے بہتر انتظام ہے۔ چار سالہ ہائی اسکول کی خواندگی کے بعد دو سال کے لیے کسی

نارمل اسکول میں تربیت لازمی قرار دی گئی ہے ۔

امریکہ میں پچھلی صدی کی پہلی تہائی سے نارمل اسکول قائم ہو گئے تھے، لیکن کافی عرصے تک یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ عام علمی اور فنّی مضامین سے کس کو زیادہ ترجیح دی جائے۔ لیکن چونکہ تھوڑی مدّت سے نارمل اسکول میں داخل ہونے والے طلبہ کا تعلیمی معیار ترقی کر چکا ہے، اس لیے اب ایک دوسرا سوال پیدا ہو گیا ہے، یعنی علمی مضامین جو نارمل اسکول میں پڑھائے جاتے ہیں، وہی مضمون طالب علم ہائی اسکول کی خواندگی کے دوران میں پڑھ چکے ہوتے ہیں۔ ان حالات میں اب کوشش کی جا رہی ہے کہ نارمل اسکول میں فنی مضامین پر زیادہ توجہ دی جائے۔ اصول تعلیم سے بھی طلبہ کو بخوبی واقف کیا جاتا ہے ۔

۱۹۳۰ء میں نارمل مدارس کی کل تعداد ۱۹۷ تھی اور کالجوں کی تعداد ۱۴۰ نارمل اسکول کی خواندگی دو سال یا دو سے کچھ زیادہ مدّت کی ہوتی ہے۔ جس کے بعد ڈپلوما مل جاتا ہے۔ اس کے برعکس کالج میں چار سال کی مسلسل خواندگی ہے جس کے بعد طالب علم کو ڈگری دی جاتی ہے ۔ دونوں اداروں میں داخلے کی شرط ہائی سکول کی چار سالہ خواندگی کی سند ہے جب سے داخل ہونے والے طلبہ کی تعداد بڑھ گئی ہے، مقابلے کا امتحان بھی شروع ہو گیا ہے ۔

امریکہ کے ان اداروں کا نصاب فرنگی ممالک کے ایسے اداروں سے قدرے مختلف ہے۔ یہاں کوشش کی جاتی ہے کہ تعلیم کے مختلف درجوں کے لیے علیحدہ علیحدہ خصوصی تربیت دی جائے ۔ مثلاً کنڈر گارٹن، ابتدائی، وسطانی، اعلیٰ اور دیہاتی مدارس وغیرہ کے لیے علیحدہ انتظام ہیں۔ اس وقت امریکہ میں اہم سوال یہ نہیں ہے کہ کس طرح مسلسل تعلیم اور فنّی تربیت کی مشترکہ خواندگی جاری رکھی جائے، بلکہ نصاب کے مختلف مضامین کو کس طرح

فنّی رنگ دیا جائے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ معلّم صرف انھیں مضامین کا مطالعہ کرے، جو اُس نے مدرسے میں ملازم ہونے کے بعد پڑھائے ہیں، بلکہ یہ ہے کہ معلّم خود خواہ اپنا مطالعہ کتنا ہی وسیع کیوں نہ کرے، وہ اس قابل ہو کہ اپنے اس حاصل کردہ علم کو متعلّمین کے فائدے کے لیے استعمال کرنے کے مختلف طریقے سمجھ سکے۔ یہی نقطۂ نگاہ جرمن "درسگاہ معلّمین" کا بھی ہے، جس کا اُوپر ذکر ہو چکا ہے۔ وہاں معلّم کی تربیت ایک فنّی چیز ہے، جو ایک طرف تو یونیورسٹی کی خصوصی تعلیم اور تحقیق اور دوسری طرف اعلیٰ صنعتی اداروں کے وسعتِ کمال سے متمیز ہے۔ فرنگی ممالک کی طرح ان اداروں میں بھی علمی اور فنّی دونوں قسم کے مضمون نصاب میں شامل ہیں، لیکن علمی مضامین کا انتخاب کچھ حد تک اس درجے پر منحصر ہے، جہاں معلّم کو تعلیم دینا ہے۔ معلّمین مدرسہ کے تعلیمی طریقے کا مطالعہ اور تعلیمی مشق کا انتظام یا تو ملحقہ مدارس میں ہوتا ہے یا کسی مقامی مدرسے میں لیکن طلبہ کی کثرت کے باعث سب کے لیے تعلیمی مشق کا تسلّی بخش انتظام نہیں ہو سکتا۔ اس لیے معلّمین کو کچھ عرصے کے لیے کسی نگران کے ماتحت کام کرنا ہوتا ہے، لیکن یہ شرط بعض فرنگی ممالک کی طرح ہر ایک کے لیے لازمی نہیں۔

(۶) انگلستان:

یہاں معلّمین کی تربیت کا انتظام کسی ٹریننگ کالج یا یونیورسٹی کے شعبۂ خصوصی میں ہوتا ہے۔

ٹریننگ کالج، ایسے اداروں کا قیام یونیورسٹی یا کسی مقامی تعلیمی انجمن (مذہبی یا غیر مذہبی) کے سپرد ہے۔ ۱۹۲۹ء سے ملک میں بارہ جغرافیائی علاقے قائم کیے گئے ہیں، جن میں سے ہر ایک یونیورسٹی کے ساتھ ملحق ہے۔ ہر علاقے کو تعلیمی بورڈ کی طرف سے نصاب کے

تعین اور امتحان لینے کی اجازت ہے۔

ان اداروں میں ہر وہ طالب علم داخل ہو سکتا ہے، جو ۱۸ برس کی عمر کا ہو۔ اچھی صحت رکھتا ہو اور پہلا درسی امتحان پاس کر چکا ہو۔ نصاب میں علمی اور فنی مضامین شامل ہیں اور عملی تعلیم کا عمدہ انتظام ہے۔ اس وقت علمی مضامین کی موجودگی نے ایک اہم سوال پیدا کر دیا ہے۔ ایسے مضامین اس زمانے کی یادگار رہیں، جبکہ ان درسگاہوں میں طلبہ کو فنی تربیت کے علاوہ عام تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ یہی مسئلہ امریکہ میں بھی موجود تھا اور اس کا حل بھی اسی طرح ہونا چاہیے لیکن ان درسگاہوں کے ساتھ عملی مشق کے لیے کوئی مدرسہ نہیں۔ اس لیے کسی مقامی مدرسے میں یہ کام سرانجام ہوتا ہے۔

جامعات کا شعبہ تربیت معلمین: یہاں کی مدت خواندگی چار سال ہے جن میں تین سال ڈگری کا کورس ہے اور چوتھا سال صرف اصول تعلیمات کے مطالعہ کے لیے وقف ہے۔ اس آخری سال میں طلبہ مسئلۂ تعلیم اور طریقۂ تعلیم کا خصوصی طور پر مطالعہ کرتے ہیں اور نواحات کے مدارس میں، جو اس مقصد کے لیے قائم کیے گئے، معلمین کے طریقۂ تعلیم کا مطالعہ اور تعلیمی مشق کی جاتی ہے۔ کسی ایک مدرسے میں جو جامعہ کے شعبۂ تعلیمات سے ملحق ہوتا ہے، ہیڈ ماسٹر اور نگران کے ماتحت ہر ایک طالب علم متواتر کئی ہفتے تک تعلیم دیتا ہے۔ چار سال کی خواندگی کے بعد اگر طلبہ ڈگری کے امتحان میں کامیاب ہو جائیں، تو انھیں یونیورسٹی کی طرف سے تعلیم کا ڈپلوما مل جاتا ہے۔ اگر وہ ڈگری لینے میں کامیاب نہ ہو سکیں، مگر آخری سال کے امتحان میں پاس ہوں، تو سفارش کی جاتی ہے کہ تعلیمی بورڈ انھیں معلمی کی سند دیدے۔

۱۹۲۸ء سے تعلیمی بورڈ نے اپنی سند کے لیے امتحان لینے بند کر دیے ہیں خواندگی

کے اختتام پر یا تو جامعات خود امتحان لیتے ہیں یا جامعہ اور درسگاہ معلمین دونوں کے نمایندے مشترکہ طور پر امتحان کا انتظام کرتے ہیں۔ ان اداروں کی رپورٹ پر جس میں امتحان کے نتائج کے علاوہ طلبہ کی علمی اور فنّی قابلیت کا جائزہ بھی شامل ہوتا ہے، تعلیمی بورڈ طلبہ کو سند دیتا ہے جس کی بنا پر وہ اپنی تعلیمی قابلیت کے مطابق کسی منظور شدہ مدرسے میں معلّمی کے قابل تصوّر کیے جاتے ہیں۔ پہلا سال عارضی شمار کیا جاتا ہے، جس کے خاتمے پر وُہ پکّی سند کا حقدار ہو جاتا ہے، بشرطیکہ انسپکٹر کی رائے اس کے متعلق تسلی بخش ہو۔

مقامی تعلیمی انجمنوں کو تعلیمی بورڈ کی طرف سے صوبائی درسگاہ معلّمین کے واسطے باقاعدہ گرانٹ ملتی ہے۔ جس کی مقدار ان درسگاہوں کے کل اخراجات کا تقریباً نصف ہوتی ہے اور ان میں وہ وظائف بھی شمار ہوتے ہیں، جو وہ درسگاہیں طلبہ کو دیتی ہیں۔ رہائش کے لیے (جو طالب علم کے لیے لازمی ہے) فیس لی جاتی ہے۔ ایسی درسگاہوں کو جو کسی مذہبی یا ایسی ہی فرقہ وارانہ انجمن کے ماتحت ہوں، تعلیمی بورڈ کی طرف سے فی طالب علم کے حساب سے گرانٹ ملتی ہے اور اگر مدرسہ طلبہ کی رہائش کا بھی انتظام کرے، تو یہ مقدار بڑھا دی جاتی ہے۔ باقی اخراجات درسگاہ کے ذمّے ہوتے ہیں، جو وُہ چندوں وغیرہ کے ذریعے جمع کرتی ہے۔ اسی طرح تعلیمی بورڈ کی طرف سے جامعات یا یونیورسٹی کالجوں کو ان کے شعبۂ معلّمی کے اخراجات کے لیے سالانہ رقم ملتی ہے اور تین سال کی خواندگی کے عرصے میں فی طالب علم ۵ پونڈ سالانہ اس کے علاوہ ہوتا ہے۔ چوتھے سال جب طلبہ مدرسوں میں تعلیم دیتے ہیں، بورڈ کی طرف سے درسگاہوں کو فی طالب علم ۳۵ پونڈ سالانہ کی گرانٹ اور اس کے علاوہ رہائش کے اخراجات کے لیے علیحدہ رقم بھی ملتی ہے۔ طلبہ جو ان درسگاہوں میں داخل ہوتے ہیں، ان کے لیے معلّمی کی جگہ تلاش کرنا حکومت کا فرض ہے۔

پنجاب کے اسکولوں میں تدریسِ جغرافیہ

از

بشنداس ایم اے، بی ٹی

جغرافیے کی تعلیم کے سلسلے میں سب سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جغرافیے کی تعلیم کی ضرورت کو محسوس کیا جائے اور بتایا جائے کہ جغرافیہ کیا چیز ہے۔ آج سے بیس برس پہلے جو جغرافیہ پڑھایا جاتا تھا، اس کا فائدہ شاید صرف یہ تھا کہ طلبہ کو چند ملکوں اور جزیروں کا علم ہو جاتا تھا۔ آج ہم ان ناموں کو جغرافیہ نہیں سمجھتے۔ اب تو جغرافیہ ایک سائینٹفک مضمون ہو گیا ہے، جو ہمیں انسان بناتا ہے اور ہمیں اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر رہنا سکھاتا ہے۔ جغرافیے کے طالب علم کے لیے اب یہ جاننا ضروری ہے کہ کسی ملک کے جغرافیائی حالات وہاں کے لوگوں کی زندگی اور طرزِ بود و باش پر کیا اثر ڈالتے ہیں۔ ہمارے رسم و رواج میں بہت کچھ اختلاف اپنے اپنے علاقے کے جغرافیے کی وجہ سے ہی ہے۔ اس لیے ان تفرقات کی بنا پر آپس میں رنجش پیدا کر لینا نادانی ہے۔ میرا خیال ہے کہ جغرافیائی حالات ہی نے ہندوستانیوں کو مذہبی رنگ میں رنگے رکھا۔ یہاں پیداوار کی بہتات ہے۔ لوگ گوشت خوری کے بغیر گزارہ کر سکتے ہیں، لیکن ٹنڈرا کے لوگ ہندوؤں یا بدھوں کے اہنسا کے اصول کو ضرور لغو خیال کریں گے۔ یہ ایک بہت موٹی سی بات ہے اور اس احوال کو سمجھ لینے والا ہندوستانی وِشنو کسی گوشت خور سے نفرت نہیں کر سکتا۔ عرب، ایران، افغانستان وغیرہ میں پیداوار کم تھی۔ اب اگر ہمارے

ہندو بھائی یا بدھ یا چینی مسلمانوں سے اس بنا پر نفرت کریں کہ وہ روزانہ گوشت کھاتے ہیں، تو وہ سراسر غلطی پر ہیں۔ مسلمانوں اور عیسائیوں میں مُردوں کے دفن کرنے کے رواج کا ممکن ہے ایک سبب یہ بھی ہو کہ ان ممالک میں بنجر زمین کافی تھی اور ایندھن کی کمی۔ اس کے برعکس ہندوستان میں ایندھن کی بہتات تھی اور خالی جگہ کاشت کے واسطے رکھنی لازمی تھی، اس لیے مردوں کو جلا دینا ہی کافی سمجھا گیا۔ مردہ کے لیے جلایا جانا یا دفنایا جانا مساوی ہیں۔ اس بات کے کہنے سے میرا مدعا کسی خاص مذہب پر نکتہ چینی کرنا نہیں، بلکہ یہ ظاہر کرنا ہے کہ جو شخص علم جغرافیہ کے اس اصول کو سمجھتا ہے، وہ ان تفرقات کی وجہ سے کسی سے الجھ نہیں پڑتا۔ وہ زیادہ فراخدل ہو جاتا ہے اور احوالِ جغرافیہ سے بے بہرہ انسان تنگ دل، متعصب اور غیر ہمدرد ہوتا ہے اور خواہ مخواہ لوگوں پر نکتہ چینی کرتا رہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جغرافیے کی تعلیم سوسائٹی میں امن رکھنے میں مدد ہوتی ہے اور اس سے انسان مہذّب اور شائستہ بنتا ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ انسان جغرافیائی حالات کا غلام ہے، لیکن جغرافیہ انسان کی ترقی وغیرہ پر اثر ضرور ڈالتا ہے اور ان اثرات کو سمجھنا جغرافیے کے طالب علم کے لیے نہایت ضروری ہے۔

اس کے بعد ہمیں موجودہ زمانے میں ذرائع آمد و رفت کی ترقی پر ایک نظر ڈالنا ہے۔ ریلوں، جہازوں، ہوائی جہازوں، ڈاک خانہ، تار، ٹیلیفون وغیرہ کی وساطت سے تجارتی یا اقتصادی لحاظ سے ساری دنیا ایک ہو گئی ہے۔ دنیا کا ایک دور افتادہ گوشہ بھی نہیں اپنا ہمسایہ علاقہ معلوم دیتا ہے۔ آج سے ایک صدی پہلے تاجر لوگ بہت دُور سے سامان نہیں منگواتے تھے اور نہ ملکی صنعتوں کی اشیا دور کہیں بھیج سکتے تھے، لیکن اب تاجروں اور کارخانے داروں کی مُلک کیا دنیا کے کونے کونے پر نظر ہے، تاکہ اپنی ضروریات

اور خام اشیا کے حاصل کرنے اور اپنی دستکاریوں یا صنعتوں کی کھپت کی جگہوں کا حال معلوم ہوتا ہے ۔ یہ سب کچھ جغرافیے کے علم ہی سے ہوسکتا ہے ۔ جب تک جغرافیے کا صحیح مطالعہ نہ کیا جائے، کوئی تاجر یا کارخانے دار کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اب وُہ دن گئے، جب بڑے بڑے تاجر اس بات کو نظرانداز کرسکتے تھے کہ دنیا میں اور کیا کچھ ہو رہا ہے ۔

جغرافیے کا علم ہمارے استعجاب کو بھی دور کرسکتا ہے ۔ فطری طور پر ہم قدرت کے عجائبات کا علم حاصل کرنا چاہتے ہیں ۔ خواہ ان کا علم ہمارے لیے مفید ہو یا نہ ۔ وُہ لوگ جنھیں کسی علاقے کا انتظام سونپا جاتا ہے ۔ وُہ اپنے فرض کی ادائیگی میں اس علاقے کے جغرافیائی حالات جانے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتے ۔ اغلباً اسی وجہ سے ہندوستان میں اعلیٰ ملازمتوں کے مقابلے کے بعض امتحانات میں جغرافیہ ایک لازمی مضمون قرار دیا گیا ہے اور ضلع میں حاکم مقرر ہونے پر ہر افسر کو اس ضلعے کا مکمل جغرافیہ غور سے دیکھنا پڑتا ہے ۔ اس جغرافیے کو انگریزی میں Gazetteer کہتے ہیں اور یہ بیس پچیس یا تیس سال کے بعد ہر ضلع میں شائع ہوتا رہتا ہے ۔ اس کے بغیر کوئی حاکم وہاں کے لوگوں کے عادات و ضروریات کو نہیں سمجھ سکتا اور کامیاب نہیں ہوسکتا ۔

بالکل ان پڑھ آدمی کے لیے بھی جغرافیے کا تھوڑا بہت علم ضروری ہے ۔ اُسے ہر وقت اپنے گاؤں، تحصیل و ضلع کے حالات سے سابقہ پڑتا ہے ۔ قریب کی ندیوں، پہاڑوں، نہروں، چراگاہوں اور وہاں کی اشیائے خوردنی کا حال جانے بغیر کوئی آدمی نہیں رہ سکتا اور پھر آخر ان پڑھ آدمیوں کو بھی تعلیم یافتہ آدمیوں سے ملنا پڑتا ہے ۔ انھیں ایک دوسرے سے زندگی کے روز مرہ میں کام پڑتے ہیں، تو وہ گویا اپنے آپ کو الگ تھلگ

نہیں رکھ سکتا ہے۔ ان حالات کے پیشِ نظر جغرافیے کی تعلیم انسان کے لیے بے حد ضروری ہو گئی ہے۔

اب ہم نے یہ دیکھ لیا کہ اس مضمون کے بغیر ہمارا گزارہ نہیں۔ اس لیے ہمیں دیکھنا ہے کہ یہ تعلیم کب دینی چاہیے۔ اور کیسے۔ اس بات پر بحث کرنے کے لیے میں پہلے سلیبس کو ہی لیتا ہوں۔

سلیبس | منزلِ مقصود کا جاننا ہر شخص کے لیے لازمی ہے۔ اس لیے ہم نے یہی فیصلہ کرنا ہے کہ ہمیں طلبہ کو کیا کچھ سکھانا ہے۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ ہر طرح کی تعلیم کی بنیاد بچے کے فطری جذبات instinct اور ابتدائی تجربات پر رکھنی چاہیے۔ جغرافیے کی حالت میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ بچے کو سب سے پہلے گھر کے حالات بتلانے جائیں۔ مثلاً گھر میں چیزیں کس طرح اور کس کس طرف کو رکھی ہوئی ہیں۔ اسکول سے گھر جانے کے کون کون سے راستے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ اگرچہ بعض لوگ ان معمولی سی باتوں کو جغرافیہ نہیں کہیں گے۔ لیکن جغرافیے کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ اس منزل میں بچے کے والدین اُستاد کے معاون کے طور پر کام کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد بچہ گاؤں یا شہر یا اس سے بھی پرے جاتا ہے۔ اس طرح جوں جوں وہ بڑا ہوتا جائے اس کی واقفیت کا دائرہ بھی وسیع ہونا چاہیے۔ تو یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وُہ ان سب چیزوں کا صحیح تصوّر پہلے ہی سے قائم کرے۔ چونکہ دیہات کے بیشتر طلبہ پرائمری کے بعد اپنی تعلیم ختم کر دیتے ہیں۔ اس لیے بچے کو زیادہ سے زیادہ واقفیت اسی درجے میں بہم پہنچانی چاہیے۔ ہماری ابتدا اسکول کے نقشے یا گاؤں یا قصبے کے نقشے سے ہو سکتی ہے۔ جس میں گلیاں، کوچے، باغ، کوئیں وغیرہ دکھائے گئے ہوں۔ کبھی کبھی بچوں کو باہر کی سیر کرا کر ان کے تجربات کو وسیع کرنا چاہیے۔ گاؤں کے

نقشے میں بچہ اسکول کے باغ یا گھر کا راستہ خود دکھا سکتا ہے۔ اس کے بعد ضلعے کو لیا جا سکتا ہے۔ یہاں مدرس کو بہت سی باتیں بتانی پڑینگی۔ تھوڑا بہت حال گردو پیش کے ضلعوں کا بھی فائدے سے خالی نہ ہوگا۔ اس درجے میں اگر صوبے کا تصوّر بھی دیا جائے، تو کوئی ہرج نہیں۔ اس سے اگلی جماعت میں اپنے صوبے کا حال بتانا ضروری ہے۔ اس سال میں ہی ہندوستان کا مختصر سا حال اور دنیا کے مشہور ممالک اور ان کے دارالخلافوں کا ذکر بھی کر دینا چاہیے۔ گلوب کی مدد سے ہندوستان اور پنجاب کا محل وقوع بھی طلبہ کے ذہن نشین کرانا چاہیے۔ اس کے بعد مڈل کی جماعت میں ہندوستان کا مفصل حال۔ پھر ایشیا کا، پھر یورپ اور افریقہ کا مفصّل حال پڑھانا چاہیے۔ عام طور پر اسکولوں میں ساتویں جماعت میں جنوبی امریکہ، افریقہ اور آسٹریلیا کا جغرافیہ پڑھایا جاتا ہے اور آٹھویں جماعت میں یورپ اور شمالی امریکہ کا۔ مجھے اس سے اختلاف ہے۔ میرے خیال میں ساتویں جماعت میں یورپ اور افریقہ کا حال پڑھایا جائے اور آٹھویں جماعت میں امریکہ اور آسٹریلیا کا۔ ایک تو یورپ اور افریقہ ہمارے نزدیک واقع ہیں۔ دوسرے ان برّاعظموں سے ہمیں بہت قریب کا تعلق ہے۔ انگلستان جو ہمارے فرمانرواؤں کا ملک ہے، یورپ ہی میں تو ہے اور پھر دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں بھی یورپ میں ہیں۔ تعلیمی اور صنعتی لحاظ سے بھی یہ برّاعظم سب سے بڑھ کر ہے۔ اس لیے اس برّاعظم کا حال جس قدر جلد ہو سکے پڑھانا چاہیے۔ اس کے بعد افریقہ۔ افریقہ میں بہت سے ہندوستانی جا کر بس گئے ہیں۔ اس لیے اس برّاعظم کا حال بھی دور کے برّاعظموں سے پہلے ہی ہم کو معلوم ہونا چاہیے۔ ہر سال گزشتہ سالوں کی تعلیم کا اعادہ بھی کرانا چاہیے۔

ہر درجے میں تدریس کا معیار مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً جماعت چہارم میں ہندوستان

کا جغرافیہ پڑھاتے وقت حدود اربعہ میں یہ بتا دینا ہی کافی ہے کہ اس کے شمال میں کوہ ہمالیہ ہے اور جنوب میں بحر ہند۔ لیکن اگلی جماعت میں طالب علم کو اس امر کا علم ہونا چاہیے کہ شمال میں کون کون سے ممالک ہیں اور ان کا ہمارے ساتھ کیا تعلق ہے۔ مشرق میں برما، سیام، جاوا وغیرہ، سب کے نام بتانا چاہییں۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔ آٹھویں جماعت میں اس کا صحیح محل وقوع بلحاظ خطوط طول بلد و عرض بلد بتانا چاہیے۔ ہائی کلاسوں میں دنیا کی بڑی بڑی بندرگاہوں سے ہندوستان کی بندرگاہوں کا فاصلہ بتایا جائے۔ تاکہ طالب علم کو اپنے ملک کے محل وقوع کا بالکل صحیح علم ہو جائے۔

اس کے بعد سطح، دریا، آب و ہوا اور پیداوار لی جاتی ہے اور طالب علم کی عمر یا جماعت کے متعلق کم و بیش حالات بتائے جاتے ہیں۔ یہ امر یاد رہے کہ تاریخ کی طرح یہاں بھی ہر بات کا سبب پہلے بتانا ہوتا ہے اور معلوم سے نامعلوم کی طرف چلنا ہوتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ بعض پبلشرز اپنی کتاب کو بہترین بنانے کے جنون میں غیر ضروری طور پر طول دے دیتے ہیں۔ مڈل یا ہائی کلاسوں میں جہاں صرف دو پیریڈ فی ہفتہ اس مضمون کو نصیب ہوتے ہیں، اڑھائی سو صفحے کی یا اس سے بھی ضخیم کتاب ختم کرانا اُستاد کے لیے بہت مشکل ہے اور طلبہ کے لیے اس ساری کتاب کو پڑھ کر یاد کرنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ جو کتاب پانچویں جماعت کے لیے کافی سمجھ لی جاتی ہے، وہی دسویں جماعت کے لیے ٹھیک خیال کی جاتی ہے۔ میرے خیال میں اُستاد صاحبان کو چاہیے کہ وہ تھوڑا پڑھائیں، لیکن جو پڑھائیں، اُسے اچھی طرح سے ذہن نشین کرا دیں۔ تیسری جماعت تک عام طور پر انسپکٹر صاحبان طلبہ کے ہاتھ میں کسی کتاب کے دیے جانے کی اجازت نہیں دیتے۔ اگر یہی رکاوٹ چوتھی اور پانچویں جماعت میں بھی ہو، تو بالکل بجا ہوگا۔ مدرس

خود اس بات کا اندازہ لگائے کہ اس کے طلبہ کو کس کس بات کے جاننے کی ضرورت ہے اور وہ ان باتوں کو مؤثر طریقے سے طلبہ کو سمجھائے۔ جغرافیہ میں رٹ لینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس میں سمجھ درکار ہے اور طلبہ اسی حالت میں اچھی طرح سے سمجھ سکتے ہیں کہ اُستاد ان سب باتوں کو خود اچھی طرح آسان عبارت میں سمجھائے۔ طلبہ کا اس وجہ میں کتاب پڑھنا اتنا مفید نہیں اور پھر اس وقت کوئی کتاب بھی تو ایسی نہیں، جو کم عمر کے بچوں کو پڑھنے کے لیے ہم دے سکیں۔

پہلے سال کا کام | ذیل میں ایک اسکیم پیش کی جاتی ہے، جو میرے خیال میں پنجاب کے اسکولوں کی دوسری، تیسری جماعت میں جاری کی جاسکتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر مدرسین خود اس میں دلچسپی لیں، تو وہ جغرافیے کے لیے بچّوں کے دل میں ایسا شوق پیدا کرسکتے ہیں، جو کبھی نہ مٹے۔ اصل میں جغرافیے کی ابتدا طالب علم کے گھر سے ہی ہونی چاہیے لیکن ایسا کرنا کچھ مشکل ہے۔ اُستاد طلبہ کے گھروں سے واقفیت پیدا نہیں کرسکتا، اس لیے ہم جماعت کے کمرے سے ہی شروع کرسکتے ہیں۔ سب سے پہلے جماعت کے کمرے کے نقشے کو لیا جائے۔ سب لڑکے کسی خاص بات کو مدِ نظر رکھ کر کمرے کا نقشہ تیار کریں اور اس پر لکھ کر ظاہر کریں کہ یہ نقشہ کس بات کو ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً "کمرے میں میری جگہ کا نقشہ" اس میں طالب علم اپنے بیٹھنے کی جگہ ظاہر کرے۔ اس کے بعد لڑکے ایک دوسرے کے نقشے کو دیکھ کر اپنے دوستوں کی جگہوں کو جاننے کی کوشش کریں۔ اگر وہ ایسا کرلیں، تو سمجھیں کہ نقشہ اچھا ہے، ورنہ نہیں۔ اس کی خوبصورتی کی چنداں ضرورت نہیں۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ وہ استعمال کیا جاسکتا ہے، یا نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ وہ گندے یا بدصورت ہوں۔ لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ

ناصاف نقشہ جس سے ہم کوئی خاص جگہ معلوم کر سکیں۔ اس صاف اور خوبصورت نقشے سے اچھا ہے جس سے ٹھیک ٹھیک حال معلوم نہ کیا جا سکے۔ نہایت ہی صفائی کے ساتھ اور بڑی محنت سے بنایا ہوا نقشہ اگر ہمارا مطلب حل نہیں کرتا، تو وہ دراصل نہایت ہی گندہ ہے اور اس پر جو محنت ہوئی ہے، وہ ضائع ہوئی ہے۔ نقشے کی درستی سب سے لازمی چیز ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ طالب علم کمرے کے سب ٹاٹ، بینچ، کرسیاں، الماریاں وغیرہ دکھائے۔ سوال صرف یہ ہے کہ جس چیز کے لیے وہ نقشہ بنایا گیا ہے، کوئی دوسرا اسے دیکھے اور بغیر کسی دقت کے صحیح صحیح حال معلوم کرے۔ اگر ایسا نہیں تو کسی اور طریقے سے نقشہ بنوایا جائے۔ زیادہ غلطیاں نہ نکالی جائیں۔ صحیح مقامات دکھائے جائیں، غلطیاں خود بخود دور ہو جائیں گی۔ دوسرے طریقے میں اس نقشے کا نام بھی تبدیل کر دیا جائے۔ مثلاً میری جگہ کے بجائے "میں اپنی جگہ پر کس طرح جاتا ہوں" کا نقشہ بنایا جائے۔ دراصل یہ وہی نقشہ ہوگا، لیکن طالب علم کے لیے نیا ہوگا اور دلچسپ بھی۔ اب وہ سفر کا حال بیان کریگا، جو شاید اس کے لیے زیادہ پُرلطف ہوگا۔ دوسرے نقشہ سے یہ بھی ظاہر ہو جائیگا کہ کسی جگہ کو جانے کا قدرتی راستہ لازمی طور پر وہی نہیں جو سب سے نزدیک ہو۔ ممکن ہے، بعض بچے اپنے دوستوں کے اُوپر سے یا بنچوں کے اُوپر سے پھاندتے ہوئے جائیں، لیکن یہ درست نہیں۔ سیدھے راستے جو بنائے جائیں، نقطوں سے دکھائے جا سکتے ہیں۔ درجے میں سکیل کے مطابق نقشے بنانے کی ضرورت نہیں۔ سات آٹھ سال کے بچے کے لیے ایسا کرنا دشوار ہے۔ اس سے ہمارا سبق بھی خشک اور غیر دلچسپ ہو جائیگا۔ البتہ بچے کو اس امر کا احساس ہو جانا چاہیے کہ لمبی دیوار کون سی ہے اور عرض والی دیوار کون سی۔ اس کے بعد جب سکیل کے تصوّر دینے کا وقت آ بھی جائے۔ اس حالت میں بھی

لفظ سکیل کی تعریف بتانا ضروری نہیں۔ آہستہ آہستہ اسی کاغذ پر کسی بڑی جگہ کا نقشہ بنایا جائے۔ طالب علم کمرے کے اندر بیٹھ کر باہر کی جگھوں کا تصور اپنے دل میں باندھے جغرافیے میں یہ بات بہت ضروری ہے اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ طالب علم بڑا ہو کر دنیا کے مختلف نظاروں کو اپنے دماغ میں محفوظ کر لیگا۔ پہلے اس چیز کا نقش دل میں کھینچا جائے جس کی پڑتال بھی ہو سکے۔ کسی مقام کا دل میں نقشہ کھینچنا یا تصوّر میں کسی چیز کو دیکھ لینا ہی جغرافیے کی جان ہے۔ طلبہ کو جغرافیے میں دماغی تصاویر بنانی پڑتی ہیں۔ "نزدیک سے دور کی طرف چلو" جغرافیے کا سنہرا اصول ہے۔ پہلے اسکول کے چند کمروں کا نقشہ اور اس میں اپنے کمرے کا نشان دکھاؤ۔ پھر اپنے اسکول کا نقشہ، اسکول اور گراؤنڈ کا، بازار کا، اسکول سے گھر جانے کا راستہ، گھر سے مندر یا مسجد جانے کا راستہ، نقشہ بنا کر دکھایا جائے۔ اس کے بعد نقشے کی مدد سے طالب علم دکھائیں کہ ہماری خوراک ہم تک کس طرح پہنچتی ہے۔ نزدیک کے گاؤں یا قصبے تک ہم کس طرح جاتے ہیں۔ نقشے میں جو جگہ دکھائی جائیگی، رفتہ رفتہ اس کا رقبہ بڑا ہوتا جائیگا اور اس طرح خود بخود طالب علم کو سکیل کا تصور ہوتا جائیگا۔

اس مشق کا ایک اور فائدہ ہوگا۔ طالب علم نقشہ بینی میں بھی مشق کرتا جائیگا۔ اس کو اس امر کا احساس ہوتا جائیگا کہ نقشے میں جو باتیں درج ہوتی ہیں، ان کی اصلیت بھی ہوتی ہے مختلف امور کے ظاہر کرنے کے لیے ان کو مختلف نشانوں کے استعمال کا خیال بھی ہوتا جائیگا۔

پانچ سات ہفتے کی مشق کے بعد اگر طلبہ سے کہا جائے کہ وہ جماعت کے کمرے کا نقشہ بنائیں، تو وہ پہلے سے بہت زیادہ اچھا نقشہ بنائیں گے۔ حالانکہ اس کے متعلق اُنھوں نے کوئی مزید مشق نہیں کی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بچے نے اپنی تعلیم میں خود بھی کافی حصّہ لیا ہے۔ اب اپنے گاؤں یا اسکول سے اونچی یا نیچی جگہ کا نقشہ کھنچوایا جائے۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں یا ٹیلے دکھائے

جائیں۔ ان پر کچھ درخت وغیرہ بھی دکھائے جا سکتے ہیں۔ بعد میں پہاڑوں کو کنکھجورے کی سی شکل یا موٹی لکیروں سے بھی ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ پہاڑ کی کوئی لائن نہیں ہوتی اور ان کو لائنوں کی شکل میں دکھانا مناسب نہیں، لیکن چونکہ اس درجے پر بچے کو رقبے کا تصوّر نہیں ہوتا اس لیے پہاڑوں کو رقبے کی شکل میں نہیں سمجھایا جا سکتا۔ البتہ کچھ عرصے کے بعد بچہ اونچان یا نچان کو رنگوں سے ظاہر کر سکتا ہے۔ بعض بچے نقطوں سے بھی سطح دکھانا پسند کرتے ہیں کیونکہ ان سے ٹک ٹک کی آواز پیدا ہوتی ہے جس سے بچے خوشی محسوس کرتے ہیں لیکن اس سے دیر بہت لگتی ہے اور اس کے مقابلے پر لائنوں سے سطح دکھانا بہت مناسب ہے۔ یاد رہے کہ بے پروائی سے کوئی کام نہیں ہونا چاہیے۔ اس طرح کی لائنیں بجائے فائدے کے نقصان پہنچاتی ہیں اور مذاقِ سلیم کو خراب کرتی ہیں۔ یہ واقعات کو صحیح حالت میں پیش نہیں کرتیں۔ اس سے بہتر ہے کہ مساوی بلندی کی جگہوں کو کنٹور کی قسم کی لائنوں سے ظاہر کیا جائے۔ کنٹور کا نام اور تعریف بتانے کی ضرورت نہیں، لیکن اندازاً اس قسم کی لائنیں بڑی آسانی سے بنائی جا سکتی ہیں اور ٹھیک کام دے جاتی ہیں۔ یہ خطوط ہاتھ سے بہت جلد بنا دینے چاہییں اور صرف اسی طرح ہم ان کو ٹھیک طور پر بنا سکتے ہیں۔ اس سے طلبہ کو یہ پتہ لگ سکیگا کہ بعض جگہیں دوسری جگہوں سے اونچی سطح رکھتی ہیں۔

اب تک ہم نے صرف ان جگہوں کے خاکوں کا ذکر کیا ہے، جو طالب علم کی نظر سے گزر چکی ہیں۔ اب اضلاع، صوبجات یا ممالک کے نقشوں کے ضمن میں طلبہ کو اشارتاً بھی یہ نہ کہنا چاہیے کہ یہ کام پہلے سے کچھ مشکل ہے، بلکہ یہ کہ اب ہمارا کام پہلے سے مختلف ہوگا، پہلے کام کے ساتھ کوئی نہ کوئی تعلق ظاہر کرکے نیا کام شروع کیا جائے۔ معلوم سے نامعلوم کی طرف یکدم جانا غلطی ہے۔ لڑکوں کو ایک دوسرے کی مدد سے کئی باتیں معلوم کرنے کا حوصلہ دلانا چاہیے۔

بعض لڑکوں نے بہت سی جگہیں دیکھی ہیں۔ وہ اپنے معلومات سے ان دوستوں کو جنھوں نے کبھی اپنے گاؤں سے باہر قدم نہیں رکھا، بہت کچھ واقفیت بہم پہنچا سکتے ہیں۔ جوں جوں نقشے کا رقبہ زیادہ ہوتا جائے، ہم اپنے اسکول یا گاؤں کو نقطوں سے دکھانا شروع کر دیتے ہیں۔ اعادہ طالب علم کے دل میں تصور کو مستقل کرتا جائیگا۔ چھے سات ماہ میں پانچ دس میل کے رقبے کا نقشہ اور اس کا حال طالب علم کو ذہن نشین ہو جائیگا اور اس کو نقشے کی اصلیت اور ارد گرد کے علاقے کی صحیح حالت بھی معلوم ہو جائیگی۔ اب ہمیں طلبہ کو اپنے پڑوس کا حال بتانا ہے۔ اس لیے کبھی کبھی اور ملکوں کے لوگوں کے حال بھی بتائے جائیں، لیکن اس انتخاب میں اختصار سے کام لینا تفصیل سے کہیں بہتر ہے۔ بہت سے لوگوں کے حال سن کر بچے گھبرا جاتے ہیں۔ تھوڑی باتیں بچے کی دلچسپی کو قائم رکھتی ہیں۔ ایک ماہ میں ایک قوم کا حال بتانا ہی کافی ہے۔ اسکیمو، نیگرو، عرب، جاپانی، چینی وغیرہ بچوں اور لوگوں کا حال تصاویر کے ذریعے بتایا جائے۔ ان کے نقشے دکھانے کی ضرورت نہیں۔

اس کے بعد اپنے صوبے کے کسی طرف کے لوگوں کی زندگی کا حال بتایا جائے۔ مثلاً شہروں کے لڑکوں کو کسان کی زندگی کے حالات کم دلچسپ معلوم نہیں ہونگے فصل کی کٹائی یا کپاس چننے کے حالات بچے بڑے شوق سے سنیں گے۔ گاؤں کے بچے شہروں کے دکانداروں یا کارخانے کے مزدوروں کی زندگی کا حال بڑی دلچسپی سے سنیں گے۔ اس طرح بچوں کے دلوں میں اپنے دوسرے بھائیوں کے لیے محبت اور ہمدردی کا جذبہ بھی پیدا ہوگا۔ جغرافیے کی تعلیم اس جذبے کے پیدا کرنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اس کے ساتھ نقشہ کشی کے ساتھ بھی توجہ دی جائے۔

جرمنی کا نظامِ تعلیم

از

فیاضؔ احمد، ایم اے، بی ٹی

(گزشتہ سے پیوستہ)

جنگ کے بعد جرمنی میں قیصری سلطنت کا خاتمہ ہوا اور اُس کی جگہ جمہوری طرزِ حکومت نے لے لی۔ کچھ تو نئے نظامِ حکومت کی وجہ سے اور کچھ اقتصادی بدحالی کی وجہ سے تعلیم کے مختلف شعبوں میں کئی ایک قسم کی اصلاحات نافذ کی گئیں۔ اس مقالے کی آخری قسط میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ جرمنی تعلیمِ نسواں کے معاملے میں ایک قدامت پسند ملک تھا۔ مخلوط تعلیم تو کجا، اہلِ جرمن اپنی لڑکیوں کو تعلیمِ اعلیٰ بھی دینا پسند نہیں کرتے تھے۔ تعلیمِ نسواں کے متعلق اُن کا نظریہ یہ تھا کہ لڑکی فارغ التحصیل ہو کر ایک بہترین ماں، محبت اور خدمت کرنے والی بیوی اور اعلیٰ درجے کی نگرانِ خانہ بن سکے۔ لیکن جنگ کے بعد عورت کچھ تو اقتصادی اور کچھ سیاسی حالات کی وجہ سے بے حد آزاد ہو گئی۔ اس رَو کا اثر قدرتی طور پر جرمنی پر بھی پڑا۔ چنانچہ جرمن عورت نے بھی آزادی کی طرف سُرعت سے قدم بڑھانا شروع کیے اور ملک کی اقتصادی بدحالی نے اُس کی رفتار کو اور بھی زیادہ تیز کر دیا۔ اِس لیے عالمگیر حالات سے مجبور ہو کر جرمن ماہرینِ تعلیم نے وسیع پیمانے پر مخلوط تعلیم کو رواج دیا۔ اس لیے بھی کہ اس میں خرچ نسبتہً کم اُٹھتا تھا اور اب لڑکے اور لڑکیوں کو ایک ہی قسم کے مضامین پڑھائے جانے لگے۔ کیونکہ اب عورتوں کو بھی اپنے بھائیوں اور خاوندوں

کے دوش بدوش اپنی روزی کمانا تھی۔

مفید اصلاحات

درس و تدریس کے نئے نئے طریقے جاری کیے گئے۔ سبق کو طوطے کی طرح رٹنے کے فرسودہ طریق کو بند کر دیا گیا اور اُس کے بجائے بیسویں صدی کے نئے طریقے رائج کیے گئے اور یہ کوشش کی گئی کہ بچہ رٹنے کے بجائے اپنے دماغ اور اپنے فہم سے کام لے تاکہ سنِ شعور کو پہنچ کر وہ میلانِ طبع کے موافق کوئی مفید پیشہ اختیار کر سکے۔ بچّے کے فہم کو تیز کرنے کے لیے ابتدائی درجے میں ڈرائنگ، موسیقی اور صنعتی کاموں کو خاص اہمیت دی گئی اور اُن کے لیے سیر و تفریح کا بھی خاص انتظام کیا گیا۔ چنانچہ شہری بچّوں کو سیر و تفریح اور تجربے کی غرض سے دیہات میں پھراتے اور دیہاتی بچّوں کو مختلف شہروں کی سیر کراتے ہیں۔

اب تک جرمنی میں چونکہ شخصی حکومت تھی، اس لیے بچّوں کو تعلیم بھی ایک خاص نقطۂ نگاہ سے دی جاتی تھی۔ لیکن اب حکومتِ جمہوری قائم ہو چکی تھی، اس لیے حکومت کا مقصد یہ تھا کہ بچّوں کو آزادی اور حرّیت کا سبق دیا جائے۔ چنانچہ اسکولوں اور دیگر درسگاہوں میں کئی ایک شعبوں کا پورا انتظام کلّی طور پر بچّوں کے ہاتھ میں دے دیا گیا اور وہ اُس کے پوری طرح ذمّے دار بنا دیے گئے۔ مثلاً لائبریری، اسکول بنک اور دوپہر کے کھانے کا انتظام وغیرہم سب بچّوں کے سپرد کر دیا گیا اور اُنھیں اپنی رائے کی اہمیت کا احساس دلانے کی غرض سے اُن کو حقِ انتخاب بھی دے دیا گیا تاکہ وُہ اپنے افسر یا کارکن خود چُن سکیں۔ اس کے علاوہ طلبہ اور والدین کی کونسلیں بنائی گئیں، جن کو مدرسے کے انتظام میں کافی دخل ہوتا تھا۔ بعض مدرسوں کا انتظام تو کلّی طور پر طلبہ کے اپنے ہاتھوں میں ہوتا تھا اور

اُستاد کا حصّہ مدرسے کے نظم و نسق میں نسبتہً کم ہوتا تھا۔ اس طرح سے بچّوں کو جمہوری حکومت کے نظام کے متعلق شروع ہی سے تعلیم دی جاتی تھی۔ تعلیم نو کا یہ دور جرمنی میں بہت کامیاب رہا۔ بعض اوقات تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ طلبہ میں آزادی حد سے تجاوز کر گئی ہے۔ اس تعلیم جدید کا اثر بڑے بڑے شہروں تک ہی محدود نہ تھا، بلکہ چھوٹے چھوٹے قصبوں اور دیہات تک بھی پہنچ گیا۔

امتحان کا دیو

اس مقالے کے دوران میں ذکر آچکا ہے کہ جنگ سے پہلے جرمنی میں امتحانوں کو بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ ہر درجے میں اس قدر امتحانات ہوتے تھے کہ طالب علم خود بھی امتحان ہو کر رہ جاتا تھا۔ یہاں تک کہ بیشتر طلبہ کی شخصیت یکسر تباہ ہو جاتی تھی۔ جنگ کے بعد جب جرمنی کے نظامِ تعلیم میں بہت ہی اصلاحات نافذ کی گئیں، تو امتحان کو نسبتہً کم اہمیت دی جانے لگی۔ لیکن جیسا کہ آگے ذکر آئیگا۔ یہ اہمیت اب بھی بہت زیادہ تھی، ضرورت سے بہت زیادہ۔ ابتدائی درجے میں سب امتحانات منسوخ کر دیے گئے۔ یہاں تک کہ سالانہ امتحان بھی بند کر دیا گیا اور بچّوں کو ایک جماعت سے دوسری جماعت میں اُستاد کی سفارش پر ترقی دی جانے لگی۔ ابتدائی جماعتوں میں تحریری امتحانات تو سرے سے ہی اُڑا دیے گئے۔ ہاں بعض اوقات سال کے آخر میں بچّوں کا زبانی امتحان ہوتا تھا اور اُستاد بچّوں کے متعلق اپنی رائے اُن کے روزانہ کام سے قائم کرتا تھا۔ ثانوی مدرسوں میں بچّوں کا ایک مختصر اور معمولی سا امتحان ہوتا اور وُہ بھی صرف ضروری ضروری مضمونوں میں۔ لیکن بہت سے ثانوی مدرسوں میں بھی سوائے ایک کے اور کوئی امتحان نہ ہوتا تھا اور طلبہ کو ترقی اساتذہ کی کانفرنس کی سفارش پر دی جاتی تھی۔ ثانوی درجے میں آخری

امتحان تحریری بھی ہوتا اور زبانی بھی لیکن وہ امتحان قبل از جنگ کے امتحانات کی طرح سخت نہیں ہوتا تھا۔ اس امتحان کے پاس کرنے کے بعد طالب علم یونیورسٹی میں داخل ہو سکتا تھا۔ ان تمام امتحانوں کا مقصد محض یہ معلوم کرنا تھا کہ طالب علم کون کون سے مضامین جانتا ہے اور ان سے کس حد تک واقفیت رکھتا ہے۔ امتحان کا مقصد یہ نہیں ہوتا تھا کہ طلبہ کی عدم واقفیت معلوم کرے، بلکہ اُسے یہ اختیار ہوتا تھا کہ وہ مضمون کے کسی خاص موضوع پر تحقیق کرنے کے بعد ایک مقالہ لکھ دے اور اگر وہ معیار پر پورا اُترتا تو طالب علم کو پاس کر دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ زبانی امتحان کیلئے بھی طالب علم موضوع چُن لینے کا مجاز ہوتا تھا اور اس پر مستزاد یہ کہ طالب علم کا نو برس کا ریکارڈ بھی ممتحنوں کے سامنے ہوتا تھا، جو بہر حال اُسے پاس یا فیل کرنے کے لیے محض امتحان کی نسبت زیادہ بہتر معیار ہے۔

اس مفید اور بہتر طریقۂ امتحان کا اثر یہ ہُوا کہ ثانوی درجے اور یونیورسٹی میں طلبہ کی تعداد سرعت سے بڑھنے لگی۔ چنانچہ ڈاکٹر ہلکر نے (Dr. Hilker,) جو جرمنی کے مرکزی تعلیمی بورڈ سے وابستہ تھے، اس نئے طریقۂ امتحان کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا: "اب ابتدائی مدرسوں کے کامیاب طلبہ میں سے ۲۵ فیصدی کے قریب ثانوی درجے کے مدرسوں میں داخل ہوتے ہیں۔ جنگِ عظیم سے قبل ایسے طلبہ کی تعداد محض پانچ اور دس فی صدی کے درمیان ہوتی تھی اور اب ہماری یونیورسٹیوں میں طلبہ کی تعداد تین گنا زیادہ ہے۔"

مابعدِ جنگ طریقِ تعلیم کے نقائص

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ثانوی درجے کا نو سالہ کورس بہت طویل خیال کیا جاتا تھا اور کئی ایک ماہرینِ تعلیم کا یہ خیال تھا کہ طلبہ اور طالبات کو دس اور انیس سال

کی عمر کے درمیان ایک ہی درسگاہ میں رکھنا تعلیمی نقطۂ نگاہ سے اچھا نہیں اور پھر یہ سوال پیدا ہُوا کہ ایک اٹھارہ یا اُنیس سالہ نوجوان کو اسکول میں رکھنا کس حد تک درست ہے؟ اور آیا اس نوجوان کی ضروریات وہی ہیں، جو دس اور سترہ برس کے درمیان کے لڑکوں یا لڑکیوں کی ہُوا کرتی ہیں اور تیسرے یہ سوال درپیش تھا کہ آیا ان دو مختلف عمر کے لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے ایک ہی قسم کا ضبط مفید ہو گا یا نہیں؟ یہ تین نہایت ضروری سوال تھے، جو ایک عرصے تک جرمن ماہرینِ تعلیم کے پیشِ نظر رہے۔ اس کے علاوہ تجربہ بتاتا ہے کہ ثانوی مدرسوں کے اساتذہ کے لیے مختلف جماعتوں کو پڑھانا ذرا مشکل ہے، خصوصاً جبکہ ان جماعتوں کے کورسوں میں بھی بہت فرق ہو۔

جرمنی کے ثانوی مدرسوں کی سب سے بڑی جماعتوں میں وہی کورس پڑھایا جاتا تھا، جو دوسرے ملکوں کی یونیورسٹیوں کی ابتدائی جماعتوں میں پڑھایا جاتا تھا اور ثانوی مدرسوں کی سب سے چھوٹی جماعتوں میں تعلیم کا معیار ابتدائی اسکولوں کے معیار سے کچھ ہی بلند ہوتا تھا اور پھر مسئلہ یہ درپیش ہوا کہ وُہ نوجوان جو ثانوی مدرسوں سے فارغ التحصیل ہو کر اور اُن کے قید و بند سے آزاد ہو کر یونیورسٹیوں میں داخل ہوتے تھے، اپنے آپ کو مؤخر الذکر کی آزاد فضا کے مطابق ڈھال نہیں سکتے تھے اور عموماً اس نئی آزادی کا ناجائز اور غلط فائدہ اُٹھانے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ہمارے ملک میں بھی بہت سے طلبہ کو یونیورسٹی کی فضا راس نہیں آتی۔ خصوصاً ایسے طلبہ کو جو بیچارے چھوٹے چھوٹے شہروں سے میٹرک کا امتحان پاس کر کے لاہور اور کلکتے جیسے بڑے بڑے شہروں میں آ کر داخل ہوتے ہیں۔ اسکولوں میں آزادی نام کو نہیں ہوتی، بلکہ ضبط بہت شدید قسم کا ہوتا ہے اور اس کے

برعکس یونیورسٹیوں میں آزادی کچھ ضرورت سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسکول اور یونیورسٹی کے ضبط کا فرق کچھ اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ نوعمر اور ناتجربہ کار نوجوان پر اس کا اثر اچھا نہیں پڑتا۔ یونیورسٹی میں داخل ہونے کے بعد طالب علم کو کوئی بھی پوچھنے والا نہیں ہوتا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وُہ اس آزادی کو سما نہیں سکتا اور بہک جاتا ہے۔

چنانچہ اس نقص کو دور کرنے کے لیے کئی تجویزیں پیش کی گئیں، جن میں سے ایک کو بہت سے ماہرینِ تعلیم نے خاص طور پر پسند کیا اور وہ تجویز یہ تھی کہ ثانوی مدرسوں کے آخری دو سال اور یونیورسٹی کے پہلے سال کو علیحدہ کر کے ایک اور درجہ قائم کر دیا جائے۔ یہ سہ سالہ درجہ اس لیے تجویز کیا گیا تھا کہ وہ ثانوی درجے کے مدرسوں اور یونیورسٹی کے درمیان ایک قسم کا رابطہ قائم کر سکے جس میں تعلیم کا معیار نہ اتنا پست ہو کہ ثانوی مدرسوں کے برابر ہو جائے اور نہ ہی اتنا بلند کہ یونیورسٹی کے معیار کے ہم پلّہ ہو جائے۔

پنجاب یونیورسٹی انکوائری کمیٹی نے بھی اسی قسم کی ایک تجویز پیش کی تھی اور وُہ یہ تھی کہ میٹرک کے درجے میں یونیورسٹی کا امتحان بند کر دیا جائے اور اسکول کا کورس نویں جماعت تک ہی ختم کر دیا جائے اور اعلیٰ ثانوی تعلیم کے لیے ایک اور درجہ قائم کیا جائے، جو اسکول کے آخری سال یعنی دسویں جماعت اور ایف اے کی دو جماعتوں پر مشتمل ہو۔ گویا طلبہ یہ درجہ پاس کرنے کے بعد یونیورسٹی میں داخل ہو سکیں۔ اگرچہ پنجاب میں یہ نیا درجہ تجویز کرنے کی وجوہ مختلف تھیں اور ان میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یونیورسٹی کی تعلیم کا معیار اس قدر بلند ہوتا ہے کہ طلبہ کالجوں میں کچھ تو کم علمی کی وجہ سے اور کچھ انگریزی زبان اچھی طرح نہ جاننے کے باعث لکچروں کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ بہرکیف وجوہ چاہے کچھ ہی ہوں، ثانوی مدرسوں سے فارغ التحصیل ہو کر طلبہ کا ایک دم یونیورسٹی

میں داخل ہونا مفید نہ سمجھا گیا اور یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک نیا درجہ قائم کیا جائے، جو ثانوی مدرسوں اور یونیورسٹی کے درمیان ایک قسم کے زینے کا کام دے سکے۔

جے برنٹ (J. Burnet) ایک جرمن ماہرِ تعلیم نے کیا خوب کہا۔ "دراصل تعلیمِ اعلیٰ تین حصوں پر مشتمل ہے، دو پر نہیں اور اگر ہم اسے دو حصوں پر مشتمل سمجھیں، تو یہ ہماری بہت بڑی غلطی ہے۔ تعلیمِ اعلیٰ کا پہلا حصّہ سترہ برس کی عمر تک ہے اور اس عرصے میں طالب علم میں شعور پیدا ہوتا ہے۔ دوسرا حصّہ ۱۸ سے ۲۱ برس تک کا ہے اس عرصے میں طالب علم اپنے خیالات پختہ کرتا ہے اور تیسرا حصّہ ۲۱ برس کی عمر کے بعد کا ہے اور اس دوران میں وُہ اپنے لیے ایک خاص مضمون چُن لیتا ہے، جس کے متعلق وہ خاص تحقیق سے کام لیتا ہے تاکہ وُہ سماج کے سامنے کوئی نئی چیز پیش کر سکے اور اس طرح اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ سودمند ثابت کر سکے۔ ان میں سے وسطی حصّے کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور عموماً ماہرینِ تعلیم اسی حصّے کے متعلق غلطی کرتے ہیں یعنی وُہ نوجوانوں کو ۱۸ اور ۲۱ برس کی عمر کے درمیان کسی خاص مضمون کے متعلق تحقیق کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ تحقیق اس عمر میں اچھے نتائج پیدا نہیں کرتی۔

ہندوستان کی طرح جرمنی میں بھی اعلیٰ تعلیم کا نصاب بہت طویل ہے۔ نوجوان عموماً ۲۵ برس کی عمر میں یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں اور شاذ ہی تیس برس کی عمر سے پہلے روزی کمانا شروع کرتے ہیں۔ جرمن ماہرینِ تعلیم کا خیال ہے کہ وُہ اپنی عمروں کا بہترین حصّہ اور سب سے زیادہ سودمند حصّہ بالکل ضائع کر دیتے ہیں۔ اُن کا خیال یہ ہے کہ یونیورسٹی کی تعلیم کا عرصہ ضرورت سے زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ اُن کا یہ

خیال بھی ہے کہ اگرچہ جنگ کے بعد امتحانات آسان اور کم کر دیے گئے ہیں، لیکن پھر بھی ان کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ ڈپلوموں، سارٹیفکیٹوں اور ڈگریوں کی اب بھی کچھ بہت زیادہ قدر ہے۔ نئے طریقِ تعلیم، جمہوری طرزِ حکومت اور تحریکِ شباب کے باوجود جرمنی میں فرد اب بھی فرسودہ قیدو بند سے آزاد نہیں ہوا۔ ممکن ہے کہ اس صورتِ حال کا سبب کچھ تو مابعد جنگ کی اقتصادی بدحالی کی وجہ ہو اور کچھ اس وجہ سے کہ جنگ کے بعد جرمنی سے اس کی نوآبادیات چھین لی گئی تھیں لیکن اس میں شک نہیں کہ جب ایک شخص اپنے لیے کوئی سا پیشہ اختیار کرنا چاہتا ہے، تو اُسے اب بھی اتنے امتحان پاس کرنے پڑتے ہیں کہ اس کی روح بیزار ہو جاتی ہے۔ مقابلہ اتنی شدت کا ہے کہ ایک اوسط درجے کے انسان کے لیے معیار پر پورا اُترنا مشکل ہو جاتا ہے اور اس کے علاوہ بچے کو والدین اپنا پیشہ تجویز کرنے میں پورا اختیار اور آزادی نہیں دیتے، بلکہ اس معاملے میں وہ اپنی منشا سے کام لیتے ہیں۔ باوجود ان تمام باتوں کے اہلِ جرمن کو من حیث القوم اپنے نظامِ تعلیم سے بہت اُمیدیں وابستہ ہیں۔ اُن کا یہ ایمان ہے کہ محض تعلیم ہی ایک ایسا ذریعہ ہے، جس سے جرمنی اپنے آپ کو ہر لحاظ سے باقی ملکوں کا ہم پلّہ ثابت کر سکتا ہے۔

نظامِ جسمانی میں جلد کی اہمیّت

اور

اُس کی صحت و حفاظت

از

محمّد شریف ہیڈ ماسٹر، مڈل اسکول، بلھڑوال

قیامِ صحت اور جسمِ انسانی کے اعضا کی حفاظت کے لیے "جلد" جس قدر ضروری ہے، عام طور پر اُسی قدر اُس کی حفاظت سے غفلت کی جاتی ہے۔ جلد کی پاکیزگی سے جہاں انسان کی صحت برقرار رہتی ہے اور اُس کا جسم محفوظ رہتا ہے، وہاں یہ بات بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ طویل العمری کا راز بھی جلد کی صحت و صفائی میں مضمر ہے۔

جلد پر دو قسم کی کثافتیں پائی جاتی ہیں۔ (۱) اندرونی یعنی وہ کثافتیں جو جسم کے اندر سے پسینہ وغیرہ کے ذریعہ خارج ہوتی ہیں۔ (۲) بیرونی وہ مواد فاسد جو خارجی طور پر ہوا یا لباس سے جلد پر چمٹ جاتے ہیں۔ اگر جلد کو ان کثافتوں سے صاف کرنے کا باقاعدہ اور مستقل اہتمام کر لیا جائے، تو انسان بہت سے ایسے جسمانی امراض اور نقائص سے محفوظ ہو جائیگا، جو انسانی عمر کے درخت کو گھن لگا دیتے ہیں۔

جب کوئی شخص بیمار ہوتا ہے، تو "طبیعت مدبّرِ بدن" اور مرض میں ایک طرح کی جنگ ہوتی ہے۔ پھر اگر طبیعت کمزور پڑ جائے، تو مرض کا غلبہ ہو جاتا ہے اور یہ مسلمات اطبا سے ہے کہ جلد مرض کی صورت میں طبیعت مدبرہ انسانی کی معاون ہوتی ہے۔ اس لیے

مضبوط اور صاف ستھری جلد والے انسان اکثر بغیر علاج ہی کے تندرست ہو جاتے ہیں اور اگر دوا دارو تک نوبت بھی آ جائے، تو جلد کی مضبوطی کے باعث جلدی صحت ہو جاتی ہے۔

جلد میں اس قدر مسامات ہیں کہ ان کا شمار نہیں ہو سکتا۔ انھیں مسامات کے ذریعے جسم کی اندرونی کثافتیں اور ردّی فضلات خارج ہوتے رہتے ہیں، جن سے دورانِ خون قائم رہتا ہے۔ اگر جلد نہ ہو، یا یہ اخراج مواد کے قابل نہ رہے، تو اندرونی فاسد مادے اندر ہی اندر مزید غلاظت کا موجب ہو جائیں جس سے انسان بہت سے امراض مہلکہ میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ اس لیے جس قدر جلد مضبوط اور صاف ہوگی، اُسی قدر اخراج موادِ فاسدہ کے زیادہ قابل ہوگی اور جس قدر یہ اپنے فرائض کی ادائیگی کے قابل ہوگی، انسانی جسم اور طبیعتِ انسانی امراض کی طرف راغب نہ ہوگی۔

اس کے علاوہ کمزورجلد تغیراتِ موسمی سے جلد متاثر ہوگی اور جس قدر موسم کی حدّت و شدّت کا اثر زیادہ ہوگا، اُسی قدر نزلہ، زکام، نمونیا اور پھیپھڑے کے امراض کا حملہ جلد ہوگا۔

اس کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے، جلد کی صحت و صفائی سے غافل ہونا، اپنے آپکو موت کے گڑھے میں گرانا ہے۔ اس لیے ضرورت اور سخت ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر روز جلد کی صفائی باقاعدہ کی جائے، کیونکہ اخراجِ مواد اور بیرونی کثافتوں کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ اس کے لیے

۱۔ ہر روز صبح غسل کیا جائے اور بعد میں کسی کھردرے کپڑے یا تولیے سے جلد کو یہاں تک رگڑا جائے کہ سرخ ہو جائے۔ اس طرح جلد مضبوط ہوتی اور خون کو کھینچنے کے قابل بنتی ہے۔ بہتر ہو کہ کبھی کبھی شیر گرم پانی میں صابن کو حل

کر کے اس سے جلد کو دھویا جائے۔

(ب) لباس اور بستر صاف ہو اور اُسے جلد جلد تبدیل کیا جائے۔ زیادہ گرم اور سمور کے لباس وغیرہ سے بوجہ حرارت جلد کمزور ہو جاتی ہے، اس لیے جسم کو اس کا عادی نہ بنایا جائے۔ لباس ایسا ہو، جو پسینے کو جذب کر سکے۔ اس لیے اندر کھدر یا قالین کی صدری پہن لینی چاہیے۔

(ج) مکان ہوادار ہو اور حتی الوسع کھلی ہوا میں رہیں۔ کیونکہ بند ہوا سے عموماً مسامات بند ہو جاتے ہیں۔ ہر روز سیر بھی مفید ہے۔ کیونکہ زیادہ بیٹھنا بھی مسامات کے لیے مضر ہے۔

(د) گاہے بگاہے جسم پر کڑوے تیل کی مالش کی جائے اور ہر روز باقاعدہ طبیعت کے مطابق ورزش کی جائے۔ اس سے پسینہ بکثرت آتا ہے اور اندرونی فضلات ردّیہ خارج ہو جاتے ہیں۔

(ہ) غذا مقوی، زود ہضم اور طبیعت کے موافق ہو۔ مقررہ اوقات پر کھائی جائے۔ ایسی نہ ہو، جو پسینے کو خارج ہونے سے روکے۔ عام طور پر چربی اور پنیر وغیرہ کا استعمال پسینے کو روکتا ہے۔

یہ ہیں وہ سادہ ہدایات جن پر عمل کرنے سے انسان صحت و توانائی حاصل کر سکتا ہے اور عمر طبعی تک پہنچ سکتا ہے۔

ہمارے دیہاتی مدارس میں طلبہ کے لیے جسم کی صفائی کے متعلق بھی بہت سے موانع موجود ہیں اور مَیں تو یہاں تک کہنے کے لیے تیار ہوں کہ اصول حفظِ صحت کے مطابق دیہاتی طالب علم اپنے جسم کی جلد کو صاف ہی نہیں رکھ سکتا۔ شہروں میں پختہ سڑکیں اور

گلی کوچے ہیں۔ ملازم مقرر ہیں، جو باقاعدہ سڑکوں اور گلی کوچوں کو صاف کرتے ہیں اور ہر وقت چھڑکاؤ اور صفائی ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے گرد و غبار کی اتنی کثرت نہیں، جیسی دیہات میں۔ یہاں دو دو، تین تین میل فاصلہ پیدل طے کر کے طالب علم اسکول میں پہنچتے ہیں۔ دیہاتی رستے ریت، کلر اور گرد و غبار سے اٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ راستے کی خس و خاشاک طالب علم کے کپڑوں پر پڑتی ہے اور اس طرح جلد کے مساموں پر مضر اثر ڈالتی ہے۔

دیہاتی مدارس میں طلبہ کو بالعموم کچے فرش پر ٹاٹ بچھا کر بیٹھنا پڑتا ہے۔ کچے فرش کی گرد ٹاٹ میں شامل ہو جاتی ہے۔ اس فرش اور ٹاٹ وغیرہ کو بیچارہ طالب علم ہر روز خود صاف کرتا ہے۔ اس لیے گرد اُڑ کر پھر طالب علم کے ہی جسم کا حصہ بن جاتی ہے۔

ان حالات میں بہت دشوار ہے کہ دیہاتی طالب علم اپنے لباس کو (جو بالعموم کھدّر ایسے موٹے کپڑے کا ہوتا ہے، جو گرد کو بہت جلد قبول کر لیتا ہے) صاف رکھ سکے۔ لباس کی کثافت کا اثر جلد پر ہوگا۔ جس کے باعث انسانی صحت مخدوش ہوتی جائیگی۔

دیہاتی طالب علم باقاعدہ غسل بھی نہیں کرتے۔ وہ اپنے سرپرستوں کی ناداری و عدم استطاعت کے باعث عمدہ صابن نہیں خرید سکتے اور اگر یہ انتظام بھی ہو جائے، تو اس کا کیا علاج، کہ حالات گرد و پیش کے ماتحت اُن کا لباس صاف رہ ہی نہیں سکتا۔

ہر روز نہانا اور کثیف لباس پہننا نہ نہانے کے برابر ہے۔ کیونکہ لباس کی

میل کچیل سے جسمِ انسانی کی جلد میلی ہوگی۔ اس کے مسام اپنا طبعی فرض ادا نہ کرسکیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ لوکل باڈیز دیہاتی طالب علم کی صحت کے متعلق افسوسناک غفلت کا ثبوت دے رہی ہیں۔ کئی مدارس تو ایسے ہیں، جنھیں اس "مقامی حکومتِ خود اختیاری" کی بدولت ٹاٹ بھی میسّر نہیں اور وہاں طالب علم "کیسی زمین بنائی کیا آسمان بنایا" ہی کے فلسفے پر غور کرتا رہتا ہے۔

دُنیا ٹٹو سے ہوائی جہاز تک ترقی کر گئی۔ لیکن دیہاتی طالب علموں کی قسمت "بوریانشینی" سے آگے نہ بڑھ سکی۔

"آج کے بچے کل کے باپ ہیں"۔ یہ دیہات کے "بوریانشیں" کل باپ ہوکر کیا کرینگے۔ کاش لوکل باڈیز کے ارکان ان "پدرانِ فردا" کی طرف توجہات کا انعطاف فرمائیں کہ ان کی صحت بحال رہے۔ ان کے جسم صحیح ہوں تاکہ ان کا دماغ صحیح تربیت پاسکے۔ ممکن ہے کہ آئندہ قوم "خلقِ حسن" کی دولت سے مالامال نظر آئے۔

بچّے کی سیرت کیسے بنتی ہے

از

میرزا مقبول بیگ بدخشانی، بی۔ اے، سنٹرل ماڈل اسکول، لاہور

سچّائی:

اخلاق کے ساتھ تعلق رکھنے والی تعلیم کا ایک بڑا ہی ضروری مقصد یہ ہوتا ہے کہ بچے کو سچ کی عادت ڈالے۔ سچ کی عادت سے یہ مراد ہے کہ بچّہ جو کہے سچ کہے۔ اس سے یہ بھی مراد ہے کہ وہ سوچ بچار اور خیالات میں سچّا اور کھرا ہو۔ میرے نزدیک خیالات کی سچائی زیادہ ضروری اور زیادہ خوبی والی بات ہے۔ مَیں اس انسان کو زیادہ اچھا انسان سمجھتا ہوں، جو یوں تو جھوٹ ہی کہتا ہے، لیکن وُہ خود اس پر سچّے دل سے یقین رکھتا ہے اور اُسے پوری پوری طرح جانتا ہے۔ اس شخص کی نسبت، جو اَن جان طور پر اوّل ہی اوّل اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے۔ پھر اپنے آپ کو سچّا اور نیک سمجھنے لگتا ہے۔ سچ کہنے والا سچ تو کہتا ہے، لیکن یہ بات ماننے کے لیے وہ بھی تیار نہیں کہ جھوٹ کہنا ہمیشہ بُرا ہے۔ وُہ شخص جو کہا کرتے ہیں کہ جھوٹ بولنا ہمیشہ بُرا ہوتا ہے، انھیں بھی روز مرّہ کے ایسے مسئلوں میں، جن کی کئی صورتیں ہوتی ہیں، جھوٹی باتیں کہنا پڑتی ہیں۔ لیکن وہ اس حق بات کو محسوس کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے کہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایسے اتفاق بہت کم ہوتے ہیں۔ جب ہمیں جھوٹ بولنا ہی پڑتا ہے۔ ہماری طرف کوئی ظلم اور تعدّی کا ہاتھ بڑھا رہا ہو اور اس سے بچنے کی کوئی صورت نہ ہو یا لوگوں نے ضرر پہنچانے والا فعل جاری رکھا ہو

اور اس سے محفوظ رہنا ممکن نہ ہو، مثلاً جنگ ۔ تو ہم جھوٹ بول دیتے ہیں اور ایسے موقعوں پر جھوٹ بولنا جائز بھی ہے ۔ خدا نہ کرے، اگر آج قوموں کے درمیان عالمگیر جنگ چھڑ جائے، تو انسانیت کے اصول کو نظر کے سامنے رکھتے ہوئے، کتنی قومیں ہیں، جو سچ پر قائم رہینگی، تو گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر انسانی سماج کے حالات اچھے ہوں، تو جھوٹ بولنے کے موقعے اور بھی کم ہونگے ۔

یاد رکھیں جھوٹ ہمیشہ خوف سے پیدا ہوتا ہے ۔ خوف ہوگا، تو بچاؤ کے لیے پناہ ڈھونڈنا پڑیگی اور بہترین پناہ جھوٹ کی ہوتی ہے ۔ ڈر نہیں ہوگا، تو بچنے کے لیے کسی پناہ کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوگی ۔ وہ بچہ جس کی پرورش ایسے ماحول میں ہوئی ہو، جہاں خوف اور ہراس نام کو نہ ہو، تو ضروری بات ہے کہ وہ بچہ سچ بولے ۔ اس کی سچائی کسی اخلاقی کوشش کی برکت کا نتیجہ نہ ہوگی، بلکہ اس لیے کہ اُسے سچ بولنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا ۔ جس بچے کی تربیت محبت اور شعور والوں نے کی ہو، اُس کی آنکھیں آزادی کی چمک سے روشن ہونگی ۔ اسے اگر ناواقف اور اجنبی لوگوں سے بھی واسطہ پڑے، تو اُن کے سامنے بھی وہ آزاد اور نڈر لوگوں کی طرح کھڑا ہوگا ۔ لیکن وہ بدنصیب بچے جن کی تربیت سختیوں اور نظربندیوں میں ہوئی ہو ۔ انھیں ہر وقت سرزنش، تنبیہ، دھمکی، مار پیٹ کا خوف لگا رہیگا ۔ آزادی کے ساتھ وہ کوئی بات کر بیٹھیں، تو انھیں یہ گمان ہوگا کہ ہم نے اخلاق کے قانون کی کوئی نہ کوئی حد ضرور توڑ دی ہے ۔ بہت دفعہ آپ نے یہ بات دیکھی ہوگی کہ بچے کو پہلے پہل تو یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ جھوٹ بھی بولا جا سکتا ہے ۔ جھوٹ تو ایجاد ہے، ان بچوں کے دماغوں کی، جنھوں نے خوف اور دہشت کے ماحول میں پرورش پائی ہے ۔ جن کا بچپن سزا اور دھمکی کے سوا کسی دوسری چیز سے واقف نہیں ۔ جنھوں نے بزرگوں کے ماتھوں پر تیوریوں اور گھرکیوں

کے علاوہ کوئی دوسری علامت نہیں دیکھی ۔ بچّے پھر یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بڑے ان سے جھوٹ بولتے ہیں۔ اُنھیں بھی معلوم ہونے لگتا ہے کہ سچ کہنے میں خطرہ ہے۔ ان حالات میں بچّے جھوٹ بولنے لگتے ہیں۔ ان ناموافق حالات کو پیدا نہ ہونے دیں، تو بچّہ کبھی جھوٹ نہ بولے گا۔

لیکن یہ بات جاننے کے لیے کہ بچّہ واقعی سچا ہے۔ ہمیں خاص احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے ۔ بچّوں کے حافظے بہت کمزور اور نقص والے ہوتے ہیں۔ وُہ عام طور پر ایک سوال کا جواب نہیں دے سکتے۔ ان کو وقت کے اندازے کا بھی ٹھیک ٹھیک احساس نہیں ہوتا۔ چار سال سے کم عمر کا بچّہ گزرے ہُوئے ایک دن اور گزرے ہُوئے ایک ہفتے کے عرصے میں تمیز نہیں کر سکتا۔ سات دن پہلے کوئی بات واقع ہو جائے، تو آپ کا بچّہ آپ سے کہدیگا، یہ بات کل ہُوئی تھی۔ چچا ایک مہینے سے آئے ہوں اور بچّے سے کوئی پوچھ لے، چچا کب آئے؟ تو بچّہ کہدیگا "وہ پرسوں آئے تھے۔" بچّے جب آپ کے کسی سوال کا جواب دینے سے معذور ہوں، تو وہ آپ کے سوال کے لہجے کے موافق "ہاں" یا "نہیں" کہہ دینگے۔ کسی بات پر زور دے کر آپ بچّے سے جو جی میں آئے کہلوالیں۔ کبھی کبھی وُہ آپ سے یہ بھی کہہ دینگے، "وُہ باغ میں شیر" ہے۔ بچّے کی اس قسم کی باتیں غلط تو ہونگی، لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ وُہ جھوٹ بول رہے ہیں، یا وُہ آپ کو دھوکا دے رہے ہیں۔ بڑوں کے متعلق پہلے پہل ان کا یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ غیب کی باتیں جانتے ہیں، اس لیے ان کو یہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ ہم انھیں دھوکا دیں۔ آپ کے چھوٹے بچّے کے ساتھ کوئی دلچسپ واقعہ پیش آیا ہو اور اس وقت آپ اس کے ساتھ نہ ہوں، جب بھی وہ کہانی کی لذّت کی خاطر آپ سے پوچھتا جائیگا۔ "ابّا وُہ کیا ہُوا تھا؟" آپ لاکھ اس سے کہتے جائیں، ہمیں کیا معلوم "وہ کیا ہُوا تھا؟"

لیکن کہانی سُننے کی لذت اس کے ذہن میں اتنی ہوگی کہ وُہ آپ سے پوچھتا جائیگا "ابا وُہ کیا ہُوا تھا؟" کچھ عرصہ ہُوا کسی تقریب پر ہم نے اپنے بیٹے کو بہت سی مٹھائی لاکر دی اور اس سے یہ بھی کہہ دیا۔ زیادہ مت کھانا۔ زیادہ کھاؤگے، تو بیمار ہو جاؤگے۔ اس نے بہت زیادہ مٹھائی کھالی اور بیمار ہوگیا۔ تندرست ہُوا، تو میرے پاس آیا۔ اُس کا چہرہ میری بات کے صحیح ثابت ہونے کے سبب تمتما رہا تھا۔ کہنے لگا "ابا میں بیمار ہوگیا۔ آپ نے کہا تھا، تم بیمار ہو جاؤگے"۔ صحت کی ایک اصولی بات تھی، جو میں نے اس سے کہی تھی۔ میری کہی ہُوئی بات کا اس نے تجربہ کرلیا۔ یہ تجربہ اس کی خواہش میں رکاوٹ پیدا کرنے والا تھا۔ لیکن اس تجربے پر وہ خوش بھی تھا۔ مٹھائی خریدنے کے موقعے کچھ زیادہ نہیں آتے۔ لیکن اس کے باوجود ہم جب چاہیں اور جتنی مٹھائی چاہیں، اس کی حفاظت میں رکھ دے سکتے ہیں۔ اب اگر ہم اس سے کہہ دیں "فلاں چیز تمھاری صحت کے لیے اچھی نہیں"، تو وُہ اُسے چھوتا بھی نہیں۔ کھانے کے متعلق ہماری ہر بات کو وہ درست سمجھ لیتا ہے۔ کھانے کی چیزوں کے متعلق بچّے کو بڑی مشکل سے دھوکا دیا جاسکتا ہے، لیکن اپنے تجربے کا اُسے اس قدر یقین ہو چلا ہے کہ ہم اگر چاہیں تو کھانے کے مسئلے میں بھی اُسے دھوکا دے لیں۔ بچّے کو اس نتیجے تک پہنچانے میں ہمیں کوئی جھڑکی نہیں دینا پڑی۔ کوئی چھڑی استعمال نہیں کرنا پڑی۔ اُسے خوف و ہراس کے کسی لمحے سے نہیں گزرنا پڑا۔ ایسے موقعوں پر ایک چیز کی ضرورت ہوا کرتی ہے اور وہ ہے استقلال۔ ہمارا بچّہ اب ایسی عمر میں ہے، جب بچّے کھانے پینے کی چیزیں گھر سے چرالینا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ کھانے کی چیز، ہو سکتا ہے، وُہ بھی چرالے، لیکن اگر اس سے اس چوری کے متعلق دریافت کیا جائے، تو یہ نہیں ہو سکتا کہ وُہ جھوٹ کہے۔ اگر کوئی بچّہ جھوٹ بولے، تو یہ نہیں چاہیے کہ والدین اس بچّے کو سزا دیں۔ اُنھیں

تو چاہیے کہ خود اپنے آپ کو سزا دیں۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ وُہ اسباب کون سے ہیں، جو بچّے کو جھوٹ بولنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ چاہیے کہ ہم وہ اسباب دور کر دیں۔ سزا دینے سے بچّہ جھوٹ سے باز نہیں آئیگا۔ والدین کو چاہیے کہ پیار سے بتائیں اور دلیل کی روشنی میں سمجھائیں کہ سچ بولنا کیوں اچھا ہے اور جھوٹ کہنا بُرا کیوں؟ سزا کو جھوٹ سے باز رکھنے کی تدبیر سمجھ لینا بہت بڑی غلطی ہے۔ سزا دینے سے بچّے کا خوف بڑھیگا۔ خوف سے جھوٹ بولنے کی وجہ کو اور زیادہ قوت حاصل ہوگی۔ وُہ ماں باپ جو بچّوں سے کہتے ہیں، جھوٹ بولنا گناہ ہے۔ مرنے کے بعد تمھیں تپتی ہُوئی لوہے کی سلاخوں سے سزا ملیگی، وہ گویا اپنے اخلاقی اختیار سے ہاتھ اُٹھا لیتے ہیں۔ ان کے اس وعظ کا پورا پورا اثر نہیں ہوتا اور عقبےٰ کی سزا کا زیادہ سے زیادہ خوف اُنھیں جھوٹ سے باز نہیں رکھ سکتا۔ ہمارے بزرگ عام طور سے اپنے آپ کو بچّوں کے سامنے ہر غلطی سے پاک اور ہر گناہ سے خالی پیش کیا کرتے تھے۔ یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ وُہ جو کچھ کرتے ہیں، دلیل کی روشنی میں کیا کرتے ہیں۔ جب وہ بچّوں کو ملامت کرتے تھے، تو غصّے کی حالت میں نہیں، بلکہ رنج اور افسوس کے ساتھ۔ کتنا ہی جھڑک لیں، لیکن ان کی جھڑک اس لیے نہیں ہوتی تھی کہ اپنے غصّے کو فرو کرلیں، بلکہ اس لیے کہ اس سے بچّے کی بھلائی ہوگی۔ یہ سب درست تھا لیکن والدین یہ محسوس نہیں کرتے تھے کہ بچّے کو قدرت نے بڑی ہی صاف نظر دی ہے اور ایسی صاف کہ ہمیں دیکھ کر حیرت ہو۔ وہ ان سیاسی ضرورتوں کو بھی نہیں سمجھتے تھے، جو جھوٹ بولنے پر مجبور کر دیا کرتی ہیں۔ وہ نہایت سادگی اور صاف دلی سے اس کے خلاف نفرت اور حقارت ظاہر کر دیتے تھے۔ بچّے کی روزمرّہ کی زندگی میں رشک اور حسد بھی ہوتے ہیں۔ لیکن اس صورت میں کہ آپ کو ان کا پتہ نہیں ہوتا، لیکن یہ چیزیں بچّے کے ذہن میں موجود ہوتی ہیں۔ وُہ آپ کی

ساری اخلاقی نصیحتوں کو رشک اور حسد کے بُرے سے بُرے جذبوں کی خاطر قربان کر دینگے۔ بچّے کے سامنے کبھی اپنے آپ کو اس صورت میں پیش نہ کرو کہ ہم دنیا کے عام انسانوں سے بہت اُونچے ہیں۔ ہم سے غلطی ہو ہی نہیں سکتی۔ ہم فرشتوں کی طرح پاک ہیں۔ بچے کبھی ان باتوں کا یقین نہیں کریں گے اور اگر یقین کر بھی لیں، تو اس حالت میں وہ آپ کو کبھی پسند نہیں کرینگے۔ (اس زمانے میں جب کہ مَیں ابھی بچّہ ہی تھا، میرے ارد گرد مکر اور ریا اس قدر گھرا ہوا تھا کہ مَیں نے قسم کھالی تھی کہ بچّہ پیدا کرنے کی غلطی مجھ سے ہو بھی گئی، تو مَیں اس غلطی کو دہراؤنگا نہیں۔ مَیں اس قسم پر قائم ہوں ـــــــ رَل)۔

جھوٹ کی ایک دوسری قسم جو بچّوں کے لیے حد سے زیادہ بُری ہے، یہ ہے کہ تم بچّے کی کسی غلطی پر ایسی سزا کی دھمکی دیتے ہو، جو تم دیتے نہیں، اور دے سکتے بھی نہیں۔ ڈاکٹر بیلڈ اپنی کتاب Changing School میں لکھتے ہیں: "بچّے کو دھمکی نہ دو اور اگر کسی بات پر دھمکی دیتے ہو، تو اُس پر عمل بھی کرو۔ اس سے باز نہ رہو۔ چاہے تم پر کچھ ہی گزر جائے۔ تم بچّے سے کہہ دیتے ہو، فلاں بات مت کرنا اور اگر کروگے، تو میں تمہیں جان سے مار دونگا اور اگر وہ وہی بات کرے، تو تمھیں چاہیے کہ اُسے جان سے ہی مار دو اور اگر نہیں مار دوگے، تو تمہارا احترام ہمیشہ کے لیے اس کے دل سے اُٹھ جائیگا۔" کسی خاص بات پر اڑو نہیں اور اگر اڑتے ہو، تو کسی ایسی بات کے لیے اڑو، جو معقول ہو۔ کسی بات پر اڑ ہی جاتے ہو، تو ٹلو نہیں۔ چاہے اس کے لیے تمہیں بعد میں کتنا ہی پچھتانا پڑے۔ اگر تم کسی سزا کی دھمکی دیتے ہو، تو یہ سزا ایسی ہونا چاہیے، جو تم دے بھی سکو۔ اس بات کی اُمید نہ رکھو کہ تمھاری گیدڑ بھبکی کا بھرم کھلے گا نہیں۔ اَن پڑھ ماں باپ کے لیے اس اصول کا سمجھنا قدرے مشکل ہے۔ بعض دفعہ ماں باپ یہ دھمکی دیتے ہیں۔ "ہم تمھیں

پولیس کے سپاہی کے سپرد کردینگے" "تمہیں ٹھیلے والے پٹھان کو دے دینگے" یہ کس قدر اعتراض اور ذلت کی بات ہے۔ کون ہے، جو اپنے بچے کو ہتھکڑی لگوالے۔ کون ہے، جو بچے کو کسی ٹھیلے والے کی نذر کردے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے سمجھنے لگتے ہیں کہ ماں باپ ڈرانے کے لیے یوں ہی کرلیا کرتے ہیں۔ اس قسم کی دھمکی سے ایک برائی تو یہ ہے کہ بچے کے دل اور دماغ میں خوف کا فوری دھماکا سا ہوتا ہے۔ اس کے بعد یہ کہ بچہ سمجھنے لگتا ہے، سب دھمکیاں، دھمکیاں ہی تھیں۔ اصلیت ان کی کچھ نہ تھی۔ یہ بزرگ یوں بھی فریب دے لیتے ہیں۔ اگر آپ اپنی باتوں کا بار بار تجربہ کرادیں، تو بچہ سمجھنے لگتا ہے۔ ایسی باتوں میں ضد کرنا ٹھیک نہیں اور وہ آپ کی آنکھ اور ابرو کے اشارے پر بغیر کسی قسم کی تکلیف دیے ہوئے عمل کریگا۔ لیکن اس طریق کو کامیاب بنانے کے لیے ضروری بات ہے کہ تم کسی خاص بات پر اڑو نہیں، تاوقتیکہ تمہیں کوئی بڑی ہی ضرورت پیش نہ آئے۔

جھوٹ کی ایک اعتراض والی صورت یہ بھی ہے کہ ہم بچوں کے سامنے، بے جان چیزوں سے جاندار چیزوں کا سا سلوک کرنے لگتے ہیں۔ بچے کو کسی چارپائی کے پائے سے ٹھوکر لگتی ہے۔ بچہ ضرب کو بہت زیادہ محسوس کرتا ہے۔ دایہ یا ماں کہنے لگتی ہے۔ یہ چارپائی بہت شریر ہے، میں اس سے سمجھ لیتی ہوں۔ بعض دفعہ تو اس چارپائی کے دو ایک چپت بھی لگا دیے جاتے ہیں۔ تو گویا اس جھوٹے عمل سے بچے کو راضی کرلیا جاتا ہے۔ لیکن اس سے قدرتی تعلیم کے ایک نہایت ہی مفید ذریعے کو فنا کردیا جاتا ہے۔ بچہ تھوڑی دیر کے بعد اپنے آپ ہی سمجھ لیتا ہے کہ اس چارپائی میں تو جان ہی نہیں اور بے جان چیز تو ہاتھ کی حرکت سے راستے سے ہٹائی جاسکتی ہے۔ غصے یا خوشامد سے نہیں۔ چارپائی کا تکلیف دہ ہونا، تو بچے کو حرکت کرنے پر اکساتا ہے۔ اگر وہ اپنے ہاتھ کے زور سے چارپائی کو

راہ سے ہٹا لے، تو وہ اپنی طاقت کا اندازہ کر کے خوش بھی ہوگا ہم فرضی اور جھوٹے عمل سے بچے کے آنسو تو پونچھ دیتے ہیں، لیکن تعلیم کے اس قدرتی پہلو کو فنا کر دیتے ہیں۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے۔

وُہ بچے جن کی نشو ونما سختی اور دباؤ کے ماحول میں نہ ہوئی ہو، وُہ آپ سے بہت سے سوالات پوچھیں گے۔ ان سوالوں میں بہت سے ایسے ہونگے، جو ان کی ذہانت کا ثبوت ہونگے۔ بہت سے ایسے بھی ہونگے، جو ان کی کم علمی کی دلیل ہونگے۔ یہ سوال آپ کو تھکا دینگے۔ بعض وقت آپ ان سوالوں سے پریشان بھی ہو جائیں گے۔ لیکن آپ کو ان کا جواب ٹھیک ٹھیک اور پوری لیاقت سے دینا ہوگا۔ اگر بچّہ مذہب کے متعلق آپ سے سوال کرے، تو آپ اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دیں۔ یہ جواب ایسا ہونا چاہیے، جس پر آپ کو پورا پورا یقین ہو۔ آپ کا جواب اگر کسی محترم بزرگ کے جواب کے مخالف ہو، تو آپ اس کی ذرّہ بھر پروا نہ کریں۔ کہیں وہی جو آپ کے دل میں ہے۔ اگر وہ آپ سے موت کے متعلق کچھ دریافت کرے، تو آپ بے لاگ جواب دیں۔ اگر وہ اس قسم کے سوال کرے، جس سے مقصود یہ ہو کہ وہ آپ کو بیوقوف اور احمق ظاہر کرنا چاہتا ہے، جب بھی آپ پورے تحمل سے جواب دیں۔ اگر وہ آپ سے جنگ کے متعلق دریافت کرے، تو جواب دیں۔ اگر وُہ آپ سے پھانسی کے تختے پر لٹکانے کی سزا کا حال معلوم کریں، تو صاف بتائیں۔ یہ مت کہیں کہ ان کے جواب تمھاری سمجھ سے بہت پرے ہیں۔ اس طرح سے اُسے خاموش کر دینا ٹھیک نہیں۔ اگر آپ سے وہ کوئی سائنس کا پیچدار مسئلہ پوچھ لے کہ بجلی کیسے بنتی ہے اور یہ قمقموں میں کیسے آ جاتی ہے، تو اس سوال کا جواب دیتے ہُوئے بھی یہ بات نظر کے سامنے رہنا چاہیے کہ اُسے خاموش نہ کر دیا جائے۔ کہنا یہ چاہیے کہ اس کا جواب بڑا ہی دلچسپ ہے۔ تم جب بڑے ہو گے اور تھوڑا بہت علم بھی حاصل کر لوگے، تو

تمھیں اس کا جواب معلوم ہو جائیگا جس حد تک وہ اس کا جواب سمجھ سکے، آپ اُسے بتا بھی دیں، بلکہ اس سے کچھ زیادہ بھی، اس سے کم نہیں۔ جواب کا وہ حصّہ جسے وہ اچھی طرح سمجھ نہ سکے، اُسے جستجو پر اکسائیگا۔ اس کے ذہن میں اُس کے جاننے کے لیے خواہش پیدا ہوگی۔

اگر بچے سے آپ ہمیشہ سچ بولتے رہیں، تو بچّہ ہمیشہ سچ بولیگا۔ بچّے کے دل میں قدرتی میلان یہ ہوتا ہے کہ جو آپ کہیں، اس کو سچ مان لے۔ تاوقتیکہ آپ اسکی کسی بڑی ہی پختہ خواہش کے خلاف کچھ نہ کہیں، وہ آپ کی ہر بات کو سچی سمجھیگا۔ بچّہ اگر آپ کے بیانوں کا تجربہ کرلے اور انھیں سچا پائے، تو اُس کے دل میں آپ کا پورا پورا اعتماد بیٹھ جائیگا۔ اس میں آپ کو کسی قسم کی کوشش کرنے کی ضرورت نہ ہوگی اور اگر تم دھمکیاں ہی دیتے جاؤ گے اور ایسی دھمکیاں کہ اُنھیں پورا بھی نہ کرسکو، تو تم کو جگہ جگہ پہ اڑنا پڑیگا اور تم خوف اور وحشت کا مجسّمہ بن کر رہ جاؤ گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ تم اس کے دل اور دماغ میں ایک ڈانواڈول سی کیفیت پیدا کر دو گے۔ مجھے یاد ہے، ایک دن ہم سب ایک نہر کے کنارے بیٹھے ہُوے تھے۔ صاحبزادے صاحب بھی ساتھ تھے۔ پاؤں پانی میں لٹکا رکھے تھے اور چاہتے تھے، پاؤں زور زور سے ہلائیں اور یوں گویا پانی میں بائیسکل چلائیں۔ آپ کی یہ خواہش ہر لمحے زیادہ تیز ہوتی جاتی تھی اور ہمیں یہ فکر ہو رہی تھی کہ کہیں کنارے کی کوئی کنکری پاؤں میں نہ لگ جائے۔ مَیں نے اس سے کہا۔ بیٹے، کنارے کے ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی کنکریاں اُبھری ہوتی ہیں۔ ان کے کنارے بہت تیز ہوتے ہیں ایسا نہ ہو تمھارے کوئی لگ جائے۔ آپ نے پوری رفتار پر سائیکل چلانے کا تہیہ کر رکھا تھا اور میری بات سُنی اَن سُنی کر دی۔ لیکن اس قدر کہہ بھی دیا، ابّا کنکریاں یہاں کہاں ہوتی ہیں۔ مَیں خاموش ہو گیا اور پانی میں ہاتھ ڈال کر کنارے کے ساتھ کنکریاں تلاش کرنا شروع کر دیں۔ مجھے پتھر کا ایک ٹکڑا ملا، جس کے کئی کونے تھے۔ ہر کونہ تیر کی نوک کی طرح تیز تھا۔ مَیں نے وہ ٹکڑا اس کے ہاتھ

یں دے دیا۔ وہ چپ چاپ ہو کر رُک گیا۔ اس کی ساری حرکت ختم ہو گئی۔ اُسے یقین آ گیا کہ کنارے پر کنکریاں ہوتی ہیں اور یہ بھی یقین آ گیا کہ یہ لگ بھی جاتی ہیں۔ کوئی نہیں لگی، تو یہ اتفاق کی بات ہے۔ اگر اس کے برعکس مَیں کوئی کنکری یونہی کہیں سے اُٹھا لیتا، تو میرا اعتماد اس کے دل سے ضرور ہی اُٹھ جاتا۔ تلاش میں اگر مجھے کوئی کنکری یا پتّھر کا ٹکڑا نہ مل سکتا، تو مجھے چاہیے تھا کہ اُسے سائیکل چلانے کی اجازت دے دیتا۔ اس نے اسی طرح سے ہماری بہت سی باتوں کے تجربے کر لیے ہیں۔ اب وہ ہماری کسی دلیل پر شک نہیں کر سکتا۔

ہم جھوٹ اور فریب کی دنیا میں رہتے ہیں اور وہ بچّہ جس کی پرورش جھوٹ اور فریب کے ماحول میں نہیں ہُوئی، ہماری بہت سی باتوں سے جنھیں ہم عزّت کے قابل خیال کرتے ہیں، نفرت کرنے لگینگے۔ یہ بات افسوس ناک ہے۔ چونکہ نفرت بڑا ہی بُرا جذبہ ہے، مَیں ہرگز بچے کی توجّہ کو ایسی باتوں میں نہیں لگاؤنگا کہ فلاں چیز عزّت کے قابل ہے یا نفرت کے قابل۔ البتّہ جب کسی بات سے اُسے تعجب ہوگا، تو مَیں اس تعجب کو ضرور دور کرونگا۔ ہماری سماج میں اگر مکر و ریا کا دور دورہ ہو، تو اس وقت سچ ہمارے راستے کی روک ہو جاتا ہے لیکن ایسی روک بیخوفی سے دور ہو جا سکتی ہے۔ یہ بیخوفی ایسی چیز ہے، جس کے بغیر انسان سچ پر قائم نہیں رہ سکتا۔ ہم چاہتے ہیں، ہمارے بچے صاف دل، آزاد، راستباز، عزّت اور ایمان والے ہوں۔ یہ صفتیں اگر میرے بچّے میں ہوں اور ان کے باوجود وہ زندگی کے میدان میں ناکام رہے، تو پھر بھی میں اس کو ان بچّوں سے کہیں بہتر سمجھونگا، جو غلامی کے حیلے اور فن سے زندگی میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ شخصی وقار اور فخر اچھّے انسان کی زندگی کے بڑے ہی ضروری جز ہیں۔ جس میں یہ وصف موجود ہیں، وہ جھوٹ نہیں بول سکتا۔ جھوٹ اگر بولیگا، تو اُس وقت جبکہ اس کے جھوٹ سے کسی کا بگڑا ہوا کام سنورتا ہو۔ مَیں اپنے بچّوں کو الفاظ اور خیالات میں راستباز دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس سے اگر وہ دنیا کی نعمتوں سے محروم بھی رہ جائیں، تو کوئی بات نہیں۔ الفاظ و خیالات کی سچائی سے محروم ہونا بہت بڑی محرومی ہے۔ •

[ماخوذ از برٹرینڈ رسل]

اشتہار

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت	نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۴۱	سلطان علاؤالدین خلجی ...	۲ر۱۱ پائی	۶۶	بہادر شہزادہ ...	۲ر۱ پائی
۴۲	فیروزالدین تغلق ...	۳ر	۶۷	جوتی موتی ...	۲ر۱۰ //
۴۳	امیر تیمور ...	۲ر۷ //	۶۸	جواہرات کا خزانہ ...	۳ر۷ //
۴۴	پرتھوی راج ...	۲ر۸ //	۶۹	چھوا اور خزانہ ہوا باتصویر	۲ر
۴۵	محمود غزنوی ...	۲ر۶ //	۷۰	علی بابا چالیس چور ...	۴ر
۴۶	مصر کی داستان ...	۳ر	۷۱	علاؤالدین و عجیب و غریب لیمپ	۴ر۶ پائی
۴۷	جاپان کی کہانی ...	۴ر	۷۲	ملا دو پیازے کا سفر	۳ر
۴۸	چین کی کہانی ...	۳ر۶ پائی	۷۳	سادھو کنور سدھارتھ یعنی مہاتما بدھ کا دھرم گیان	۳ر
۴۹	مستورات چین و جاپان ...	۴ر	۷۴	نیشاپور کا سوداگر ...	۲ر۱ پائی
۵۰	ایران کی کہانی ...	۲ر	۷۵	پرستان کا موچی ...	۳ر
۵۱	ایشیائی روم ...	۲ر۷ پائی	۷۶	سندر پیاری ...	۳ر
۵۲	ٹرکی (یورپی روم) ...	۲ر۸ //	۷۷	چاندی کی کنجی ...	۳ر
۵۳	لنکا ...	۱ر۱۱ //	۷۸	سلک جواہر نمبر ۱ (حکمران کا گھر)	۲ر۶ پائی
۵۴	بصرہ و بغداد ...	۵ر	۷۹	// // نمبر ۲ (اوج و پستی)	۱ر۱۱ //
۵۵	یونان ...	۲ر	۸۰	// // نمبر ۳ (شہید الفت)	۱ر۶ //
۵۶	تین سوال ...	۲ر۷ پائی	۸۱	سلک جواہر ـ مرد میدان	۱ر۶ //
۵۷	امرت ورشا ...	۳ر۱۰ //	۸۲	// // نیک و بد	۱ر۹ //
۵۸	زمانہ سلف کے قصے کہانیاں نمبر ۱ داؤد بادشاہ	۲ر۶ //	۸۳	// // عیب و ہنر	۱ر۴ //
۵۹	کہانیاں بتیس پتلیاں حصہ اول ...	۳ر۹ //	۸۴	// // جہاں گرد	۱ر۶ //
۶۰	// // دوم	۴ر۵ //	۸۵	// // جواب باصواب	۱ر۱۰ //
۶۱	ہیرالال ...	۲ر۶ //	۸۶	// // سخاوت کی انتہا	۱ر۲ //
۶۲	خوفناک خواب ...	۲ر	۸۷	// // حسن تدبیر	۱ر۳ //
۶۳	دولت کی پٹاری ...	۲ر۱ پائی	۸۸	ڈرامہ نئی بستی یعنی شہرت	۱ر۳ //
۶۴	سادھو کی جھکی ...	۲ر			
۶۵	نیلا باز ...	۲ر۱۱ //	۸۹	ڈرامہ غم خوار عالم ...	۱ر۷ //

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۹۰	مہاراجہ بکرماجیت اور اُس کا تخت	ا؍۶ پائی
۹۱	سنہری گیت حصہ اوّل	۲؍۴ //
۹۲	// // دوم	۲؍۴ //
۹۳	// // سوم	۲؍۷ //
۹۴	جو مانگو	۳؍
۹۵	اسرارِ دل	۵؍
۹۶	جارج واشنگٹن ...	ا؍۶ پائی
۹۷	سکاؤٹوں کا بادشاہ ..	ا؍۸ //
۹۸	لوہے کا بادشاہ ...	ا؍۶ //
۹۹	آزادی کا بادشاہ ...	ا؍۱۱ //
۱۰۰	صابن کا بادشاہ ..	ا؍ا //
۱۰۱	ڈاکو کی مرمت ...	۲؍۶ //
۱۰۲	چھومنتر	۴؍۵ //
۱۰۳	فرصت کے کام	۳؍۴ //
۱۰۴	دنیا کے کام کاج	۵؍۵ //
۱۰۵	آداب و اخلاق	۱۰؍
۱۰۶	موقعہ	۵؍۴ //
۱۰۷	نیک اطوار	۲؍
۱۰۸	خوشی کا کھیل	۳؍۱۰ //
۱۰۹	بہادر محمود	ا؍۷ //
۱۱۰	سہراب و رستم	۲؍ا //
۱۱۱	دھوپ چھاؤں ...	۳؍
۱۱۲	راجہ ہریش چندر	۲؍
۱۱۳	گورو کے پانچ بچن	ا؍۹ //
۱۱۴	سنہری پرندہ	۲؍ا //
۱۱۵	کرشن جی کا بچپن	ا؍۴ پائی
۱۱۶	تبدیلِ قسمت	ا؍۹ //
۱۱۷	جادو کا قلعہ	۳؍
۱۱۸	راجہ گوپی چند	ا؍۷ پائی
۱۱۹	بندر کی ہوشیاری ..	ا؍۶ //
۱۲۰	بارہ بھائی	ا؍۱۰ //
۱۲۱	مشاہیرِ عالم حصہ اوّل	۳؍
۱۲۲	// // دوم	۳؍
۱۲۳	// // سوم	۳؍

کتب لائبریری

برائے لوئر و اپر مڈل سکولز

۱	رسوم ہند حصہ اوّل ..	۲؍۶ پائی
۲	// // دوم ..	۷؍۴ //
۳	تختِ سلیمانی ...	۸؍۷ //
۴	الہ دین چراغ	۴؍۶ //
۵	مہابھارت کی کہانی ..	۵؍۶ //
۶	رامائن کی کہانی	۸؍۲ //
۷	پیارا گورو نانک ...	۳؍۷ //
۸	سیّد انشاء اللہ خاں انشا	۴؍۱ //
۹	سوانح عمری نواب مرزا خاں	۴؍۲ //
۱۰	داغ	
۱۱	// نذلہ ...	۳؍۶ //
۱۲	// میر درد ..	۳؍۴ //
۱۳	// میر تقی ..	۵؍۵ //

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱۴	سوانح عمری شبلی . .	۲ر۴ پائی
۱۵	〃 〃 مولانا نذیر احمد مرحوم	۸ر۳ 〃
۱۶	〃 〃 مرزا غالب	۱۰ر۳ 〃
۱۷	پھولوں کی ٹوکری	ر۴
۱۸	سچے موتی	۱ر۳ 〃
۱۹	آزمائش	ر۴
۲۰	سدا بہار کے پھول . .	۱ر۳ 〃
۲۱	تاریخی کہانیوں کا سلسلہ	ر۸
۲۲	اٹل	۹ر۲ 〃
۲۳	امتحان	۱۰ر۵ 〃
۲۴	پنچ رتنی	۲ر۴ 〃
۲۵	بہادر مائیں	۱۰ر۴ 〃
۲۶	غلطی کا شکار	ر۶
۲۷	سات سوال	۵ر۶ 〃
۲۸	برہم رشی وشوامتر . . .	۵ر
۲۹	کرشمۂ جہالت ماسٹر کنہیا لال	ر۸
۳۰	دلچسپ کہانیاں نمبر ۱ دوارکا پرشاد	۵ر
۳۱	〃 〃 نمبر ۲	ر۶
۳۲	ملکۂ مہر انگیز	ر۵
۳۳	فتنۂ عالم	ر۳
۳۴	راجہ نل و دمینتی . . .	ر۴
۳۵	شکنتلا	۲ر۷ پائی
۳۶	سیلاب خون . . .	۶ر۶ 〃

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۳۷	ہندوستان اور جنگ عالمگیر	۷ر۴ پائی
۳۸	شہریت	۸ر۴ 〃
۳۹	آئین شہریت و قوانین صحت	ر۶
۴۰	حیات کی قوت و طاقت کا سرچشمہ	ر۴
۴۱	تاریخ عالم	۵ر۱۳ 〃
۴۲	ہندوستان کی تاریخی کہانیاں 〃 〃 حصہ اول	۶ر۱۲ 〃
۴۳	〃 〃 حصہ دوم	۹ر۱۱ 〃
۴۴	انمول موتی کی مالا	ر۶
۴۵	مشکلات کی عظمت . . .	ر۶
۴۶	داستانِ وطن . . .	ر۶
۴۷	مشاہیرِ عالم۔ حصہ چہارم	ر۳
۴۸	〃 〃 〃 پنجم	ر۴
۴۹	〃 〃 〃 ششم	ر۳
۵۰	〃 〃 〃 ہفتم	ر۴
۵۱	ہرشچندر مصنفہ رام سروپ کوشل ایم اے	۲ر۵ پائی
۵۲	ہنومان 〃 〃 〃	ر۵
۵۳	دھرو 〃 〃 〃	۳ر۵ 〃
۵۴	ارجن 〃 〃 〃	۱ر۶ 〃
۵۵	بھیشم 〃 〃 〃	۶ر۵ 〃
۵۶	پرہلاد 〃 〃 〃	۳ر۵ 〃
۵۷	چندر ہاس 〃 〃 〃	ر۵
۵۸	نرسی بھگت 〃 〃 〃	۵ر۳ 〃

برائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز ایجوکیشنل پبلشرز لاہور

Printed and published by L. Moti Ram, Manager, for Messrs. R.S.M. GULAB SINGH & SONS, at the Mufid-i-'Am Press, Chatterji Road, Lahore.

رجسٹرڈ نمبر ایل ۳۷۹۷

منظور کردہ جناب ڈائرکٹر صاحب بہادر سررشتۂ تعلیم پنجاب
بموجب سی ایم نمبر ۱۱۴۳۵ سی، مورخہ ۲۲ مئی ۱۹۳۶ء

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

اُردو ایڈیشن

زیرِ ادارت

خان بہادر شیخ نورالٰہی، ایم اے، آئی ای ایس
بشیر احمد ہاشمی ایم اے-ایم-ای-ڈی-پی ای-ایس
پروفیسر گوپال داس کھنہ، ایم اے، بی ٹی

Vol. 5. September, 1938. No. 6.

سالانہ چندہ: چار روپے

مفید اللغات اُردو

منظور کردہ جناب ڈائرکٹر صاحب پبلک انسٹرکشن پنجاب
بموجب سرکلر نمبر ۹-23307 مورخہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۳۶ء

یہ کتاب محکمۂ تعلیم پنجاب کے منظور شدہ مدارس اور دیگر مکاتب کی ضروریات اور عام طلبا و شائقین کی سہولت کے لئے نہایت کوشش، محنت اور عرقریزی سے تیار کی گئی ہے۔

اس کتاب میں ہزاروں الفاظ عربی، فارسی، پنجابی، ترکی، انگریزی وغیرہ زبانوں میں جلی قلم سے مع ان اعرابوں کے نہایت صحت اور صفائی سے دئے گئے ہیں اور ہر لفظ کے مقابلے میں اس کے معنی نہایت خوبی اور صفائی سے پیش کئے گئے ہیں۔

یہ کتاب عمدہ سفید کاغذ پر نہایت خوشخط چھپی ہے اور کپڑے کی خوبصورت سنہری جلد سے مزین ہے۔

قیمت فی جلد دو روپے (عہ)

پنجاب ایجوکیشنل جرنل

(اُردو ایڈیشن)

جلد (۵) | ستمبر ۱۹۳۸ء | نمبر (۶)

فہرست مضامین

۱

ایڈیٹوریل

ماہرینِ تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ ابتدائی تعلیم مادری زبان میں دی جانی چاہیے کیونکہ جن خیالات و جذبات کے زیرِ اثر بچّہ پرورش پاتا ہے، اُن کی ترجمانی وہ پہلے پہل اپنی مادری زبان میں ہی کرنا سیکھتا ہے۔ اگر والدہ کو بچّے کا سب سے پہلا اور قدرتی اُستاد کہا جائے، تو بجا ہے۔ جس دن بچّہ پیدا ہوتا ہے، اُسی دن وُہ اُس سے گفتگو کرنا شروع کر دیتی ہے۔ قطع نظر اس کے کہ بچّہ اس کی بات کو سمجھتا ہے یا نہیں۔ اس کے دل میں تو محبّت کا ایک دریا موجزن ہوتا ہے۔ وہ بچّے کو چومتی ہے۔ پیار کرتی ہے۔ اسے لیے لیے پھرتی ہے۔ اس سے ہزاروں ہی باتیں کرتی ہے۔ وہ دن بھی آجاتا ہے کہ بچّہ اپنی توتلی زبان میں کچھ بولنا شروع کر دیتا ہے۔ جب بڑا ہوتا ہے، تو ماں کا طرزِ تعلیم بھی اُس کی ضروریات کے موافق تبدیل ہوتا جاتا ہے۔ وہ قدرتی طور پر ایسے سامان مہیّا کرتی ہے، جو بچے کی راحت اور دلچسپی کا موجب ہوں۔ اُسے گردوپیش کی چیزوں سے آگاہ کرتی ہے۔ جسم کے مختلف حصّوں کے نام بتاتی ہے۔ خویش واقارب کی شناخت کراتی ہے اور روزمرّہ کی باتوں کو آسان الفاظ میں ادا کرنا سکھاتی ہے۔ رات کو پلنگ پر لیٹ کر یا آگ کے پاس بیٹھ کر اُسے کہانیاں سُناتی ہے۔ غرض کہ چار پانچ سال تک یونہی اُس کی ضروریات کے موافق تعلیم دیتی رہتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ایسی مائیں بھی ہیں جو بچّوں کی تربیت میں کوتاہی کرتی ہیں۔ لیکن خدا نے ہر ماں کے سینے کو بچّے کی محبّت اور ہمدردی سے معمور کر دیا ہے۔ وہ کوتاہیِ فرض کے باوجود اکثر و بیشتر اساتذہ سے بہتر ہوتی ہے۔

• •

والدہ کا یہ طرزِ عمل بچّے کی ابتدائی تعلیم میں ہماری بہت کچھ رہنمائی کرسکتا ہے جس طرح ماں کا دل بچّے کے لیے محبّت سے لبریز ہوتا ہے، اسی طرح اُستاد کا بھی ہونا چاہیے۔ اگر اُستاد کا دل طلبہ کی محبّت اور ہمدردی سے بے نیاز ہو، تو وہ اُن کی ضروریات پورے طور سے سمجھ نہیں سکتا۔

بچّے کی تعلیم جہاں تک ممکن ہو، دلچسپ ہونی چاہیے اور وہ جبھی ہوسکتی ہے کہ ماں کی طرح اُستاد کو بھی بچّے کی طبیعت اور اُس کے رجحان سے پوری پوری واقفیت ہو۔ اُستاد کو علم ہونا چاہیے کہ بچّے نے کیسے ماحول میں پرورش پائی ہے۔ اس کی دلچسپی کی اشیا کون سی ہیں اور اُسے اپنی زبان میں کس قدر دسترس حاصل ہے۔ کوئی زمانہ تھا کہ کتابوں میں مشکل الفاظ اور دقیق ترکیبیں بے طرح ٹھونس دی جاتی تھیں اور قارئین اُنھیں استحسان کی نظر سے دیکھتے تھے، لیکن تعلیم کے جدید دور میں ماہرینِ تعلیم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ نصابِ تعلیم بچّے کی قابلیت کے موافق ہونا چاہیے۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے، نہ ہی اتنی سہل ہو کہ طالب علم کو پھیکی معلوم دے اور نہ ہی اتنی ثقیل کہ وہ اُسے سمجھ ہی نہ سکے۔ دلچسپی اسی چیز میں ہوسکتی ہے جو سمجھ میں بھی آجائے اور اس میں کچھ جدّت بھی ہو۔

جب بچّہ اسکول میں داخل ہو، تو کچھ مدت تک اُس کی تعلیم زبانی ہونی چاہیے۔ ماں تو بچّے کو بالکل ہی زبانی تعلیم دیتی ہے۔ لیکن مدرسے میں پہلے تین چار مہینے طلبہ کو کتابی تعلیم نہ دینی چاہیے۔ یہ ایک اہم اصول ہے، جسے کسی اُستاد کو بھی بھولنا نہ چاہیے۔ لیکن حقیقت میں اس پر عمل بہت ہی کم ہوتا ہے۔ ہمارے تجربے میں تو یہی آیا ہے کہ جب بچّہ اسکول جاتا ہے، تو اُسی دن اُس کے ہاتھ میں کتاب دے دی جاتی ہے اور تعلیم کا کام بڑے انہماک سے شروع ہوجاتا ہے۔ اگر بچّہ پڑھائی میں کوتاہی کرے، تو اُسے پاؤں کی ٹھوکر یا بید کی ضرب سے درست کیا جاتا ہے۔ یورپ اور امریکہ کی ترقی یافتہ درسگاہوں میں صورتِ حال اس کے برعکس ہے۔

بچّہ اسکول میں قدم رکھتا ہے، تو اُسے اپنے گھر اور اسکول کی فضا میں سوائے اس کے کچھ فرق نظر نہیں آتا کہ گھر میں ماں باپ سے گفتگو ہوتی تھی اور یہاں اُستادوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ تعلیم میں کھیل کا حصّہ زیادہ ہوتا ہے اور شروع شروع میں تو ساری کی ساری تعلیم کھیل کے ذریعے دی جاتی ہے۔ ڈیوئی اپنی مشہور کتاب "درسگاہ فردا" (Schools of Tomorrow) میں ایک اسکول کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بچے جب کھیل کے دوران میں خاص خاص فقرے یا الفاظ استعمال کرتے ہیں، تو اُستاد اُنھیں اپنی بیاض میں درج کر لیتا ہے اور پھر خاص ترتیب دے کر اُنھیں کو سبق کا مواد بناتا ہے۔ پہلے چند مہینے تعلیم بالکل زبانی دی جاتی ہے۔ کتابوں سے بچّوں کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ تعلیم گانوں، ڈراموں اور کہانیوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ جس دن بچّے کے ہاتھ میں کتاب دی جاتی ہے، وہ بڑی ہی خوشی کا دن ہوتا ہے۔ اس کتاب میں عمدہ عمدہ تصویروں کے علاوہ اکثر اُنھیں باتوں کا ذکر ہوتا ہے، جن سے بچّہ اپنے کھیلوں، کہانیوں اور ڈراموں میں شناسا ہو چکا ہے۔ برعکس اس کے ہمارے ہندوستانی بچّوں کے لیے کتاب وبالِ جان سے کم نہیں ہوتی۔ وہ ان کے لیے غیر دلچسپ ہوتی ہے اور جلدی ہی شروع بھی کرا دی جاتی ہے۔ بچّہ مشکلات کا متحمل نہیں ہو سکتا اور اپنی فطری چستی وچالاکی کو کھو بیٹھتا ہے اور وہ اسکول کی چار دیواری میں سست اور بے جان ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان باتوں کے پیشِ نظر ہم ابتدائی تعلیم کے پہلے سال کے لیے مندرجۂ ذیل پروگرام پیش کرتے ہیں۔ اس پروگرام کا تعلق صرف تدریس زبان سے ہے۔

پہلے تین چار مہینے مختلف مضامین پر بول چال ہو۔ بچّہ مختلف اشیا کے نام جانے اور اُنھیں فقروں میں استعمال کر سکے۔ روزمرّہ کے عمل و حرکت کے متعلق آسان الفاظ میں بامحاورہ گفتگو کر سکے۔ اُستاد بچّوں کو ایسی کہانیاں سُنائے، جن میں وہ دلچسپی رکھتے ہوں اُستاد

کہانی سُنا چکے، تو پھر طلبہ باری باری وہی کہانی اپنے الفاظ میں دہرائیں۔ اس کے بعد نفسِ مضمون پر بحث ہو، جس میں بچّوں کو اپنی رائے دینے کا موقع ملے۔

چھوٹی چھوٹی نظمیں جن میں بچپن کی زندگی کا ذکر ہو، بچّوں کو زبانی حفظ کرا دی جائیں؛ تاکہ وہ اُنھیں تنہا یا ایک دوسرے سے مل کر گا سکیں۔ موسیقی بچّے کی زندگی میں بہت اہمیت رکھتی ہے، اس لیے اس پر خاص توجہ دینی چاہیے۔

بچّوں کے دل میں ڈرامے کی بھی ایک قدرتی خواہش ہوتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ چھوٹی عمر میں ہی بچّے اپنے کھلونوں کے ساتھ مختلف قسم کے کھیل کھیلا کرتے ہیں۔ کبھی ان سے جنگ ہوتی ہے اور کبھی صلح۔ کبھی اُن سے خود روٹھ جاتے ہیں اور کبھی اُنھیں پیار سے مناتے ہیں۔ غرض کہ ڈرامہ کرنے کی خواہش ماں کی گود میں ہی ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہے، اسلیے اسے بھی تعلیم میں خاص جگہ دینی چاہیے۔

چار پانچ مہینوں کے بعد بچّے کو کتاب دینی چاہیے اور کتاب بھی ایسی، جو بچّے کے دل کو لبھانے والی ہو، یعنی اس میں اچھی اچھی تصویریں ہوں۔ عبارت سادہ ہو اور اس میں ان چیزوں کا ذکر ہو، جن سے بچّہ پہلے واقفیت حاصل کر چکا ہے۔ اس نوع کی تعلیم سے یقیناً زیادہ بہتر نتائج مترتب ہونگے۔ اُستاد کو تدریس میں راحت حاصل ہو گی۔ بچّوں کو زبان سیکھنے میں آسانی ہو گی اور ہماری ابتدائی درسگاہیں بہشت کا نمونہ بن جائیں گی۔

۵

تربیتِ اطفال

از

سردار موہن سنگھ ایم اے، ہیڈ ماسٹر خالصہ ہائی اسکول پٹیالہ

(گزشتہ سے پیوستہ)

قوّتِ متخیلہ اور عادات

بچّوں کو آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ آپ کی چھڑی ٹانگوں میں سے گزار کر، چھلانگیں لگا کر، گھوڑا دوڑا رہے ہیں یا چار پانچ بچّے ایک دوسرے کے پیچھے کھڑے ہیں، پچھلا اگلے کے، اگلا اس سے اگلے کے، غرض سب ایک دوسرے کے کندھے تھامے ہُوئے اور ریل گاڑی بنے ہُوئے ہیں۔ سب سے اگلا سیٹی بجاتا ہے اور پھر پھک پھک کرتا ہُوا دوڑنے لگتا ہے۔ وہ انجن ہے۔ ہم اور آپ ایسے گھوڑے کیوں نہیں دوڑا سکتے اور کیوں ہمیں ایسی کم خرچ ریل بنانے میں دقّت پیش آتی ہے؟ اس لیے کہ ہماری بڑھتی ہوئی ذہنی طاقت نے قوّتِ متخیلہ کو ماند کر دیا۔

بچّوں میں دماغی طاقت مقابلۃً کمزور ہوتی ہے۔ مگر قوتِ متخیلہ بہت تیز ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچّے کی چوٹ کا درد ایک پھونک سے دور ہو جاتا ہے اور چیونٹی اور اس کا گرا ہوا آٹا تلاش کرنے میں اس کی کلفت کافور ہو جاتی ہے۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ ماں باپ کو خدائی سے کم درجہ نہیں دیتا اور ان کی ہر بات پر یقین کر لیتا ہے۔

جب ماں کہتی ہے۔ ننھے، چوٹ لگی ہے تمھارے؟ کہاں؟ لاؤ، پھونک دوں۔ ایلو اچھے ہو گئے" تو درد سچ مچ دور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح انھیں چیونٹی اور اس کے آٹے کی کہانی پر کامل اعتقاد ہوتا ہے۔ چنانچہ جب ماں یا باپ بچّے سے کہتے ہیں کہ اگر تم نے فلاں کام کیا، تو ہم تمھارے ساتھ پیار نہیں کرینگے، تو بچّے کو اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں رہتی اور جہاں غلطی سرزد ہوتی ہے، ماں باپ کی ترک محبّت کا خیال بھی آنے لگتا ہے۔ اب باپ ہرگز پیار نہیں کریگا۔ بچّہ ذرا سی شرارت کرتا ہے اور باپ کی خفگی میں اپنے یقین کی تلقین پاتا ہے اور اگر اپنے من نے ڈھارس دی، تو پھر سے آزماتا ہے اور یہ دور جاری رہتا ہے۔ وہ سوچتا ہے۔ اب زندگی بے سود ہے۔ گو بعد کے سلوک سے اس یقین کا اثر کم ہو جائے، لیکن بالکل زائل کبھی نہیں ہوتا۔ جو بچے جھوٹ بولتے ہیں۔ چوری کرتے ہیں یا بُرے کام کرتے ہیں، اکثر ایسی غلط فہمیوں کا شکار ہوا کرتے ہیں۔ اب آپ خود خیال فرما سکتے ہیں کہ ایسی حالت میں ماں باپ پر کتنی بڑی ذمّے داری ہے اور ان کو کس قدر محتاط رہنا چاہیے۔

یہی اصول بچّوں کی اصلاح میں بھی کارآمد ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر سر سید احمد مرحوم کی بچپن کی زندگی کا ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔ آپ نے کسی نوکر سے گالیاں سیکھ لیں، مگر والد صاحب نے ایک دن پتہ پالیا اور فرمایا کہ گالیوں سے مُنہ سڑ اُٹھتا ہے۔ اگلے ہی روز جب عادت کے تقاضا سے گالی منہ سے نکلی، تو وہ ماں کے پاس بھاگے بھاگے گئے اور کہا کہ میرا منہ تو سونگھنا۔ بیگم صاحبہ کو تمام حقیقت معلوم تھی۔ فرمانے لگیں، کیا سونگھوں گالیوں کی بُو آ رہی ہے۔ اس کے بعد پھر کبھی کوئی گالی اس کے منہ سے نہ نکلی۔

ایک اور واقعہ بھی قابلِ بیان ہے۔ برمنگھم گرل اسکول کی اوّل معلمہ نے دیکھا کہ چھٹّی کے بعد ایک لڑکی ابھی تک اپنے کمرے میں اپنی نشست کے ساتھ لگی ہوئی کھڑی ہے۔

اُستانی صاحبہ نے پوچھا "تم گھر کیوں نہیں گییں" تو اُس نے جواب دیا کہ "میرا ہاتھ میز کے ساتھ پیوست ہے اور جُدا نہیں ہوتا"۔

اُستانی "کیوں"۔

لڑکی "آپ نے کہا تھا کہ تمھارا ہاتھ اب میز پر سے نہیں ہلے گا"۔

اصل بات یہ تھی کہ لڑکی نچلی نہ بیٹھتی تھی اور ہاتھ چلائے جاتی تھی۔ اس لیے تنگ آکر اُستانی صاحبہ نے یہ کہہ دیا تھا کہ ہاتھ اب ڈیسک کے ساتھ جُڑ جائیگا اور جب تک خود ہاتھ کو علیحدہ نہ کیا۔ لڑکی وہاں سے ہل نہ سکی۔

اب غور کا مقام ہے کہ اگر ماں باپ (یا اُستاد جو ماں باپ کا قائم مقام ہوتا ہے) سارا دن بچّے کو کوستے رہیں۔ "تو نالائق ہے"۔ "تو کبھی کوئی کام نہ کر سکے گا"۔ "تم کو کبھی ہوش نہ آئیگا"۔ "چل جھوٹا کہیں کا"۔ "کمبخت"۔ "شیطان"۔ تو بچّے سے یہی اُمید کی جا سکتی ہے کہ وہ نالائق، کم عقل، جھوٹا اور خبیث ہو۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ بچّے کو کوسا نہ جائے۔

اس مسئلہ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ چونکہ بچّے کی ذہنی طاقتیں ابھی خام ہوتی ہیں، اس لیے بچّوں سے یہ اُمید رکھنا عبث ہے کہ وہ غلطی نہیں کرینگے یا ایک دفعہ کے کہنے سے آئندہ محتاط رہیں گے، بلکہ یاد رہے کہ جو طرزِ عمل معمول ہو گیا ہے، یعنی جو عادت ہو گئی ہے، اُسے بدلنے کے لیے کافی مشق کی ضرورت ہوتی ہے اور بہت وقت درکار۔ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ بُری عادتوں کا جتنی جلدی ہو سکے، انسداد کیا جائے تاکہ بچّے کی آئندہ زندگی تلخ نہ ہونے پائے۔ بچّوں کی غلطیوں کو سہولت اور تحمّل سے دور کرنا چاہیے تاکہ اُنھیں یقین ہو جائے کہ باوجود غلطیوں کے ماں باپ کی شفقت میں فرق نہیں آتا۔ کیونکہ یہ شفقت اور محبّت اُن کی نشو و نما کے لیے ایک ضروری عنصر ہے۔ ننّھی عمر کے ہر

مرحلے پر وہ ماں باپ کی محبت اور مدد کے محتاج ہوتے ہیں۔ ان کا اخلاق ماں باپ کا بتایا ہوا راستہ ہوتا ہے اور ماں باپ کی زندگی، ان کی زندگی کا نمونہ۔

نیک والدین کے بُرے بچّے

کئی مرتبہ ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ ماں باپ تو برادری میں، اعزّا و اقارب میں نیک مشہور ہیں، مگر ان کی اولاد ناخلف ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ان اشخاص کی شہرت تو گو اچھی ہی ہوتی ہے اور بظاہر وہ بے عیب نظر آیا کرتے ہیں، مگر فی الحقیقت کوئی پوشیدہ کمزوری ان میں موجود ہوتی ہے۔ ظاہرداری ان عیوب کو لوگوں سے چھپائے رکھتی ہے مگر بچّوں سے نہیں چھپا سکتی۔ کیونکہ بچّے ماں باپ کو قابلِ تقلید پیشوا اور رہبر سمجھتے ہیں اور ان کی زندگی کو اپنی زندگی کا نمونہ بناتے ہیں، اس لیے عیبوں کو عیب نہ سمجھتے ہوئے ظاہر کر دیتے ہیں۔

بعض دفعہ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ نیکی اور بدی کا معیار ہمارے اپنے لیے کچھ اور ہے اور بچّوں کے لیے کچھ اور یعنی، خود جھوٹ بولیں، تو جائز اور بچّہ جھوٹ بولے، تو گنہگار۔ ایسی حالت میں اچھے بھلے بچّوں کو بُرا کہا جاتا ہے اور اُن کی زندگی تلخ کر دی جاتی ہے۔

عام طور پر ہم بچّوں کے نازک جذبات کا مطلق دھیان نہیں کرتے۔ مس کلیپز ازیو اپنی کتاب "مدرسہ بخوشی" (Willingly to School) میں ایک واقعہ یوں بیان کرتی ہیں۔

"ننھی آپا، میرا ایک کام تو کر دو۔ تم بڑی اچھی لڑکی ہو۔ یہ تمام ردّی کی ٹوکریاں خالی کر دو۔"

"ہو گیا۔ بہت خوب۔ اب ذری ایک جھاڑو نیچے سے لا دو۔"

"اب اس سامان پر سے گرد صاف کر دو۔"

"شکریہ۔ ذرا ایک کرا اُوپر سے لمبا برش اُٹھا لاؤ، تم بچّوں کے پاؤں نہیں تھکتے۔"

"شاباش۔ تو اب اس قالین کے اُس طرف کھڑی ہو جاؤ۔ میں مشین سے اس کو صاف کر لوں۔" "بڑی نیک بخت ہو تم، میرے تو بہت کام کرتی ہو۔"

"مجھے معلوم ہے، تم نے خالہ جان کے پاس جانا ہے۔ مگر لگے ہاتھوں اس گلدان کے لیے کچھ پھول بھی لا دو۔"

"خدا سلامت رکھّے۔"

"بس ایک کام اور ہے۔ مجھے معلوم ہے تمھیں جلدی ہے، مگر کھڑکی کے باہر گھڑونچہ ہے، اُسے دھو ہی ڈالو۔"

"کیا۔ تم نہیں کرو گی۔ اللہ! اللہ! کیا زمانہ ہے۔ کیسی گستاخ لڑکی ہے۔ کہتے کہتے چلدی۔ خدا جانے اب یہ نئی پود کیسی ہے۔ ان کو تو کوئی کام کہنا ہی گناہ ہو گیا۔"

اکثر دفعہ یہ فردِ جرم کہ بچّہ نالائق ہے۔ بہت ذرا ذرا سی غلطیوں کی بنا پر عاید کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ اوپر کی مثال سے بھی ظاہر ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ نیک والدین کے بچّے بد ہو ہی نہیں سکتے۔ ہو سکتے ہیں۔ اس کی وجہ والدین کی لاعلمی یا لاپرواہی ہوتی ہے۔ کیونکہ جیسا کہ اس مکتوب سے ظاہر ہے، بچّوں کی تربیت ایک بڑا ہی دقیق فن ہے، جسے حاصل کرنے کے لیے رہنمائی کی ضرورت ہے۔

علّامہ کلپیٹرک (Kilpatrick) اپنی کتاب Foundations of Method میں قانون تقلید کے علاوہ، دو اور مسئلے پیش کرتے ہیں، جو ہدیہ ناظرین ہیں :-

قانون دلبستگی (Law of Interest)

عادات کی بناوٹ میں دوسرا اصول جو کام کرتا ہے، اس کو قانون دلبستگی کہا جاتا ہے۔ جب بھی ہمارے دل میں کوئی کام کرنے یا کھیل کھیلنے کی خواہش ہوتی ہے علم النفس کی اصطلاح میں اس جذبہ کی پیدائش کو مستعد ہونا (Readiness) کہتے ہیں۔ جب کوئی بشر مستعد ہو، تو کامیابی اطمینان اور خوشی کا موجب ہوتی ہے اور ناکامیابی رنج کا باعث۔ جو فعل یا عمل کامیابی حاصل کرنے میں مددگار ہوا، وہ ذہن میں گڑ جاتا ہے اور مناسب موقع پر دہرایا جاتا ہے اور باقی افعال ترک کر دیے جاتے ہیں۔ غیر مستعد ہونے کی صورت میں کامیابی بھی تسلی بخش ثابت نہ ہوگی، اس لیے وہ حرکت یا عمل جس کی وجہ سے کامیابی ظہور میں آئی، ذہن نشین نہیں ہوگا اور کوئی قابلیت پیدا نہ ہوسکیگی۔

مثال کے طور پر بچے کے سامنے ایک شوخ رنگ کا کھلونا پڑا ہے۔ بچہ جو ابھی اپنے ہاتھوں اور بازوؤں پر قادر نہیں، انھیں طرح طرح سے حرکت دیگا، حتّٰی کہ ایک حرکت سے اس کے ہاتھ اس کھلونے تک پہنچ جائیں گے۔ دوسری مرتبہ جب وہ یا کوئی اور کھلونہ اس کے سامنے رکھا جائیگا، تو وہ اُسے صرف چند ایک حرکتوں کے بعد پکڑ لیگا۔ اسی قانون کے تحت میں کرکٹ کا کھلاڑی تھوڑی سی مشق کے بعد بلّے کو صرف اسی طرح سے ہی گھمائیگا، جس سے وُہ پہلے ہٹ لگانے میں کامیاب ہوا تھا۔

آپ نے سمجھ لیا ہے کہ عادت پیدا کرنے کے لیے کسی عمل کو بار بار دہرانا تو لازمی ہے، مگر دہرایا وہی عمل جائیگا، جس کے کرنے سے راحت ہوتی ہو اور راحت اُس فعل کی کامیابی پر منحصر ہے، جس کے لیے دل میں شوق بھی ہو۔ اس لیے ظاہر ہے کہ عادت بنانے

کی پہلی منزل مستعد ہونا ہے۔ جب تک بچّوں کے دل میں کسی کام کے کرنے کی خواہش نہ ہوگی، وہ کامیابی کے لیے کوئی عمل نہ کرینگے اور اگر کچھ کریں گے، تو اُس سے لطف نہ اُٹھا سکیں گے۔ دوسرے الفاظ میں مجبوری اور شوق دو متضاد چیزیں ہیں اور شوق جبر سے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ بچّوں کو کھیل کا قدرتی طور پر شوق ہوتا ہے، اس لیے لائق ماں باپ (یا اُستاد) نیک عادات کی بنیاد کھیل پر رکھتے ہیں۔ کھیل کا مسئلہ چونکہ بجائے خود بہت وسیع و عمیق ہے، اس لیے اس کو کسی آئندہ اشاعت میں پیش کیا جائیگا۔

خوف و سزا

یہاں یہ ذکر کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بچّوں کو ڈرا دھمکا کر منع کیا جا سکتا ہے۔ مگر دلبستگی نہیں پیدا کی جا سکتی۔ جیل خانہ جرم یا گناہ کے راستہ میں ایک رکاوٹ ہو سکتا ہے، لیکن نیکی کا احساس پیدا کرنے کا سامان نہیں ہو سکتا۔ اگر اس اصول کو مدّنظر رکھا جائے، تو ہمارے گھروں اور ابتدائی اسکولوں میں سزا و خوف کو دور کیا جا سکتا ہے۔ اکثر شکایت آیا کرتی ہے کہ چھوٹی عمر میں تو میرا بچّہ بہت فرمانبردار تھا۔ مگر اب بڑا بے ادب اور گستاخ ہو گیا ہے۔ جن بچّوں کی پرورش خوف و دہشت کے ماحول میں ہوئی ہو، جب وہ بڑے ہوتے ہیں، تو رفتہ رفتہ ایک ایسا دن بھی آتا ہے کہ باپ کے ڈیل ڈول، قد و قامت اور جسمانی بڑائی کا رعب ان پر قائم نہیں رہتا۔ گویا ڈر جس نے باقی جذبات کو ایک گونہ دبا رکھا تھا، جاتا رہا اور وُہ احساسات جو موجود تو تھے، مگر مخفی تھے، ظاہر ہونے لگے۔ برخلاف اس کے اگر شروع سے ہی ایسی تربیت دی جاتی کہ ڈر کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی، تو نتیجہ اس کے برعکس نکلتا۔

١٢

والدین کی اُمیدیں

اسی زمرے میں ایسے کام آتے ہیں، جن کو بچے کے نازک اعضا کر نہیں سکتے یا ان کا ناپختہ فہم ان کو سمجھ نہیں سکتا، یعنی ایسے کام جو بلحاظ طاقت یا بلحاظ فنتان کی دسترس سے باہر ہوں۔ مثلاً ہمارے بچے نے چالیس ورق کے ایک مضمون کا تین صفحوں میں خلاصہ بنالیا۔ یہ اس کی عمر کے لحاظ سے یقیناً قابلِ قدر تھا۔ اب ہمیں یہ شوق بھی چرایا کہ وہ اس مضمون کو تین سو طلبہ کے مجمع میں پڑھ کر سنائے، مگر وہاں کے شور و غل کو گیارہ سالہ بچے کی ننھی آواز دبا نہ سکی۔ بچے کو ناکامی ہوئی۔ باپ نے اُسے ڈانٹ بھی پلادی۔ شروع شروع میں ایسی ڈانٹ تو ہمتوں کو پست کر دیتی ہے۔ اس کی ہمت خدا جانے اُسے اب سٹیج پر کب لائے۔

ڈاکٹر بیلرڈ (Dr. Ballard) اپنی کتاب "تعلیم حساب کے لازمی مسائل" (Essentials in the Teaching of Arithmetic) میں اپنی ننھی بچی کا ذکر کرتے ہوئے یوں فرماتے ہیں کہ جب بروفن پورے تین سال کی ہوئی، تو میں نے کوشش کی کہ اس کو تین کا تصوّر دلاؤں۔ بچی کو تین ریچھوں کی کہانی آتی تھی۔ وہ ایک دو تین بھی کہہ لیتی تھی۔ مگر جب تین پیسے اس کے ہاتھ میں دے کر پوچھا جاتا کہ تمھارے ہاتھ میں کتنے پیسے ہیں، تو وہ بتا نہ سکتی تھی۔ میں ایک گھنٹے کی کوشش کے باوجود ناکامیاب رہا۔ صرف یہی نہیں، بلکہ اُس کی قدرتی بالیدگی کو پیچھے مادکا دھکا لگ گیا۔" اس ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ ریاضی کے مسئے کی سمجھ ایک خاص درجے تک دماغی نشوونما پر منحصر ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب مخل نہ ہوتے، تو شاید ایک ہفتے میں وہ لڑکی اس مرحلے کو طے کر لیتی۔ مگر جبر سے بجائے فائدے کے نقصان ہوا۔

۱۴

کامیابی کی لذّت

جو فعل بھی کیا جاتا ہے، وہ یا تو اپنی خواہش سے ہوتا ہے یا کسی کے کہنے سننے سے۔ اگر بچہ کسی فعل کے لیے خود مستعد ہو اور اس میں کامیاب ہو جائے، تو اس کو اپنی کامیابی میں ایک خاص لذت حاصل ہوتی ہے۔ اس سے اس کی ہمّت بھی بڑھتی ہے۔ وہ اپنی زندگی کو پُرمعنی پاتا ہے اور اپنی خوشی کے لیے دوسروں کا دست نگر نہیں ہونا چاہتا۔ ساتھ ہی ایک کامیابی دوسری کامیابی کے لیے زینہ بن جاتی ہے اور بچپن کی کامیابی آنے والی زندگی کی کامیابی کی بنیاد بن جاتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اوائل عمر میں بچّے کو اپنے ہمجولیوں میں کھیل کود کے بہت سے موقع ملتے رہیں اور ان میں کامیابی حاصل کرنے کے کافی ذرائع موجود ہوں۔ برعکس اس کے کئی ایک ایسے عمل ہوتے ہیں، جو بچّے کے لیے کچھ معنی نہیں رکھتے۔ مگر لواحقین سے خراجِ تحسین حاصل کرتے ہیں۔ مثلاً ایک بچّہ بڑے صاحب کی نقل توتلی زبان میں کرتا تھا۔ بات بیہودہ تھی۔ مگر یار دوست اس پر بہت خوش ہوتے تھے۔ اس لیے بچّے کو یہ عمل دن میں کئی بار کرنا پڑتا تھا۔ اس سے دو نقصانات کا اندیشہ ہے۔ اوّل یہ کہ بچّہ دوسروں کی رائے کو اپنے جذبات پر ترجیح دینے لگ جاتا ہے۔ گویا اپنے فعل کے اچھے بُرے ہونے کا معیار دوسروں کی ستائش یا خوشنودی کو ٹھیراتا ہے۔ دوم خود اس کو کسی کام کے کرنے کا شوق پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ہر دو مشکلات آئندہ زندگی میں کامیابی کی سدِّ راہ ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ جو جو بھی فرائض زندگی ہیں، وہ مشکل بھی ہیں، یعنی ان کو سرانجام دینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان بہت مستعد ہو۔ لیکن ان کو سرانجام دینے کے بعد بھی لوگ ہمیشہ خوش نہیں ہوا کرتے۔ جو لوگ بیرونی تشفّی کے عادی ہو جاتے ہیں، ان کے لیے ایسے فرائض کا ادا کرنا نہایت دشوار

ہو جاتا ہے۔

خوش قسمتی سے بچے ہر کام کرنے میں قدرتی طور پر پیش قدمی کرتے ہیں۔ لڑکے ماں باپ کی تقلید کرتے ہوئے، کھیل کھیل میں لکھنا، پڑھنا، کچہری کرنا، گھوڑا دوڑانا، ہل چلانا، گھر بنانا اور لڑکیاں روٹی پکانا، کپڑے سینا، بچوں کو نہلانا، کپڑے پہنانا غرض کہ بیشمار کام، جو وہ اوروں کو کرتے دیکھتے ہیں، وہ خود کرنے کا اقدام کرتے ہیں۔ ماں باپ یا دایہ کا فرض ہے کہ بچے کو اُس کے کاموں میں کامیابی حاصل کرنے میں مدد دیں۔ خود ان کاموں کو سرانجام دیکر بچے کو لطفِ کامیابی سے محروم نہ رکھیں اور اس قدر لاپروا بھی نہ ہوں کہ بچے کی ہمت اور قابلیت سے زیادہ مشکلات اس کو ناکامیاب بنا دیں۔

تربیت کا مقصد یہ ہے کہ بچہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے اور دوسرے کے سہارے کا دست نگر نہ رہے۔ لائق ماں ہمیشہ یہ نظریہ بچے کے سامنے رکھتی ہے کہ تو اب بڑا ہو چلا ہے۔ اب تو اپنا منہ خود دھو سکتا ہے۔ جب بچے کی خواہش ہو، تو اس کو اپنے کپڑے خود پہننے دیتی ہے۔ جب وہ اپنی بڑھتی ہوئی قابلیت پر اتراتا ہے، تو خوش ہوتی ہے۔ جب ایک گھنٹہ صرف کرکے اُس نے اپنے بوٹ کے تسمے خود باندھ لیے، تو اُس کی خوشی اور فخر کا اظہار سُننے کے لیے وہ اپنا کام چھوڑ دیتی ہے۔ اگلی دفعہ اس کو عذار بند میں خود گانٹھ لگانے دیتی ہے۔ باپ بچے کو فوٹو اُتارنے کا کیمرہ لے دیتا ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد اُس کو فلم لگانا اور اُتارنا آجاتا ہے۔ ہم کو ایک بچے کی بابت معلوم ہے، جو دس برس کی عمر میں فلم کو خود ہی لگاتا تھا، اور خود ہی اس کا عکس کاغذ پر بھی اُتار لیتا تھا۔ اب اُس نے مختلف تصویریں اکٹھی کر کے ایک اچھی خاصی فوٹوگرافی کی کتاب بنالی ہے۔

اگر مندرجہ بالا اصول پر عمل کیا جائے؛ تو نہ صرف بچے کی تربیت تسلی بخش ہو گی، بلکہ

زندگی میں وُہ اپنے دل بہلاوے کے لیے دوسروں کا محتاج نہ ہوگا ، بلکہ کامیاب زندگی بسر کرتا ہوا، دوسرے کے لیے قابلِ رشک مثال چھوڑ جائیگا۔

افادے کے طور پر نیک عادات کی تربیت کے دس اصول ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

نیک عادات کی تربیت کے دس اصول[۱]

(۱) اگر آپ کو اپنے بچّے میں کوئی ایسی عادت نظر آئے ، جو موجبِ اطمینان نہ ہو، یا اُس کا وجود باعثِ حیرت ہو ، تو یہ سمجھ لینا ، کہ یہ عادت خود بخود اصلاح پذیر ہو جائیگی ، ایسی غلطی ہے ، جو سہل انگار ماں باپ سے اکثر سرزد ہوتی ہے اور اس سہل انگاری سے تکالیف کا سامنا ہوتا ہے ۔

(۲) اگر بچّے کا کوئی فعل آپ کو پسند نہیں یا اس کی بات پر آپ کو تشویش پیدا ہوتی ہے، تو اُس کے یہ معنی ہیں کہ آپ بچّے کے دلی منشا کو نہیں سمجھے ۔

(۳) یقیناً بچّوں کی تربیت کا پہلا مرحلہ اُن کے دلی جذبات کا سمجھنا ہے ۔ دوسرا درجہ یہ کہ ماں باپ بچّوں کی تربیت کے بارے میں ہم خیال ہوں اور آخری یہ کہ ماں باپ بچّوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا کریں کہ ہم (بچّے) قابلِ اعتماد ہیں اور ماں باپ ہماری دقّتوں میں امداد دیکر سہولیت پیدا کریں گے ۔

(۴) بچّوں کے نقص یا عیب ان کے سامنے بیان کیے جائیں ۔ ان کی خوبیوں کی واجب تعریف یا کم از کم قدر کی جائے ۔

(۵) بچّے کی کوئی ناپسندیدہ عادت یا حرکت آپ کے مشاہدے میں آئے ، تو اُس کی اصلاح کو کسی مناسب موقع کے لیے ملتوی کر دینا چاہیے ، تاکہ اسباب مرض اور

---

[۱] ماخوذ از نیو ایرا

بچے کی طبیعت کے موافق طریقۂ علاج سوچنے کا وقفہ مل جائے۔

(٦) کبھی کبھی اس فیصلے کی ضرورت ہو جاتی ہے کہ آپ بچّے کی کسی حرکت سے جو عام طور سے جائز سمجھی جاتی ہے، صرف اسی واسطے تو ناراض نہیں کہ وُہ حرکت کسی غیر شخص کے رُوبرو ظہور میں آئی اور یہ ہو بھی ایسی، جس کی وجہ سے آپ کے طریقۂ تربیت پر نکتہ چینی ہونے کا امکان ہو۔

(٧) منع کرنے سے بیشتر غور کرو کہ جس فعل یا حرکت سے آپ تنگ دل ہو رہے ہیں، وہ کسی ایسی مخفی خوبی کا پیش خیمہ تو نہیں، جو آئندہ ظاہر ہو کر آپ کے لیے موجب فخر ہو۔ مثلاً مشہور سائنسدان ہر ایک چیز کو چھیڑنے اور دیکھنے کے عادی ہُوئے ہیں۔ مشہور فلسفی اور حکما شروع سے ہی ضدّی اور خودسر ہوتے آئے ہیں اور کسی بات کو نہیں مانا کرتے، بلکہ اپنی مشکلات کا حل خود آپ کیا کرتے ہیں۔

(٨) بچّے کی جو باتیں کل آپ کی خفگی کا موجب ہوں، اُن کی اجازت آج ہی نہ دیں۔ مثلاً آپ یا آپ کے دوست بچّے کے مُنہ سے گستاخی کا لفظ سُن کر مسکراتے ہیں، کیونکہ یہ بات شوخی میں داخل سمجھی جاتی ہے۔ لیکن یہ گستاخی کا لفظ چھے برس کی عمر میں آپ کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جاتا ہے۔ اس لیے عاقبت اندیشی لازمی ہے ؎ سرچشمہ باید گرفتن بمیل

(٩) یاد رکھو کہ تربیت درجے بدرجے ہوتی ہے۔ عمر کے ہر دور کے لحاظ سے مناسب عادات سیکھنا ضروری ہیں۔

(١٠) بچّے کی تربیت کا مطلب یہ ہے کہ وُہ کامل انسان بن جائے اور دوسروں کی مدد کا دست نگر نہ رہے۔ اس لیے بچّے کی واجب رہنمائی کی جانا چاہیے۔ کیونکہ بغیر رہنما کے گمراہ ... ضرورت سے زیادہ امداد سے بچّے کو دوسروں کا محتاج بننے کا اندیشہ لاحق

پنجاب کے اسکولوں میں تدریسِ جغرافیہ

از

بشنداس ایم اے، بی ٹی

(گزشتہ سے پیوستہ)

استاد | جغرافیے کے استاد کے لیے ضروری ہے کہ اپنے مضمون پر پوری طرح سے حاوی ہو۔ اس کا فرض ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی علمیت بڑھانے میں مصروف رہے۔ جغرافیہ ایسا مضمون ہے، جو آپ سے زمانۂ حال تک کامل واقفیت کا مطالبہ کرتا ہے۔ آج سے تین چار برس پہلے کی لکھی [illegible] کے لیے کافی نہیں۔ کتاب کی کمی کو پورا کرنا معلّم کا کام ہے اور یہ کام وہی معلّم کر سکتا ہے، جسے خود مطالعے کا شوق ہو۔ اخبارات کا مطالعہ اس کے لیے خاص طور پر ضروری ہے۔ اخبارات یا رسائل میں کئی دفعہ جغرافیائی امور کے متعلق مفید خبریں اور مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں معلّم کو چاہیے کہ ان مضامین سے پورا پورا استفادہ کرے ۔ طبعی اور اقتصادی جغرافیے کا مطالعہ بھی لازمی ہے۔ میرا یہ تجربہ ہے کہ خواہ آپ معمولی سے معمولی کتاب ہی کیوں نہ پڑھیں، آپ کو کوئی نہ کوئی نئی بات ضرور معلوم ہو جاتی ہے اور آپ اس سے اپنے سبق کو زیادہ وضاحت سے بیان کر سکتے ہیں بعض معلّم صرف درسی کتب کا مطالعہ ہی کافی سمجھتے ہیں۔ یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ معلّم کے پاس معلومات کا ایک وسیع خزانہ ہونا چاہیے، تاکہ وہ اپنے شاگردوں کو اُن کی ضروریات کے موافق اچھی اچھی باتیں ترتیب کے ساتھ بتاتا رہے۔ اگر اس کے اپنے خزانے ہی میں کمی ہے، تو وہ ان میں سے مناسب انتخاب کس طرح

کریگا۔ اگر ہو سکے، تو بعض جغرافیائی امور کے تاریخی حالات کا مطالعہ بھی کیا جائے۔ اس بارے میں مجھے پنجاب کی انہار ثلاثہ کی سکیم کا خاص طور سے ذکر کرنا ہے۔ طلبہ کا تو کہنا ہی کیا، میں نے کئی مدرس ایسے دیکھے ہیں اور مدرس بھی اُونچے درجوں کے، جو یہ سمجھتے ہیں کہ اس اسکیم سے دریائے جہلم کا پانی دریائے راوی میں گرایا جاتا ہے۔ اگر وُہ پنجاب کے ذرائع آبپاشی کی تاریخ کا مطالعہ کریں، تو یہ غلطی ان پر واضح ہو جائیگی۔ نقشہ جات میں ان تینوں نہروں کو لال سیاہی سے دکھا کر یہ بات طلبہ کو ذہن نشین کرائی جاسکتی ہے کہ دریائے جہلم کا پانی ضلع لائل پور کو سیراب کرنے والی نہر لوئر چناب میں ڈالا جاتا ہے اور دریائے چناب کا پانی دریائے راوی تک لایا جاتا ہے۔ بعض تاریخی حالات طلبہ میں اس مضمون کے لیے زیادہ شوق پیدا کرنے کا باعث بھی بنتے ہیں۔ ہائی کلاسوں کے طلبہ جب تاریخ انگلستان پڑھتے ہیں، تو اُنھیں بتانا چاہیے کہ یورپ کی جنگ کریمیا (۵۶-۱۸۵۴ء) کا اثر یہ ہوا تھا کہ اہلِ روس نے دوسرے ممالک کو Hemp بھیجنا بند کر دی۔ اب اہلِ انگلستان ایسی چیز کی تلاش کرنے لگے، جو Hemp کے بجائے استعمال ہو سکے۔ بنگال میں پٹ سن یہ کام دے سکتی تھی۔ بس پھر کیا تھا، اس کی کاشت کی طرف توجہ ہوئی اور بنگال میں یہ صنعت ترقی کرنے لگی۔ اسی طرح امریکہ میں ۱۸۶۱ء کی خانہ جنگی کے سلسلے میں ہندوستان میں کپاس کی صنعت کا ذکر کر سکتے ہیں۔ مانچسٹر اور لورپول میں پہلے کپاس امریکہ سے ہی آتی تھی۔ اس خانہ جنگی کی وجہ سے کپاس کی درآمد بند ہو گئی اور انگریزوں نے ہندوستان سے کپاس خریدنی شروع کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلدی ہی کپاس کی قیمت بہت بڑھ گئی۔ ہندوستان میں کپاس کی کاشت بھی زیادہ ہو گئی۔ خانہ جنگی کے بعد جب پھر امریکہ کی کپاس انگلستان جانے لگی، تو ہندوستان میں کپاس زائد نظر آنے لگی۔ اس طرح ہندوستان میں سوتی کپڑے کے کارخانے قائم ہو گئے اور پھر ان کارخانوں کی تعداد سال بسال

بڑھتی گئی۔ یہ ایسی باتیں ہیں، جو اعلیٰ جماعتوں کے طالب علم شوق سے سُنتے ہیں اور یاد رکھتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ان باتوں کی طرف کوئی توجہ نہیں جاتی۔ ایک دفعہ ایک طالب علم نے امتحان کے موقع پر بنگال کی پیداوار کے سلسلے میں مندرجہ بالا کہانی پرچے میں لکھ دی، تو ممتحن صاحب نے اپنی رپورٹ میں الٹا یہ لکھ دیا کہ یہ بات غلط ہے۔ چہ خوب! ممتحن اگر خود کسی بات کو نہ جانتے ہوں، تو اُس کی وجہ سے چند قابل طالب علم ضرور خسارے میں رہتے ہیں۔

معلّم یہ سب باتیں مطالعے سے ہی معلوم کر سکتا ہے۔ اسکولوں میں معلّم کے مطالعے کے لیے کافی کتابیں ہونی چاہییں۔ جغرافیہ طبعی کے علاوہ ملکی جغرافیہ کا مفصّل حال جاننا بھی ضروری ہے۔ ضلع کا Gazetteer ہر ایک اسکول میں ہونا لازمی ہے۔ بہت دفعہ دیکھا گیا ہے کہ طالب علم دُور دُور کے علاقوں کا حال تو جانتا ہے، لیکن اپنے ضلعے کا حال اُسے معلوم نہیں ہوتا۔ اس لیے مدرس کا فرض ہے کہ وُہ اپنے ضلع کا مفصّل حال ضرور پڑھے اور دورانِ تعلیم میں اپنے ضلع کا دوسرے اضلاع یا صوبجات سے مقابلہ کرے۔

مطالعہ کے علاوہ مدرس کے لیے ضروری ہے کہ جب موقع ملے، مختلف علاقوں کی سیر کرے۔ کم از کم سمندر، بندرگاہ، درہ اور کان ہر معلّم خود دیکھے، تاکہ ان چیزوں کا صحیح تصوّر اس کے دل میں پیدا ہو جائے۔ جب تک مدرّس کو صحیح طور پر ان کا تصوّر نہیں ہوگا۔ وہ طلبہ کو نہیں سمجھا سکے گا کہ درّہ کیا ہے یا کان کسے کہتے ہیں۔ اگر زیادہ نہیں، تو جغرافیے کے معلّم کی نظر سے پنجاب کا چپّہ چپّہ ضرور ہی گزر جانا چاہیے۔ اس کے بعد اگر موقع ملے، تو ہندوستان کے بعض حصّوں کی بھی سیر کرے۔

اپنے مضمون میں مہارت حاصل کرنے کے علاوہ مدرّس کو ریاضی، علم طبعیات، تواریخ، سیاسیات وغیرہم علوم میں بھی دسترس حاصل کرنی چاہیے۔ اگرچہ یہ ایک بڑی بات ہے،

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان علوم میں دسترس حاصل کیے بغیر معلّم، مُتعلّم کے کئی سوالات کا جواب دینے سے گریز کرتا ہے اور متعلّم کے حق میں یہ بات بہت مضر ہوتی ہے۔

نقشہ بینی و نقشہ کشی جغرافیے کی تعلیم کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ معلم کے بیان میں زور اور اثر ہو۔ بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ ادھر معلّم پڑھا کر فارغ ہُوا، اُدھر طالب علم سبق کا بہت سا حصّہ بھول گئے۔ موثر بیان کی خوبی یہ ہے کہ طلبہ سبق کے وقت ہمہ تن گوش ہو کر معلّم کی بات کو سُنیں۔ اس طرح سے کان پڑی ہُوئی آواز ذہن پر نقش ہو جاتی ہے اور محو نہیں ہوتی۔ اب واقعات اور حالات کو خوبی سے بیان کرنے کے لیے الفاظ ہی کافی نہیں، بلکہ ان کے ساتھ نقشوں، شکلوں اور تصویروں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی ملک کے باشندوں کی عادتیں اور ان کے رہنے سہنے کے طریقے ہم الفاظ سے بیان تو کر سکتے ہیں، لیکن یہ چیزیں طلبہ کے ذہن نشین جبھی ہونگی کہ ہم اُنھیں ان کی تصویریں بھی دکھائیں۔ بعض باتیں مثلاً کسی جگہ کی بلندی یا سمندر کی گہرائی بتانے کے لیے نقشے کی اشد ضرورت ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ معلّم خواہ کتنا ہی اچھی طرح سبق تیار کرے اور سبق کو کیسی ہی اچھی ترتیب سے پڑھائے، جب تک وہ شکلوں اور نقشوں کا استعمال نہیں کرتا سبق کو کامیاب نہیں بنا سکتا۔

نقشے کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ زمین ایک کرہ ہے اور اس کا نقشہ چپٹی سطح پر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا نقشہ درست نہیں بن سکتا۔ اگر کسی برِّ اعظم کی شکل صحیح بتائی جائے، تو رقبے میں کمی بیشی ہو جاتی ہے اور اگر رقبے کی درستی مدِّ نظر رکھی جائے، تو خطوطِ عرض بلد و طول بلد کو چھوٹا بڑا کرنا پڑیگا اور اس لیے سمتیں اور شکل درست نہیں رہیگی۔ معلّم کا فرض ہے کہ وہ خود اس اصول کو اچھی طرح سمجھ لے۔ مرکیٹر پروجیکشن (Mercator's Projection) کے نقشے اگرچہ سمت کا تصوّر صحیح دیتے ہیں، لیکن وہ رقبے اور شکل وغیرہ کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ غلطی

مدت تک طلبہ کے دماغ سے نہیں نکلتی۔اس لیے جب تک طلبہ کو اس اصول کا پتہ نہ ہو، ایسے نقشے ان کے سامنے کبھی نہ رکھنے چاہییں۔چھوٹے چھوٹے صوبوں یا ملکوں کے لیے مخروطی پروجیکشن مناسب ہوتے ہیں۔جان بارتھولومیو کی آکسفورڈ سکول اٹلس میں انگلستان، پنجاب، برما وغیرہ کے نقشے اسی پروجیکشن سے بنے ہوے ہیں۔ان میں شکل اور رقبہ بہت حد تک درست رہ سکتا ہے،لیکن اگر کسی بڑے قطعۂ زمین کا نقشہ بنانا مطلوب ہو، تو یہ پروجیکشن درست نہیں رہتا۔

نقشہ بینی میں دوسری بات سطح کا دیکھنا ہے۔سطح کا صحیح تصور دینے کے لیے بعض نقشوں پر مختلف رنگ دیے جاتے ہیں یا کنٹور کھینچے ہوتے ہیں۔مختلف بلندیوں کو ظاہر کرنے کے لیے بھورے رنگ کے کئی درجے استعمال کیے جاتے ہیں اور گہرائی ظاہر کرنے کے لیے نیلے رنگ کے مختلف عکس دکھائے جاتے ہیں۔جتنی گہرائی زیادہ ہوتی ہے، اتنا ہی وہاں نیلا رنگ گہرا ہوتا ہے اور اسی طرح اونچائی کی زیادتی کے ساتھ بھورا رنگ گہرا ہوتا جاتا ہے۔یاد رہے کہ مختلف نقشوں میں بلندی دکھانے کے لیے رنگ کے مختلف درجے ہوتے ہیں، اس لیے نقشے کے انڈکس کی مدد سے مطالعہ کرنا چاہیے۔بعض جگہ سطح کا تصور دینے کے لیے **Relief models** بھی استعمال ہوتے ہیں،لیکن ایک تو یہ بہت مہنگے ہوتے ہیں اور ہر اسکول انھیں خریدنے کی بساط نہیں رکھتا۔دوسرے ان میں بلندی بالکل صحیح نسبت سے نہیں دکھائی جاسکتی۔اس لیے میرے خیال میں ان کا ہونا بہت ضروری نہیں۔اگر ہو سکے، تو چکنی مٹی سے اس قسم کا ایک ماڈل بنواکر رکھ لینا چاہیے۔

زمین کی شکل دکھلانے کے لیے اور اس کا دیگر اجسام فلکی کے ساتھ تعلق ظاہر کرنے کے لیے گلوب نہایت ضروری چیز ہے۔شروع شروع میں برّاعظموں کا تصوّر دینے کے لیے

بھی گلوب کا استعمال بہت مفید ہے۔گلوب کا برمحل استعمال سبق کو بہت مؤثر اور دلچسپ بنا دیتا ہے۔ دیواروں پر لٹکانے والے نقشے تو ہر اسکول میں ہوتے ہیں۔ اپنے ضلع کا نقشہ رکھنا ہر اسکول کے لیے ضروری ہے۔اس کے علاوہ تحصیل، تھانہ، قصبہ یا گاؤں کا نقشہ خاص طور پر بنوا کر سکول میں آویزاں کیا جائے۔یہ نقشے مختلف سکیل کے مطابق بنوا کر رکھے جائیں، تو اور بھی اچھا ہے۔اس سے طلبہ کو سکیل کا تصوّر ہوتا جائیگا۔یہ نقشے صرف دوسری تیسری جماعت کے لیے ہی مفید نہیں، بلکہ اُوپر کے درجوں میں ان کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے۔

دیواروں پر لٹکانے والے نقشوں سے زیادہ مفید وہ نقشے ہیں، جو اٹلس کی شکل میں طلبہ کے پاس ہوتے ہیں۔معلّم کو ہر بات طلبہ کو نہیں بتا دینی چاہیے، بلکہ ان سے زیادہ سے زیادہ باتیں اخذ کروانی چاہییں۔نقشہ دیکھ کر طالب علم سطح، آب و ہوا، شہر، ذرائع آمدورفت، وغیرہ خود ہی معلوم کر سکتے ہیں یا معلّم ان باتوں کے معلوم کرنے میں طلبہ کی دستگیری کر سکتا ہے۔ پہاڑوں، دریاؤں، جھیلوں کا نام، ان کی بلندی یا لمبائی اور سمت لڑکے خود ہی بتا سکتے ہیں۔ اس لیے ہر ایک لڑکے کے پاس ایک اچھی اٹلس کا ہونا نہایت ضروری ہے۔انگریزی میں Bartholomew کی آکسفورڈ اٹلس کافی موزوں ہے۔مَیں اُردو میں کسی اچھی اٹلس کا نام فی الحال نہیں بتا سکتا۔جو اٹلسیں میری نظر سے گزری ہیں، ان میں رنگ بہت بھدّی طرح سے بھرے گئے ہیں۔ضرورت ہے کہ پبلشرز پنجاب کے اسکولوں کی ضروریات کے موافق اچھے اور شوخ رنگوں میں اٹلسیں بنوائیں۔

ہر اٹلس میں کم از کم دو طرح کے نقشے ہونے چاہییں۔ایک نقشے میں ایک خاص ملک کی سطح وغیرہ دکھائی گئی ہو، اور دوسرا نقشہ پولیٹکل اور اقتصادی حالت ظاہر کرتا ہو۔ اٹلسوں

کے بغیر طالب علموں کو بار بار دیوار کے نقشے کے پاس آنا پڑیگا اور وقت ضائع ہوگا۔ ضبط بھی خراب ہوگا اور مدرس کو بہت سی باتیں خود بتانی پڑینگی۔ یہ بات اصولِ تعلیم کے خلاف ہے۔ مدرّس کا فرض ہے کہ وُہ طلبہ کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سکھائے۔ جغرافیے کے سبق میں طلبہ کے پاس اٹلس کا ہونا اِس بارے میں بہت مدد دیتا ہے۔ دیواری نقشہ مدد کے طور پر استعمال کیا جائے۔ اٹلس میں دی ہُوئی باتیں دیوار پر نقشے کو پڑھنے اور دیکھنے سے زیادہ واضح ہو جاتی ہیں۔ اِس لیے اگر یہ نقشے اٹلس کے نقشوں کی نقل ہوں، تو اور بھی اچھا ہے۔ ان کے بغیر اگر کچھ اور باتیں نقشے پر دکھانی مقصود ہوں، تو سلائڈز (Slides) وغیرہ کے ذریعے دکھائی جا سکتی ہیں۔

کبھی کبھی نقشہ بینی کا ایک اور طریقہ بھی بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ ایک طالب علم کو بلاؤ اور اُسے کوئی خاص مقام نقشے پر دکھانے کے لیے کہو۔ پھر کسی اور طالب علم کو کوئی اور مقام دکھانے کے لیے کہو۔ اس طرح باری باری سب لڑکوں کو موقع دو۔ پہلے پہل طلبہ جلدی جلدی ایسا نہ کر سکیں گے لیکن باقاعدہ مشق سے وہ فوراً بتا سکیں گے کہ فلاں جگہ کہاں ہے اور اس کے اندر خود اعتمادی کا احساس پیدا ہو جائیگا۔ یہ احساس تعلیم کے لیے نہایت ضروری شے ہے۔ نقشہ میپ سٹینڈ سے لٹکایا جائے اور اس کے استعمال میں احتیاط برتی جائے، تاکہ جلدی پھٹ نہ جائے۔

نقشہ بینی کے بعد نقشہ کشی کا ذکر بھی ضروری ہے۔ پنجاب کے اسکولوں میں تو اُس کی طرف بہت زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ معلّم عام طور سے سالانہ معائنے کے وقت انسپکٹر صاحب کو دکھانے کے لیے نقشے بنوا لیتے ہیں۔ یہ ذہنیت جغرافیے کی تعلیم کے ناقص ہونے کی بہت حد تک ذمّے دار ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، نقشہ کشی پہلی یا دوسری جماعت میں ہی شروع کر دی جائے۔ یورپین اور امریکن اسکولوں میں بعض اوقات پہلی جماعت میں ہی مختلف

شکلیں کھینچنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ طلبہ اپنے کمرے کا خاکہ کھینچتے ہیں اور سلیٹ یا کاغذ پر کافی اچھی مستطیل سی بنا لیتے ہیں اور اس میں کرسی، میز وغیرہ کا مقام دکھا دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد گاؤں کا نقشہ بنوایا جائے جس میں اپنا گھر، نمبردار کا گھر، کنواں وغیرہ دکھائے جائیں جس وقت صوبہ اور ہندوستان کا حال پڑھایا جائے، تو ضرورت کے موافق نقشے بنوا لیے جائیں۔ نقشہ کشی سبق کے دوران میں ہی ہونی چاہیے۔ معلّم مقامات کو تختۂ سیاہ پر دکھاتا جائے اور طلبہ اپنے خاکوں کو پُر کرتے جائیں۔ عام طور سے مدرسین طلبہ کو گھر پر ہی نقشے بنانے کے لیے کہہ دیتے ہیں اور طلبہ اٹلسوں وغیرہ سے نقل کر کے نقشہ بنا لیتے ہیں۔ تجربے سے یہ بات ظاہر ہوئی ہے کہ یہ طریقہ بالکل نکمّا ہے امتحان کے موقع پر جو نقشے طلبہ بناتے ہیں، بہت حوصلہ شکن ہوتے ہیں۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ سالہا سال کی محنت کے بعد طلبہ پنجاب کا نقشہ صحیح نہیں بنا سکتے۔ اگر دورانِ سبق میں نقشہ بنایا جائے، تو اُس کے اثرات دیرپا ہوتے ہیں۔ اعادے کے وقت پھر نقشے بنائے جائیں، تو اور بھی مفید ہے۔ ہاتھ سے کام کرنے میں جادو کی سی طاقت ہے اور اس سے دماغ پر جو نقش پیدا ہوتا ہے، دیرپا ہوتا ہے۔ اس طرح وقت تو زیادہ لگتا ہے، لیکن اس سے جو فائدہ حاصل ہوتا ہے، اس کے پیشِ نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وُہ وقت ضائع نہیں ہوا، بلکہ جائز طور پر استعمال ہُوا ہے۔ ادنیٰ درجوں سے اُونچے درجوں تک یہی طریقہ برتنا چاہیے۔ طلبہ بازار سے خرید کر خاکے لے آئیں یا کسی اٹلس سے خاکہ نقل کر لیں یا اُستاد خود ہی خاکے بنا کر ان کو موقع پر بانٹ دے۔ لڑکے خود ان کو مکمل کریں اور بعد میں ان کو فائل میں لگا دیا جائے۔ یہ فائل اسکول میں بھی رکھی جا سکتی ہے۔ اگر کوئی نقشہ خراب ہو جائے، تو اُس کے بجائے اور نقشہ بنا کر رکھا جا سکتا ہے۔ نقشہ بنانے میں صفائی اور درستی کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اُونچے

درجوں میں خاکوں میں رنگ بھرنے کی ضرورت نہیں۔ ایسی باتیں صرف بچّوں کو ہی خوش کرسکتی ہیں۔ اگر ایک نقشے میں بہت زیادہ چیزیں دکھانی مقصود ہوں، تو انڈکس بنانے سے نقشے کو ستھرا رکھا جاسکتا ہے۔ شہروں یا علاقوں کے بجائے نمبر ۱، ۲، ۳ وغیرہ لکھے جاسکتے ہیں اور انڈکس میں ان کی تشریح کی جاسکتی ہے۔ چھوٹی جماعتوں میں انڈکس کی ضرورت نہیں۔ وہاں ایک نقشے میں تھوڑی سی باتیں ظاہر کرنی ہوتی ہیں۔ نقشوں کے علاوہ بعض ضروری شکلیں بھی بنوائی جائیں۔ مثال کے طور پر پانچویں جماعت اور جماعت نہم میں مندرجہ ذیل نقشے اور شکلیں بنائی جاسکتی ہیں :۔

جماعت پنجم ۔ ہندوستان :۔ بندرگاہیں، پہاڑ اور دریا، بارش و ہوائیں، آب و ہوا، دریا اور ذرائع آب پاشی، پیداوار، لوگوں کے پیشے، ذرائع آمد و رفت، دستکاریاں اور کارخانے، صوبے اور ان کے دار الخلافے۔

پنجاب :۔ سطح، دریا اور دوآبے، نہریں، انہار ثلاثہ اور وادیِ ستلج کی نہریں، پیداوار، ریلیں، شہر۔

ایشیا :۔ بڑے بڑے ملک اور ان کے دار الخلافے، پہاڑ اور دریا، مون سون ہواؤں کا خطّہ۔

اشکال :۔ رین گیج یا مقیاس المطر۔

جماعت نہم ۔ ہندوستان :۔ بندرگاہیں اور ان کی اشیائے درآمد و برآمد، پہاڑ اور دریا، زمین کا ڈھلان، موسم گرما کی بارش اور ہوائیں، موسم سرما کی بارش اور ہوائیں، ذرائع آب پاشی (اس میں سب بڑی بڑی نہریں آجائیں۔ نیز ستلج وادی کی نہریں، انہار ثلاثہ، سندھ کی نہریں، میسٹر ڈیم، دریائے روہل اور جوگندر نگر اسکیم، حویلی پروجیکٹ کے علیحدہ علیحدہ نقشے بنوائے جائیں)۔ جنگلات (اس میں مختلف حصّوں میں پیدا ہونے

والے درختوں کے نام درج ہوں)۔ نارتھ ویسٹرن ریلوے، ہندوستان کی مشہور ریلیں اور ہوائی جہاز کے راستے، پیداوار کے لیے مختلف نقشے یعنی کپاس، گندم، چاول، چائے، گنّا، جوار، باجرہ وغیرہ کی پیداوار دکھانے کے لیے علٰحدہ علٰحدہ نقشے بنوائے جائیں۔ معدنیات، دستکاریاں، کارخانے، درآمد و برآمد کی اشیا کا خاکہ۔ صوبے اور ان کے گرما و سرما کے دارالخلافے، ریاستیں، آبادی، یونیورسٹیاں اور متبرک مقامات، بڑے بڑے شہر دکھائے جائیں۔

اس طرح سارے سال میں چالیس کے قریب نقشے بن سکتے ہیں۔ اعادے کے وقت انھیں پھر بتایا جائے۔ جغرافیہ طبعی کی تعلیم کے وقت شکلیں بھی بنوائی جائیں۔ شکلوں کے استعمال کے متعلق کسی دوسرے مضمون میں اظہار خیالات کیا جائیگا۔

جغرافیے کا کمرہ اور سامان عام حالات میں دیہاتی مدارس میں جغرافیے کے لیے علٰحدہ کمرے کی توقع کرنا مشکل ہے۔ تاہم اچھّے مڈل اسکولوں یا دیہات کے ہائی اسکولوں میں کوشش کرنے سے ایک کمرہ اس مضمون کے لیے مخصوص کیا جا سکتا ہے۔ اس کمرے میں سب ضروری سامان رکھا جائے۔ اس طرح تعلیمی فائدے کے علاوہ سامان کی حفاظت اچھی طرح ہو سکیگی۔ نقشہ جات و گلوب وغیرہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں لے جانے سے جلدی پھٹ جاتے ہیں یا خراب ہو جاتے ہیں۔ یہ چیزیں ایک ہی کمرے میں رہیں، تو ان کے خراب ہونے یا گُم ہونے کا احتمال کم ہوگا۔ کمرے کا بڑا یا چھوٹا ہونا لڑکوں کی تعداد پر منحصر ہے۔ البتّہ اگر یہ کمرہ اسکول کے جنوب مغرب میں ہو، تو اچھّا ہے۔ اس طرح اندر کافی دھوپ داخل ہو سکیگی اور سن ڈائل کا استعمال یا سورج کی بلندی وغیرہ معلوم کرنے کا طریقہ کمرے کے اندر ہی سکھایا جا سکیگا۔ اس کمرے میں بڑی بڑی اٹلسیں، کتابیں، دیواری نقشے، گلوب، لالٹین

اور پردہ۔ سلائیڈز Stereoscopes وغیرہ اپنی اپنی جگہ پڑے ہوں۔ طلبہ کے سامنے والی دیوار میں کوئی الماری یا کھڑکی نہ ہو۔ تاکہ اس پر بڑے بڑے نقشے لٹکائے جاسکیں یا ہر وقت لٹکتے رہیں۔ اُستاد کی میز اور کرسی ایک کونہ میں رکھی جائیں، تاکہ طلبہ کو نقشہ دیکھنے میں دقّت نہ ہو۔ البتّہ بلیک بورڈ سامنے کی دیوار میں ہی لگایا جاسکتا ہے۔ نقشوں کے لیے مناسب لمبائی چوڑائی کے صندوق بنوا لیے جائیں۔ بڑی بڑی تصویریں دیواروں پر لٹکائی جاسکتی ہیں۔ بہت سی تصویریں کمرشیل ایجنٹ نارتھ ویسٹرن ریلوے سے قیمتاً مل سکتی ہیں۔

جرمنی کا نظامِ تعلیم

از

فیاض احمد ایم اے، بی ٹی

(گزشتہ سے پیوستہ)

اس مقالے کی آخری قسط میں یہ بتایا جاچکا ہے کہ جنگِ عظیم کی وجہ سے جرمنی کے نظامِ تعلیم میں بہت سی اصلاحات نافذ کی گئیں اور اس لیے ایسے اساتذہ کی ضرورت محسوس ہوئی، جو نئے ماحول میں کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اس غرض سے ملک میں بہت سے ٹریننگ اسکول اور ٹریننگ کالج کھولے گئے، تاکہ ہونے والے اُستادوں کو تعلیم کے جدید طریقوں سے روشناس کرایا جائے۔ جرمنی کی مابعد جنگ تاریخ تعلیم میں یہ ادارے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ بیشتر اس کے کہ ان اداروں سے آپ کو روشناس کرایا جائے، یہ بتانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت کی جرمن سماج میں اُستاد کا درجہ بہت بلند ہوتا تھا قطع نظر اس امر کے کہ اُس کے پیشے کو بہت عزّت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اُس کی اقتصادی حالت بھی بہت اچھی ہوتی تھی، کیونکہ تنخواہ اُسے بہت معقول دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ حکومت کی طرف سے بھی اُسے بہت سی مراعات حاصل ہوتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ بہترین دل و دماغ کے انسان اس پیشے کی طرف رجوع کرتے تھے۔

ٹریننگ کا کورس

ابتدائی مدرسوں کے اساتذہ ۱۴ سال تک تعلیم حاصل کرتے تھے۔ وہ آٹھ برس تک تو

ابتدائی تعلیم کا کورس ختم کرتے تھے اور اس کے بعد اُنھیں تین سال کسی تمہیدی ادارے (Preparatory School) میں گزارنا پڑتے تھے اور آخر کے تین سال نارمل اسکول کی نذر ہو جاتے تھے۔ کچھ تمہیدی ادارے تو حکومت کی طرف سے جاری تھے اور کچھ لوگوں کے اپنے تھے، لیکن نارمل اسکول تمام کے تمام حکومت کے ہی تھے۔

ابتدائی اور تمہیدی اداروں کا نصاب بالکل ایک ہی ہوتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ موخرالذکر اداروں میں نصاب کا درجہ نسبتہً بہت بلند ہوتا تھا۔ تمہیدی ادارے سے تین سالہ کورس پورا کرنے کے بعد ہونے والے اُستاد کو ایک مقابلے کے امتحان میں بھی شریک ہونا پڑتا تھا۔ پیشتر اس کے کہ اُسے نارمل اسکول میں داخل کیا جائے، نارمل اسکول کے پہلے دو سالوں میں مندرجۂ ذیل مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ معلّمی (Pedagogy.) درس دینے کے ڈھنگ (Methods) زراعت اور چند ایک مضامین مثلاً تاریخ، جغرافیہ، ریاضی، سائنس، مذہب، موسیقی، ڈرائنگ وغیرہم۔ ان میں بیشتر مضامین وہی ہوتے تھے، جو طالب علم ابتدائی تعلیم کے سلسلے ہی میں پڑھ لیتا تھا۔ لیکن اس درجے میں جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، ان مضامین کی تدریس اعلیٰ پیمانے پر ہوتی تھی۔ تیسرے یعنی آخری سال میں ہونے والا اُستاد پیشہ ورانہ رنگ میں پوری طرح رنگ دیا جاتا تھا۔ اس آخری سال میں اُسے وہ رموز بتائے جاتے تھے، جو اس کے پیشے سے متعلق ہوں اور مشکلات کو حل کرنے اور عقدوں کو وا کرنے کی ترکیبیں بھی بتائی اور سکھائی جاتیں تھیں۔ لیکن یہ سال بیچارے طلبہ پر بہت گراں گزرتا تھا، اس لیے کہ اُنھیں ایک قسم کے فوجی ضبط کے ماتحت رکھا جاتا تھا۔ وہی بیرکوں کی زندگی اُنھیں گزارنا پڑتی تھی اور وہی قید و بند کی سختیاں اُنھیں سہنا پڑتی تھیں، جن کی مثال آج بھی ہندوستان کے نارمل اسکول اور ٹریننگ کالج پیش کرتے ہیں۔ طالب علم جب امتحان پاس کر لیتا، تو اُسے

کسی گاؤں میں بطور نائب مدرس کے مقرر کر دیتے، لیکن مستقل ہونے سے قبل اُسے ایک اور امتحان پاس کرنا ہوتا تھا۔

طریقِ تعلیم ضرورت سے زیادہ رواجی تھا اور اس پر پیشہ ورانہ رنگ اس قدر غالب ہوتا تھا کہ بیچارے طالب علم کو اپنے دماغ سے کام لینے کا موقع ہی نہیں دیا جاتا تھا۔ اُس کی ٹریننگ کا آخری سال بندشوں اور قواعد و ضوابط سے یکسر گھرا ہوا ہوتا تھا اور اُسے ایسے ماحول میں رکھا جاتا تھا کہ وُہ بیچارہ اپنا کورس ختم کرنے کے بعد ہمہ تن اُستاد ہو کر رہ جاتا تھا، اور بس۔ یہ حد سے زیادہ تخصیص اسے گویا ایک مشین کا انسان بنا دیتی تھی، جو نہ تو از خود کچھ کرتا تھا اور نہ کچھ سوچتا تھا اور شاید حق تو یوں ہے کہ وُہ نہ ہی کچھ از خود کر سکتا تھا اور نہ ہی سوچ سکتا تھا۔ اس لیے اس ٹریننگ کے کورس کی سب سے بڑی کمزوری یہی تھی کہ اس سے اُستاد کی آزادیِ رائے بالکل کچل جاتی تھی۔

نئی اصلاحات

اُستادوں کے لیے یہ پیشہ ورانہ طریقِ تعلیم اُنیسویں صدی کے آخر تک تو کامیاب رہا۔ لیکن بیسویں صدی کے شروع ہی میں اس میں نقاہت کے آثار نظر آنے لگے۔ جرمنی کی صنعتی، اقتصادی اور سماجی زندگی میں حیرت انگیز انقلاب آ چکا تھا اور نئے طرزِ زندگی اور نئے طرزِ معاش کی وجہ سے اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ سارے ملک کے لیے بالعموم اور بڑے بڑے شہروں کے لیے بالخصوص ایک نئی قسم کا طرزِ تعلیم اختیار کیا جائے۔ اس لیے سب سے زیادہ ضروری بات یہ تھی کہ اُستادوں کو اب نئے ماحول کے مطابق تعلیم دی جائے اور اُنھیں درس دینے کے نئے نئے طریقوں سے روشناس کرایا جائے۔ لیکن جنگ کے شروع ہونے تک باوجود اساتذہ اور ماہرینِ تعلیم کی پیہم پکار اور کوشش کے کسی قسم کی اصلاحات نافذ نہ کی گئیں۔

جرمنی میں جنگ کے بعد وائی مار کے نظامِ حکومت (Wiemar Constitution) کی رُو سے جمہوریت قائم ہوگئی اور اب جمہوری سلطنت کے کارپردازوں نے ایک جنبشِ قلم سے تمام جرمنی کے نارمل اسکولوں کی پُرانی اسکیم پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا۔ نئی اسکیم کے موافق ابتدائی مدرسے کے اُستاد کو کم و بیش ۱۶ برس تک تعلیم حاصل کرنا ہوتی تھی جس کی تفصیل یہ ہے۔

ابتدائی مدرسے میں چار سال تک۔ ثانوی درجے میں نو سال اور اس کے بعد دو یا تین سال تک پیشہ ورانہ تعلیم کسی یونیورسٹی میں یا کسی ایسے ادارے میں دی جاتی تھی، جس کا معیار یونیورسٹی کے معیار کے برابر ہو۔

پُرانی اسکیم کی رُو سے طالب علم کو بہت جلد یعنی چودہ سال ہی کی عمر میں فیصلہ کرنا ہوتا تھا کہ وُہ کونسا پیشہ اختیار کریگا۔ لیکن اب نئی اسکیم کے موافق وہ اپنا فیصلہ ۱۹ برس کی عمر تک بھی کر سکتا ہے۔

ملکِ جرمنی کئی ریاستوں یا صوبوں پر مشتمل ہے اور ہٹلر کی حکومت سے پہلے ملک میں جہاں تک محکمۂ تعلیم کا تعلق ہے، کامل صوبجاتی آزادی تھی۔ اس لیے ہر ایک ریاست کا محکمۂ تعلیم خود مختار ہوتا تھا اور کسی مرکزی محکمۂ تعلیم کے ماتحت نہ تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف ریاستوں کے محکمۂ تعلیم میں یکجہتی نہ قائم ہوسکی۔ اس لیے جب تک ملک میں جمہوریت کا دَور دَورہ رہا، مختلف ریاستوں کا نظامِ تعلیم بھی مختلف رہا اور اس لیے ابتدائی درجے کے معلّم کی تعلیم کا طرزِ تدریس بھی مختلف رہا۔ چنانچہ پرشا (Prussia) جرمنی کی سب سے بڑی ریاست نے ابتدائی درجوں کے اُستادوں کی تعلیم کے لیے چار خاص ادارے کھولے۔ ان اداروں کو یونیورسٹی سے کوئی تعلق نہ تھا اور ان کا کورس محض دو سال کا ہوتا تھا لیکن ان اداروں کے فارغ التحصیل طلبہ کو اپنی ٹریننگ ہمبرگ (Hamburg) یونیورسٹی میں

لینا پڑتی تھی۔

خوف کا عنصر

نئی اصلاحات سے ایک بڑا فائدہ یہ ہُوا کہ جرمنی کے اداروں میں جو ایک قسم کا فوجی نظم و نسق موجود تھا، وُہ دُور کر دیا گیا اور طلبہ نے پہلی مرتبہ آزادی کا سانس لینا شروع کیا۔ لیکن ضروری بات ایک یہ بھی تھی کہ بچّوں کے دلوں سے ڈنڈے اور مختلف قسم کی سزا و تعذیر کے خوف کو دُور کیا جائے۔ اگرچہ یہ خوف کا عنصر جرمنی کے نظامِ تعلیم سے بالکل دور نہ ہو سکا، لیکن ان اصلاحات کی وجہ سے اس میں معتدبہ کمی واقع ہو گئی۔

خالدہ ادیب اپنی کتاب "اندرونِ ہندوستان"(Inside India) میں جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی کے متعلق لکھتی ہیں کہ "ہندوستانی بچّوں کے حق میں خوف کا عنصر نہایت ہی مضر ہے۔ اس سے بچّے کی ذہنیت پر بہت ہی بُرا اثر پڑتا ہے"۔ وہ یہ بھی لکھتی ہیں۔ "مشرق میں بچّے کے دل کو خوف کے عنصر سے نجات دینا ازبسکہ ضروری ہے۔ اُسے وہاں گھریلو زندگی، تعلیمی زندگی اور شہری زندگی کی تعلیم خوف کے ذریعے سے ہی دی جاتی ہے۔ ہوّا یا ڈنڈا گہوارے سے قبر تک بیچارے کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ جامعہ نے اس ذریعۂ تعلیم کو دُور کر کے بہت بڑے عقدے کو وا کر لیا ہے۔ اس امر کا اظہار ڈاکٹر اکبر ہیڈ ماسٹر نے جو کولمبیا یونیورسٹی (امریکہ) (Columbia University) کے فارغ التحصیل ہیں، ان الفاظ میں کیا ہے۔ "جب بچّے یہاں پہلے پہل آئے، تو اُن کی حالت یہ تھی کہ اگر اُن کے قریب جا کر اُنھیں معمولی سی بات بھی کہی جاتی، تو وہ مدافعت کے لیے اپنی کلائی کو سر تک لے لے جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈر سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن چھے ماہ

ے "اندرون ہندوستان" مصنّفہ خالدہ ادیب خانم، صفحات ۱۰۶ و ۱۰۷

گزر جانے کے بعد اُن کی یہ حالت ہوگئی کہ وُہ خاموش کھڑے ہُوئے زجر و توبیخ کا بھی مردانہ وار مقابلہ کر لیتے تھے اور اُن سے کوئی غیر معمولی حرکت سرزد نہیں ہوتی تھی"۔

اس سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ خوف نے مشرق کو بیحد نقصان پہنچایا ہے۔ والدین، اساتذہ، حکومت چاہے اپنی ہو یا غیروں کی، غرض سب نے زیادہ تر خوف ہی سے کام چلایا، یہاں تک کہ مشرقی بچّے کا فلسفۂ حیات ہی مارنے یا مر جانے میں مضمر ہے۔ جب تک مشرق کے نظامِ تعلیم میں ضبط اور آزادی کا ایک خوشگوار حد تک امتزاج نہیں ہوگا، مشرقی حکومت کو خواہ وُہ اپنی ہو یا کسی غیر قوم کی ایک بڑا خطرہ لاحق رہیگا"۔

ہندوستانی طریقِ تعلیم میں سب سے بڑا نقص یہی ہے کہ اس میں خوف کا عنصر غالب ہے، جو ہندوستانی بچّے کی شخصیت کو تباہ کر کے رکھ دیتا ہے۔ ہمارے ملک کے ماہرینِ تعلیم کو بھی اس مسئلے کی طرف توجہ دینا چاہیے۔

جنگِ عظیم کے بعد جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے، جرمنی نے اس مسئلے کو خوش اسلوبی کے ساتھ سلجھا لیا اور سلطنتِ قیصری کے مختارِ مطلق ماسٹر کی جگہ جس کا ڈنڈا معصوم بچّوں کے نرم و نازک جسموں پر برسا کرتا تھا، ایک شفیق اُستاد نے لے لی، جو اپنا اوّلین فرض یہ سمجھتا ہے کہ وُہ اِن معصوموں کے جذبات اور احساسات کا پورا پورا خیال رکھے۔ مدرسے میں موخر الذکر کی حکومت ڈنڈے کے بل بوتے پر نہیں، بلکہ محبّت اور پیار کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ تھوڑے عرصے میں پُرانے حالات کو بدل دینا کوئی معمولی بات نہ تھی، جس حیرت انگیز سرعت سے جرمنی نے اس معاملے میں کامیابی حاصل کی، وُہ نہایت قابلِ ستائش ہے۔ آج وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جرمنی کے مدرسوں میں بڑی ہی خوشگوار فضا پیدا ہوگئی ہے۔

ثانوی درجے کے اُستادوں کی تعلیم

وُہ تبدیلیاں جو ثانوی درجے کے اُستادوں کے طریقِ تعلیم میں کی گئیں، بہت معمولی تھیں۔ حقیقی اور قابلِ ذکر تبدیلی ٹریننگ کی مدّت گھٹانے یا بڑھانے کی نہ تھی، بلکہ مقصدِ تعلیم ہی کو بدل دینے کی تھی۔ وہ طالب علم جس کا یہ ارادہ ہوتا تھا کہ وہ ایک ثانوی درجے کے مدرسے میں معلّم بن جائے۔ اس کے لیے لازمی ہوتا تھا کہ یونیورسٹی میں چار سال تک تعلیم حاصل کرے۔ یہاں پر علاوہ اُن مضامین کے جن میں اُسے دلچسپی ہو، دو اَور مضمون، یعنی فلسفہ اور تاریخِ تعلیم بھی لینا پڑتے تھے۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہوتا تھا کہ ثانوی مدرسے کی ساری جماعتوں کو کم از کم دو مضامین پڑھانے کی استعداد حاصل کرے۔

ثانوی درجے کے اساتذہ تین حصّوں میں منقسم تھے اور اُنھیں تین مختلف قسم کی تعلیم دی جاتی تھی۔

(ا) وُہ اساتذہ، جو مذہب کی تعلیم دیتے تھے اور جو مذہب کی تعلیم کے علاوہ ایک اور مضمون بھی پڑھاتے تھے۔ مثلاً لاطینی، عبرانی یا جرمن زبان۔

(ب) وہ اساتذہ، جو جرمن زبان اور تاریخ جغرافیہ کی تعلیم دیتے تھے۔

(ج) وہ اساتذہ جو فنونِ لطیفہ کی تعلیم دیتے تھے اور ان کے علاوہ ایک دوسرا مضمون بھی پڑھاتے تھے۔

اُمیدوار کو اوّلین اہمیت کے تین یا چار مضامین لینا پڑتے تھے۔ ایک یا دو مضمون ایسے بھی لینا پڑتے تھے، جنھیں ثانوی درجے کی اہمیت حاصل ہوتی تھی اُمیدوار جتنے زیادہ مضمون لے کر اپنی تعلیم مکمل کرتا تھا، اُسے ملازمت ملنے کی اتنی ہی زیادہ اُمّید ہوتی تھی۔ امتحان پاس کرنے کے بعد اُسے دو سال کسی ثانوی مدرسے میں معلّمی کے فرائض

سر انجام دینا ہوتے تھے۔ اس دوران میں تعلیم کا ڈائرکٹر اُس کی رہنمائی کرتا تھا۔ اس کے بعد اُسے ایک اور امتحان پاس کرنا پڑتا تھا، جو تحریری بھی ہوتا تھا اور زبانی بھی اور اس امتحان کے پاس کرنے کے بعد وہ ثانوی درجے کے مدرسوں میں معلّمی کے فرائض سر انجام دینے کے قابل سمجھا جاتا تھا۔ اگر اُسے فوراً ہی کوئی ملازمت مل جاتی، تو وہ بہت خوش قسمت خیال کیا جاتا تھا، ورنہ عام حالتوں میں اُسے ملازمت حاصل کرنے میں پانچ سات سال کا عرصہ گزر جاتا تھا۔ ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۴ء کے لگ بھگ صرف پرشا کی ریاست میں ۱۶ ہزار نوجوان اُمیدوار ایسے تھے، جو ٹریننگ تو حاصل کر چکے تھے، لیکن ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ہمارے ملک میں آجکل جہاں تک اس پیشے کا تعلق ہے، حالت اس قدر بُری نہیں کہ محض ایک صوبے میں بیکار اساتذہ کی تعداد سولہ ہزار تک پہنچ گئی ہو لیکن اگر حالت یہی رہی، تو ڈر ہے کہ کہیں اس پیشہ کا حال چند سالوں میں ہی جرمنی کی حالت سے بھی سوا نہ ہو جائے۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ ابتدائی مدرسوں کے اساتذہ کو ذرا بھی انتظار نہ کرنا پڑتا تھا اور اُنھیں فوراً ملازمت مل جاتی تھی۔ برلن یونیورسٹی کے ڈاکٹر کارٹزک کا بھی یہی خیال ہے کہ ثانوی مدرسوں کے اُستاد کو ۳۵ برس کی عمر سے پہلے مستقل ملازمت ملنا بہت دشوار ہوتا تھا۔

بعض اوقات اُمیدوار کو ۲۵ یا ۲۶ برس کی عمر میں اس امر کا احساس ہوتا تھا کہ وہ معلّمی کے پیشے کے قابل نہیں لیکن اتنی مدّت یہاں گزارنے کے بعد وہ بیچارا پیچھے قدم ہٹانے کے ناقابل ہو جاتا تھا۔ کوشش کر کے کسی حد تک اس نقص کو بھی رفع کیا گیا۔ چنانچہ وہ طالب علم جو پیشۂ معلّمی کے لیے یونیورسٹی میں تعلیم پاتا تھا، اُسے یہ سہولت دے دی گئی کہ وہ پہلے دو سالوں کے دوران میں مدرسوں میں جا کر بطور نائب اور ممد کے کام کرے اور اگر اُسے اس پیشے سے شغف ہو، تو وہ اپنی تعلیم جاری رکھے، ورنہ چھوڑ دے۔

خوف

از

میرزا مقبول بیگ بدخشانی، سنٹرل ماڈل اسکول، لاہور

بچہ چھے سال کا ہوجائے، تو اُس کی اخلاقی تعلیم پوری ہوجانا چاہیے۔ بعد کے سالوں میں اخلاق کی کوئی نئی تعلیم نہیں ہوتی، بلکہ وہی اچھی عادتیں اور وہی رجحان جو اُس کے دل اور دماغ میں پیدا ہوگئے ہیں، اُنھیں کی پرورش ہوتی ہے۔ اُنھیں کی تربیت ہوتی ہے۔ اگر پہلے ہی چھے سال بچّے کے اخلاق کی تربیت ٹھیک طور سے نہ کی گئی ہو، تو اس صورت میں پچھلے سالوں میں بھی اُسے اخلاق کی نئی تعلیم دی جاسکتی ہے۔

بچّے کی زندگی کا دوسرا سال بڑی ہی خوشی کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس زمانے میں وہ باتیں کرنا سیکھتا ہے۔ چلنے پھرنے کے لیے ہاتھ پاؤں ہلاتا ہے۔ پہچاننا شروع کرتا ہے۔ یہ بات قاعدے کے طور سے پیش نہیں کی جاسکتی۔ چونکہ بہت سے بچّے ایسے بھی ہوتے ہیں، جو اس عرصے میں نہ بات کرنے کی کوشش کرتے ہیں، نہ حرکت کرنے کی خواہش ان کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ بہرحال یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ بچّوں کی زیادہ تعداد ایسی ہوتی ہے کہ ان کے دلوں میں نئی نئی اُمنگیں اُٹھتی ہیں۔ نئی نئی آرزوئیں آتی ہیں۔ یہ تمام باتیں اس کے دل میں آزادی اور قوت کا احساس پیدا کرتی ہیں۔ ہر نئی صبح کے ساتھ ساتھ وُہ آزادی اور قوت میں زیادتی محسوس کرتے ہیں۔ کھیل بھی وہ کھیلتے ہیں، ایسا کھیل، جس میں کسی دوسرے ساتھی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کا کھیل ہر بات سے آزاد ہوتا ہے۔ ان کے دلوں میں دنیا کو دیکھنے کا احساس بہت تیز ہوتا ہے۔ یہ احساس ان مردوں کے احساس سے

بھی زیادہ تیز ہوتا ہے، جو دنیا بھر کے حالات سے لطف اُٹھانے کے لیے گھر بیٹھے بیٹھے کرہ زمین کے گلوب گھماتے رہتے ہیں۔ بچے پرندوں کو دیکھتے ہیں، تو خوش ہوتے ہیں پھولوں کو دیکھتے ہیں، تو اُن کی خوشی کی کوئی حد نہیں رہتی۔ موٹریں، گاڑیاں، گھوڑے ان کے لیے بڑی بڑی دلچسپیاں رکھتے ہیں۔ ان کے دل میں دریافت کرنے کی خواہش اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ اس کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ بچے کا وظیفہ ہی یہ ہوتا ہے "میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں اور دیکھنا چاہتا ہوں"۔ پنگھوڑے اور کھاٹ ایسے پابندیوں کے مقام سے خلاصی پاکر، باغ میں ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس پر ننگے پاؤں دوڑنا، ننھی ننھی تیتریوں کا پیچھا کرنا، کھیل کے میدانوں میں تیز تیز گھومنا، بچے کے دل اور دماغ کے اندر آزادی کا وجد پیدا کر دیتا ہے۔ اس کی ہاضمے کی قوت پہلے سال کی نسبت زیادہ ہوتی ہے۔ خوراک بھی طرح طرح کی کھانے لگتا ہے۔ چیزوں کو دانتوں سے چباتا ہے، تو اُس کا دل خوشی سے بیوں اچھلتا ہے۔ ایسے زمانے میں اگر بچے پر پوری پوری نظر رکھی جائے اور بچہ تندرست اور توانا بھی ہو، تو زندگی اُسے ایسی مہم نظر آنے لگتی ہے، جو اپنے اندر بڑی بڑی دلچسپیاں رکھتی ہے۔

یہ زمانہ وہ ہے کہ بچہ چلتا بھی ہے اور دوڑ بھی لیتا ہے، لیکن ساتھ ساتھ اس میں ایک نئی چیز پیدا ہوتی ہے۔ یہ نئی پیدا ہونے والی چیز خوف ہے۔ ننھے بچے بہت جلد ڈرائے جا سکتے ہیں۔ وہ اُونچی آوازوں سے ڈرنے لگتے ہیں۔ گر پڑنے کا احساس بھی انھیں ڈرا دیتا ہے۔ پہلے سال میں تو بچے کی اتنی حفاظت ہوتی ہے کہ اُسے ڈرا دینے والے موقعوں سے واسطہ ہی نہیں پڑتا۔ اگر خوف کا کوئی موقع ہو بھی جائے، جب بھی اس کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ دوسرے اور تیسرے سال میں نئے نئے خوف پیدا ہونا شروع ہوتے ہیں اور ترقی پاتے ہیں۔ اب اس بات پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ خوف پیدائشی

ہوتے ہیں یا کسی کے سمجھانے سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ کہہ دینا مشکل ہے کہ پہلے سال میں بچّے کے دل میں خوف کا احساس نہیں ہوتا، اس لیے یہ طبعی نہیں۔ طبعی جذبہ جب چاہے پختہ ہو جائے۔ اس بات میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں کہ جنسی خواہش ایک طبعی خواہش ہوتی ہے۔ ایک دن کے بچّے میں بھی ہوتی ہے، بائیس سال کے نوجوان میں بھی ہوتی ہے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ بچّے کی یہ طبعی خواہش اس کی پیدائش کے وقت بھی بالغ ہی ہوتی ہے۔ یہ سیدھی سی بات ہے کہ جو بچّے اپنے آپ دوڑ لیتے ہیں، انھیں ڈرنے کے زیادہ موقعے ہوتے ہیں، ان بچّوں کی نسبت جو چل پھر نہیں سکتے۔ اس لیے اگر ہم یہ کہیں کہ خوف کا فطری جذبہ موقعوں کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا ہے، تو یہ کچھ عجب نہیں۔ بعض خوف جو سمجھانے سے پیدا ہوتے ہیں، ان کے دور کرنے کی بڑی سہل ترکیب یہ ہے کہ کوئی ڈراؤنی اور گھناؤنی چیز اُنھیں دکھائی ہی نہ جائے۔ بعض خوف جوان میں طبعی ہوں، ان کے دُور کرنے کے لیے زیادہ محنت اور زیادہ سوچ والے طریقے استعمال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ڈاکٹر چالمرس مچل نے اپنی کتاب "حیوانوں کا بچپن" میں بہت سی باتیں لکھی ہیں، جو اُنھوں نے دیکھی ہیں اور خود بھی تجربہ کی ہیں۔ ان میں آپ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خوف کا کوئی طبعی جذبہ ایسا نہیں ہوتا، جو جانداروں کو ورثے میں ملتا ہو۔ بندروں اور چند پرندوں کا معاملہ البتّہ ان سے مختلف ہے۔ سانپ ایسے عمر بھر کے دشمنوں پر جب ان کی نگاہ پڑتی ہے، تو یہ جانور اُنھیں بے کھٹکے دیکھتے رہتے ہیں۔ اس سے انھیں کسی قسم کا خوف نہیں ہوتا۔ خوف اُنھیں اس وقت ہوتا ہے، جب اُنھیں ان کے ماں باپ جتا دیں، کہ یہ جانور بڑے ہی خطرناک ہوتے ہیں اور ہمارے دشمن بھی ہیں۔ سال سے کم عمر کے بچّوں کو آپ نے دیکھا ہوگا، حیوانوں سے بالکل نہیں ڈرتے۔ ڈاکٹر واٹسن نے تجربے کی غرض سے

ایک بچّے کو ڈرنا سکھا دیا تھا۔ واٹسن شروع شروع میں چوہا بچّے کو دکھاتا اور دکھاتے ہی خود ایک ڈراؤنی سی آواز نکالتا۔ بچہ ڈرنے لگتا۔ ڈر، چوہا اور وُہ ڈراؤنی آواز تینوں باتیں اس بچّے کے دماغ میں ایک ہوگئی تھیں۔ اب بچّہ جہاں کہیں ایسی آواز سُنتا، تو اُس کے ذہن میں وہی چوہا دوڑ جاتا اور وُہ ڈرنے لگتا۔ اس مثال سے پتہ چلا کہ ڈر سجھائے سے پیدا ہوا۔ پیدائش کے پہلے چند مہینوں میں حیوانوں کو کوئی فطری خوف نہیں ہوتا۔ چھوٹے چھوٹے بچّوں کو اگر یہ احساس نہ دلایا جائے کہ اندھیرا خوفناک ہوتا ہے، تو اُنھیں اندھیرے سے کبھی خوف نہیں آئیگا۔ بہت سی اور دلیلیں بھی دی جا سکتی ہیں کہ وہ خوف جنھیں ہم پیدائشی سمجھ لیتے ہیں، حقیقت میں پیدائشی نہیں ہوتے، بلکہ ایسے خوف ہوتے ہیں، جو کسی کے جتائے اور سجھائے سے پیدا ہوتے ہیں۔ بزرگ اگر بچّوں کو یہ خوف سجھاتے نہیں، تو ان کا پیدا ہونا ممکن ہی نہ تھا۔

اس موضوع پر زیادہ روشنی حاصل کرنے کے لیے ہم نے اپنے ایک بچّے اور بچّی کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ مطالعے کے اس عرصے میں مَیں یہ بات ہرگز نہیں سمجھ سکا تھا کہ دایہ یا نوکرانی بچّوں سے جو کہہ دیتی ہے یا اُنھیں سجھا دیتی ہے، وہ ان کے دماغوں میں اچھی طرح سے جگہ پکڑ لیتا ہے۔ آپ اس کے خلاف بیسیوں بیان دیں۔ سینکڑوں تاویلیں کریں، لیکن ان کا بتایا ہُوا اور ان کا سجھایا ہُوا محو نہیں ہوگا۔ مشکوک ممکن ہے، ہو جائے۔ مَیں نے ان کے دماغی مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ پہلے سال میں بچّوں کو بالکل ہی کسی چیز کا خوف نہیں ہوتا۔ دوسرے سال میں بھی اُنھیں حیوانوں سے ذرا ڈر نہیں لگتا۔ اتفاق کی بات ہے کہ ایک مرتبہ بچّی کے پاس گھوڑا آن کر زور زور سے ہنہنانے لگا۔ اس دن سے وُہ بچّی گھوڑے سے ڈرنا شروع ہوگئی۔ بچّے کی سُنیے، دوسرے سال ہم نے نوکرانی کو چھٹّی دے دی۔ یہ نوکرانی خود بہت ڈرپوک تھی۔ اندھیرے کو دیکھ کر سہم سہم جاتی تھی۔ یہ بات ہمیں پہلے معلوم نہیں تھی۔

بہرحال یہ سارے خوف اُس نے نوکرنی سے چپ چاپ قبول کر لیے۔ وُہ کتّوں سے ڈرتا تھا۔ بلّیوں سے چھپتا تھا۔ چوہوں سے بھاگتا تھا۔ اندھیرے کے نام سے سہم جاتا تھا۔ ذرا ذرا سے ڈر سے کانپنے لگتا تھا۔ وُہ چاہتا تھا کمروں کے کونے کونے کو روشن کر دیا جائے۔ اندھیری جگہ اُسے کاٹنے کو آتی تھی۔ خوف کا اتنا شدید احساس اُسے شاید نوکرنی سے ملا تھا۔ جب وہ یہاں سے چلی گئی، تو بچّے کے لیے یہ چیزیں بھی خوف کا باعث نہ رہیں۔ بعض اور چیزیں بھی ایسی تھیں، جن سے وہ ڈرتا تھا۔ یہ ڈر یقیناً نوکرنی کی صحبت کا نتیجہ نہ تھا۔ نوکرنی سے پہلے بھی وُہ ان چیزوں سے ڈرا کرتا تھا۔ یہ چیزیں ایسی تھیں۔ جن سے سیانا آدمی کوئی نہیں ڈرتا۔ مثلاً چیزوں کے سایے، جو دیوار پر پڑتے اور حرکت بھی کرتے ہیں اور کھلونے جو خود بخود حرکت کرنے لگتے ہیں۔ یہ بات تجربہ کرنے کے بعد مَیں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس قسم کے خوف بچپن کے وقت سے ہی ہوتے ہیں اور ان کے فطری ہونے میں کافی دلیلیں دی جا سکتی ہیں۔

مَیں نے اس کا خوف دور کرنے کے لیے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں سے عکس ڈالنا شروع کیے اور پھر اُسے کہا تم بھی اسی طرح کرو۔ اس عمل سے عکسوں اور سایوں کی اصلیت کا حال اس پر کھل گیا اور یہی چیزیں اس کی دلچسپی کا موجب بن گئیں۔ اب وہ عکسوں سے ڈرتا نہیں تھا، بلکہ سمجھنے کی کوشش کرتا تھا کہ یہ کن چیزوں کے عکس ہیں۔ وہ اپنے آپ چلنے والے کھلونے سے بھی ڈرتا تھا، یہی عمل وہاں بھی کیا گیا اور یہ کھلونے بھی اُس کے لیے خوشی کا باعث بن گئے۔ جس چیز سے بچّے کو ڈر لگے، وُہ اُس کی نظر کے سامنے سے ہٹا نہیں لینا چاہیے، بلکہ اُسے کچھ فاصلے پر رکھ دینا چاہیے۔ اس سے وہ ڈریگا تو سہی، لیکن بہت کم اور اسی طرح مشق کرنے سے یہ خوف جاتا ہی رہیگا۔

ہمارا بچہ سمندر سے بہت ڈرتا تھا۔ اس ڈر پر قابو پانا بہت مشکل تھا۔ وہ اڑھائی سال کا
تھا کہ ہم اُسے پہلی مرتبہ سمندر کے کنارے پر لے گئے۔ سمندر کی سطح کو دیکھ کر وہ چیخ
اُٹھا۔ اُسے سمندر کے پانی کی ٹھنڈ سے نفرت تھی۔ موجوں کے شور سے اُسے خوف آتا تھا۔
موجوں کے متعلق وہ یہ سوچتا تھا کہ یہ اُوپر ہی اُوپر چڑھی آتی ہیں، لَوٹتی نہیں۔ سمندر کے
خوف کو دور کرنے کے لیے ہمیں بہت سہج سہج کام کرنا پڑا۔ پہلے ہم نے اُسے ایک حوض میں
لا ڈالا۔ یہاں اُس نے پانی کی ٹھنڈک کو محسوس کیا اور یہ بھی محسوس کیا کہ پانی کی ٹھنڈ نفرت
کے قابل نہیں، بلکہ محبت کے قابل ہے۔ اب چھوٹے پانی میں بائیسکل چلانا اس کے لیے
بڑا ہی خوشی کا شغل بن گیا۔ پھر ہم نے حوض کو کناروں تک بھر دیا۔ یہ پانی اس کی کمر تک
آتا تھا۔ پہلی مرتبہ یہ اس سے بھی ڈرا، لیکن بعد میں خود بخود ہی یہ ڈر دور ہو گیا۔ اب موجوں
کا مسئلہ باقی رہ گیا تھا۔ موجوں کے شور کے خوف کو دُور کرنے کے لیے ہم نے اکثر ایسا کیا
کہ اُسے ایسی جگہ پر جا بٹھایا اور گھنٹوں وہیں بٹھائے رکھا، جہاں اُس کے کان تو موجوں کے
شور کو سُنتے تھے، لیکن آنکھیں اُنھیں نہیں دیکھتی تھیں۔ اس صورت سے موجوں کے
شور کا خوف بھی جاتا رہا۔ پھر ہم اُسے ساحل سے بہت دُور ہٹ کر خشکی کے ایسے مقام
پر لے گئے، جہاں سے موجیں نظر تو آتی تھیں، لیکن ان کے حملہ کرنے کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔
یہاں سے اُسے دکھایا گیا کہ موجیں آتی ہیں اور پلٹ بھی جاتی ہیں۔ ایسا نہیں کہ اوپر ہی اُوپر
چلی آئیں۔ اب اس کا خوف دُور ہونے لگا تھا۔ اس نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اس کے ماں
باپ بہن بھائی نہایت آزادی کے ساتھ سمندر کے کنارے چھوٹے چھوٹے پانی میں جاتے
ہیں اور نہاتے بھی ہیں۔ اس لیے موجوں کے ساتھ ٹکرانے میں بھی اُسے خوف نہ آتا تھا۔
اس تجربے سے مجھے اتنا یقین ہو گیا کہ یہ خوف طبعی تھا، سجھائی کا نتیجہ نہ تھا۔ دوسرے موسم

گرما میں وہ ساڑھے تین برس کا تھا۔ ہم نے پھر اسی مسئلے کو چھیڑا۔ موجوں کے اندر جانے سے وہ اب تک بھی ڈرتا تھا۔ ہم نے اُسے دلاسا دیا اور پھسلایا بھی، لیکن زیادہ کامیابی نہ ہوسکی۔ پھر ہم نے پرانا طریقہ اختیار کیا۔ ہم نے اُس کی غیرت کے احساس کو اُبھارا "بیٹا! دیکھو سب موجوں کے اندر جا کر نہاتے ہیں، تم ڈرتے ہو۔ یہ ہمارے لیے کتنی شرم کی بات ہے" اس سے وُہ حوصلہ کرکے پانی میں داخل ہوگیا۔ ہم نے اس کی بہت تعریف کی بتواتر دو ہفتے ہم خود اس کو موجوں کے اندر جا کر ڈالتے رہے۔ شروع شروع میں وہ چیختا چلّاتا رہا، لیکن آخر میں وُہ ایک مجاہد کی طرح موجوں کے اندر جا کر کھڑا ہو جاتا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ اُسے اب سمندر کی سطح سے ڈر نہیں لگتا تھا۔ مجھے یاد ہے، جب میں اتنا ہی بڑا تھا، تو میں بھی سمندر کے پانی سے ڈرتا تھا۔ لیکن مجھے تو ایڑیوں سے گھسیٹ کر موجوں کے اندر لے جاتے تھے اور میرے ہا و ہو کی پروا نہ کرتے ہُوے، میرے سر کو موجوں کے اندر ڈال دیتے تھے۔ میرا خوف اس صورت سے جاتا رہا۔ لیکن میں سمندر کا خوف دور کرنے کے لیے اس طریقے کی سفارش نہیں کرسکتا۔

ایک ہی اتفاق اگر کئی مرتبہ پیش آئے اور کئی مرتبہ اس کا تجربہ بھی کر لیا جائے، اس میں کوئی تکلیف بھی برداشت نہ کرنا پڑے، تو خوف جاتا رہتا ہے۔ ایک دم ایسا تجربہ نہیں کرا دینا چاہیے، جس سے وحشت ٹپکتی ہو۔ ایسا تجربہ سہج سہج کرانا چاہیے تاکہ حیرانی اور وحشت کا موجب نہ رہے۔ اگر خوف کو دور کرنے کے لیے کوئی ضروری تجربہ جبر کیے بغیر کیا جاسکے، تو بڑی ہی اچھی بات ہے۔ لیکن اگر جبر کیے بغیر وہ تجربہ نہ ہوسکے، تو جبر کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ بہتر ہے، بہ نسبت اس کے کہ وُہ خوف جڑ پکڑے اور بڑھتا رہے۔ ڈرپوک بچّے کے ڈر کو اگر دور نہ کیا جائے، تو یہ بچّہ جب بڑا ہوگا، اس کے ہمجولی اس سے

نفرت کرینگے۔ اس وقت اس کے ڈر کی پُرانی عادتوں کو دور کرنا محال ہو جائیگا۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ایسے واقعات میں شروع شروع میں خوف پر غلبہ پانے کی تعلیم دینے کے لیے اگر جبر بھی کر لیا جائے، تو کوئی ہرج نہیں۔

بچّوں کی زیادہ ناز برداری بھی ان کی تربیت کے راستے میں روک ہو جاتی ہے۔ ہمارا بچّہ اڑھائی برس کا تھا اور اُسے تنہا ایک کمرے میں سلایا جاتا تھا۔ وہ تنہا سوتا تھا اور خوش بھی تھا۔ ایک رات بڑے زور کی آندھی آئی۔ دروازے کے پھاٹ زور زور سے بجنے لگے۔ سائیں سائیں کی پُرشور آواز نے اُسے جگا دیا۔ وُہ ڈر کر چلّانے لگا۔ مَیں اس کے پاس گیا، وُہ ڈر سے کانپ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر میرے ساتھ چمٹ گیا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کا ڈر جاتا رہا۔ لیکن اب وہ شکایت کرتا تھا کہ یہاں اندھیرا ہے۔ حالانکہ سال بھر وہ یہیں سوتا رہا تھا۔ میں نے پھر اُسے لٹا دیا۔ خوف تو اب بھی اُسے آتا تھا، لیکن کسی دوسری شکل میں۔ مَیں نے اس کی یہ حالت دیکھ کر کمرے میں شمع جلادی۔ اس کے بعد وُہ قریب قریب ہر رات چلّا اُٹھتا تھا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ یہ چلّانا اسلیے تھا کہ لوگ اس کے پاس آئیں اور ایک ہنگامہ سا بپا ہو۔ اُس کے لیے اس میں لذت تھی۔ ہم نے اُسے کہدیا، اندھیرے میں کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے۔ اگر تم رات میں کسی وقت جاگ اُٹھو، تو پہلو بدل اور پھر سو جاؤ۔ ہم تمھارے پاس نہیں آئیں گے، تاوقتیکہ کوئی ضروری بات نہ ہو۔ اُس نے یہ باتیں توجہ کے ساتھ سُن لیں اور اُس کے بعد اُسے ہم کو بُلانے کا خیال نہیں آیا۔ رات کی روشنی بھی بجھا دی گئی۔ اگر اس موقعے پر کچھ ناز برداری اور کی جاتی، تو یہ ڈرنے کا شوق نہ جانے کیا رنگ لاتا۔

یہاں تک تو ذاتی تجربے کا تعلق تھا۔ اب ہم خوف کو دُور کرنے کے طریقوں پر ایک

عام نظر آئیں گے۔ پہلے چند سالوں میں بچوں کا خوف دور کرنے اور جرأت پیدا کرنے کے لیے ان کے بہترین معلّم بڑے بچے ہوتے ہیں۔ اگر ایک بچے کے بڑے بھائی بہن بھی ہوں، تو وہ اس میں جرأت پیدا کر دیتے ہیں، مثال کے ذریعے بھی اور نصیحت کے ذریعے بھی۔ تو گویا روزمرہ کی زندگی میں جو بڑے کرینگے، وہ یہ بھی کر گزرینگے۔

دلیر ہم کسے کہتے ہیں؟ اگر دوسرے آدمی ایک کام کو کرتے ہوئے ڈر جائیں اور نہ نہ کر سکیں۔ لیکن ایک اُسے دل جمعی کے ساتھ کر لے، تو ہم اُسے دلیر کہیں گے۔ یہاں دو صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کے دل میں خوف پیدا ہی نہیں ہوتا۔ دوسری یہ کہ خوف اس کے دل میں پیدا تو ہوتا ہے، لیکن اپنے ارادے کی قوت سے اس پر قابو پا لیتا ہے۔ دوسری صورت جرأت کی کوئی اچھی صورت نہیں۔ اخلاق کی جو نئی تعلیم دی جاتی ہے، اس سے یہ مراد ہے کہ بچے کے اندر اچھی عادتیں پیدا کی جائیں اور ان عادتوں کے ذریعے کسی خاص مقصد پر پہنچیں۔ پُرانی تعلیم اس سے مختلف تھی۔ اس کا یہ مقصد ہوتا تھا کہ بچہ عادت سے نہیں، بلکہ قوتِ ارادی سے کام لے اور اپنے آپ پر قابو پا کر کسی مقصد کو پہنچے۔ اگر انسان ارادے کی قوت اور اپنے آپ پر قابو پا کر کوئی جرأت کا کام کرے، تو رگوں اور نسوں میں ابتری اور برہمی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ خوف کو اگر دبا لیا جائے، تو وہ اندر ہی اندر اپنا راستہ بناتا رہتا ہے اور ایسی صورتیں اختیار کر لیتا ہے، جو ظاہر تو نہیں ہوتیں، لیکن ظاہرا خوف سے زیادہ خوفناک ہوتی ہیں۔ اس سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ اپنے آپ پر قابو پانے پر سرے سے اہمیت ہی نہ دی جائے، اس کے بغیر کوئی انسان خاطر جمعی سے زندگی ہی نہیں گزار سکتا۔ اس سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اپنے آپ پر قابو پانے کی ضرورت صرف ایسے موقعوں پر ہونا چاہیے، جو بالکل توقع کے خلاف ہوں۔ مثلاً جنگ وغیرہ۔

جُرأت کے بہت سے اور بھی پہلو ہوتے ہیں۔ مثلاً ہائے وائے کیے بغیر چوٹ سہ لینا۔

اس کی تعلیم یوں دی جا سکتی ہے کہ اگر بچّے کے چوٹ آجائے، تو اُس سے ہمدردی کا اظہار نہ کریں۔ اکثر سنتے ہیں کہ جوانی کے زمانے میں ہسٹیریا کا مرض مردوں اور عورتوں کو ہو جاتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہی ہوتی ہے کہ مریض کے دل اور دماغ میں بڑے زور کی خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اس سے ہمدردی کی جائے اور خواہش کی یہ شدّت ہسٹیریا کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ آپ نے یہ بھی سُنا ہوگا، بعض بچّے یوں بھی بیمار بن بیٹھتے ہیں۔ ان کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ ان سے زیادہ پیار کیا جائے ——— تو گویا اگر ہم چاہیں کہ ایسی صورتوں کو دور کر دیں، تو ہمیں چاہیے کہ بچّے کے جو ذرا ذرا سی چوٹیں بچپن میں آئیں، ان کی پروا نہ کریں۔ ان کو یہ محسوس بھی نہ ہونے دیں کہ ایسی باتوں میں ہمدردی کا اظہار بھی کیا جا سکتا ہے۔ تربیت کی یہ صورت لڑکیوں کے معاملے میں اور بھی زیادہ خراب ہوتی ہے۔ لڑکیوں کے ساتھ نرمی کا سلوک کرنا بھی اتنا ہی بُرا ہے، جتنا لڑکوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرنا بُرا ہے۔

اَن دیکھی اور اَن سُنی چیزوں کے خوف کا تذکرہ کر دیا گیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ خوف طبعی ہوتا ہے۔ بہت سے وسواس اور وہمی خطرے انھیں سے پیدا ہوتے ہیں۔ چاند گرہن، سورج گرہن، زلزلے، طاعون وغیرہ ان وہمی خطروں کو اور بڑھا دیتے ہیں۔ خوف کی یہ قسم زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ اس کو دور کرنا بڑی ہی ضروری بات ہے۔ اس کے لیے زیادہ صحیح علاج یہ ہے کہ اس قسم کی پُراسرار باتوں کی علمی طور سے تشریح کر دی جائے اور اس صورت سے بچّے کے دل میں احساس پیدا کیا جائے کہ اعجوبہ چیز کا خاص احساس ہمارے دل میں صرف اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ یہ بات پہلے ہمارے علم میں نہ تھی۔ اس کے لیے کوشش اور استقلال کی ضرورت ہے۔ پُراسرار بات کا خوف اگر بچّے کے دل سے چلا جائے، تو یہ اس کے لیے بڑی ہی دلچسپ ہو جاتی ہے۔ ایسی باتوں کو دیکھ کر اگر بچّہ ڈرے نہیں

اور اس کے دل میں کوئی وہم یا وسواس پیدا نہ ہو، تو اُسے مطالعہ کی ترغیب ہوتی ہے۔
گرہن کا مسئلہ اگرچہ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے، لیکن اس خوبی سے بیان کیا جا سکتا ہے کہ چھوٹے سے چھوٹا بچّہ بھی سمجھ لے۔ سمجھ لینے کے بعد وُہ گرہن سے ڈریگا نہیں، بلکہ اس کو دیکھیگا۔ اس پر غور کریگا اور دوسری دفعہ اسے دیکھنے کا مشتاق ہوگا۔ جو چیز بچّے کو ڈرا دے، اُس کے متعلق اُسے تفصیل سے بتا دو۔ اس سے اس کے دل کے اندر علمی دلچسپی پیدا ہو جائیگی۔

خوف کے سلسلے میں بعض مسئلے کچھ زیادہ مشکل ہوتے ہیں اور ان کے حل کے لیے زیادہ شعور کی ضرورت ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ مشکل موت کا مسئلہ ہے۔ بچّہ باغ میں جاتا ہے۔ دیکھتا ہے، چھوٹے چھوٹے پودے اُگتے ہیں اور دھوپ سے جل کر مرجھا جاتے ہیں۔ مرجھا کر پھر زمین کی خاک ہو جاتے ہیں۔ گویا ان کی زندگی موت کی صورت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ بعض جانور بھی اُسے مرتے ہُوئے نظر آتے ہیں۔ ایسا اتفاق بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے سامنے کوئی اُس کی جان پہچان والا انسان بھی چل بسے۔ ایسے واقعات اس کے دماغ میں بہت سے سوالات پیدا کر دیں گے۔ ان سوالوں کا جواب آپ کو بڑی احتیاط اور پوری لیاقت سے دینا چاہیے۔ اگر آپ موت کے بعد کی ابدی زندگی پر ایمان رکھتے ہیں، تو آپ اس کے اکثر سوالوں کا جواب آسانی سے دینگے اور اگر آپ موت کے بعد کی زندگی پر یقین نہیں رکھتے، تو جو آپ کے دل میں ہے، صاف صاف کہدیں۔ اس کے خلاف کچھ نہ کہیں۔ آپ جو کچھ کہیں اس انداز سے کہیں کہ وُہ اس ساری بات کو بڑی ہی معمولی سمجھنے لگے۔ متانت اور سنجیدگی سے کچھ نہ کہیں۔ ایسا نہ ہو کہ اُسے اس میں بڑی اہمیت معلوم ہونے لگے۔ اگر وُہ آپ سے اپنی موت کے متعلق پوچھ لے، تو آپ اس سے کہدیں "بیٹے تم ابھی بچّے ہو، جوان ہو گے، پھلو گے پھولو گے اور دیر تک زندہ رہو گے"۔ یہ بات بڑی ہی بے فائدہ ہے کہ بچپن

ہی میں اس کے دل کے اندر موت کے خلاف نفرت سی پیدا کر دی جائے اور ایسی نفرت کہ اس کی زندگی کو ہی غمگین بنا دے۔ تم خود ایسے موضوع کو نہ چھیڑو۔ لیکن اگر کوئی بچہ اس موضوع کو چھیڑ دے، تو اس کو ٹالو نہیں۔ تم اُس کے دل میں یہ احساس پیدا کرنے کے لیے پوری پوری کوشش کرو کہ موت کوئی اعجوبہ نہیں۔ تم ان کے ساتھ پوری پوری گفتگو کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہو۔ جس بات پر تم خود یقین رکھتے ہو، اُنھیں بھی بتا دو اور یہ اثر پیدا کر دو کہ اس موضوع میں کوئی خاص لگاؤ نہیں۔ موت کے مسئلے میں دیر تک غور کرنا بوڑھے اور جوانوں کے لیے بھی بُرا ہے۔

خوف کی ان خاص قسموں کے علاوہ اور باتیں بھی ہیں، جو بچّے کی تشویش اور تردّد کا موجب ہو جاتی ہیں، لیکن یہ تشویش اور تردّد بڑی حد تک بزرگوں کے دباؤ کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اگر ہم بچّے کو ہر وقت ہی کسی نہ کسی بات سے روکتے رہیں۔ شور سے ہر وقت ہی باز رہنے کی ہدایت کریں اور ہر وقت اُسے تہذیب کا سبق دیتے رہیں، تو بچپن کا زمانہ اُس کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ مجھے یاد ہے، مَیں پانچ برس کا تھا۔ مجھے بتایا جاتا تھا کہ بچپن کا زمانہ زندگی کا سب سے بہتر اور سب سے زیادہ خوشی کا زمانہ ہے۔ اس بات نے میرے دل میں خوشی کا احساس پیدا کرنے کے بجائے غم کا احساس پیدا کر دیا۔ مجھے اُنھوں نے اپنی بات کا یقین دلا دیا تھا۔ یہ یقین میرے لیے بڑا خوفناک تھا۔ بچپن کے بعد لڑکپن تھا، لڑکپن کے بعد جوانی اور جوانی کے بعد بڑھاپا۔ گویا یہ تمام زمانے بچپن کے زمانے سے بُرے تھے اور یہ تمام زمانے مجھے گزارنا تھے۔ اس احساس سے میرا دل مرجھا گیا۔ بچّے کو اس قسم کی باتیں کہہ دینا کتنی بڑی غلطی ہے۔ بچّہ بڑے بڑے کام کرنا چاہتا ہے۔ بڑی بڑی چیزیں حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ان چیزوں کے حاصل کر لینے کا خیال ہی اُس کے اندر کوشش کا ذوق پیدا کرتا ہے۔

لیکن اگر ہم بچّے کو گزرے ہُوے وقت کی خوشیاں یاد دلاتے رہیں اور یہی یقین دلائے رکھیں کہ یہی زمانہ بہتر تھا اور آنے والے وقت کو بُرے رنگ میں پیش کریں، تو اس سے بچّے کے بڑھنے کی قوت فنا ہو جاتی ہے۔ بعض بے دل آدمی تو بچّوں کو خوشیوں ہی کے فسانے سناتے رہتے ہیں۔ خوش نصیبی کی بات ہے کہ ان کا حافظہ اتنا زیادہ قوی نہیں ہوتا اور ان بزرگوں کی باتوں کا اثر ان کے دماغ پر دیر تک نہیں رہتا۔ بچّوں کے دل میں یہ احساس پیدا ہونا چاہیے کہ جوان آدمی بالکل آزاد ہوتے ہیں۔ کوئی دوسرا ان کی دیکھ بھال نہیں کرتا۔ کوئی اُنھیں کسی بات سے منع نہیں کرتا۔ وہ جو چاہیں کھائیں اور جہاں چاہیں جائیں۔ جس سے چاہیں کھیلیں اور جس سے چاہیں گفتگو کریں۔ ان کا جوانی کا زمانہ رشک کے قابل ہے۔ اس قسم کا احساس بچّے کی نشو ونما کے لیے بہت مفید ہے۔ یہ اسے بڑھنے پر اُکسائیگا اور کوشش کرنے کی ترغیب دے گا۔

شرمیلا پن بھی بزدلی کی ایک صورت ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ ہمارے بچّوں کو اجنبی لوگوں سے ملنے کے بہت کم موقعے ہوتے ہیں۔ ہمارے بچّے گھر کے آدمیوں کے علاوہ دوسرے لوگوں کو دوسری دنیا کی مخلوق سمجھنے لگتے ہیں۔ ہمارے مجلسی طور طریقوں کی کڑی پاسداری بھی اُنھیں شرمیلا بنا دیتی ہے۔ جہاں تک ہو سکے، ایک سال کے بعد بچّوں کو اجنبی لوگوں سے ملایا جائے اور اس طرح کہ وہ اُنھیں اُٹھائیں بھی اور ان سے بات جیت بھی کریں۔ اگر یہ بات بچّوں کی طبیعت پر بار ہو، تو اُنھیں اس چیز کا عادی بنانا چاہیے۔ اس طرح ان کا شرمیلا پن جاتا رہیگا۔ کوئی دوسرا آدمی ہم سے ملنے کے لیے آجائے، تو ہم بچّوں سے کہتے ہیں۔ "دیکھو نیچی نظر کیے چپ چاپ بیٹھے رہنا۔" یہ بات ٹھیک نہیں۔ ہونا یہ چاہیے کہ بچّے کی موجودگی کسی اجنبی کے آنے پر تکلیف کا موجب نہ بن جائے۔ بس یہی کافی ہے۔ کسی اجنبی کی آمد پر

نہ بچے سے یہ بھی نہیں کہہ دینا چاہیے: "لو اب یہاں سے بھاگ جاؤ"۔ بہتر یہ ہے کہ اُسے پوری آزادی سے اجنبی لوگوں سے تھوڑی دیر کے لیے ملائیں۔ پھر اُنھیں بھیج دیں۔ بچوں کی طبیعت میں انصاف کا مادہ ہوتا ہے۔ آپ اُنھیں کچھ آزادی دے دیں، وہ آپ کے حقوق کو تسلیم کرلیں گے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اگر ایک بچہ خوشی سے دوسرے کو اپنی گیند دیدے، تو وہ ضرور اتنی ہی خوشی سے اپنا پستول اُسے دے دیگا۔

سب سے بڑی بات یہ ہے، اگر آپ چاہیں کہ آپ کے بچوں کے دلوں سے خوف جاتا رہے، تو آپ دلیر بنیں اور خوف کو نزدیک نہ آنے دیں۔ اگر آپ بجلی کے گرجنے سے ڈرنے لگتے ہیں، تو جب آپ کا بچہ بجلی کے کڑکنے کی آواز آپ کی موجودگی میں سنے گا، تو وہ بھی ڈریگا۔ اگر آپ کسی سماجی انقلاب پر خوف کا اظہار کریں، تو ضرور ہے کہ آپ کا بچہ اس کے خیال سے ہی کانپنے لگے۔ بیماری سے اگر آپ ڈرتے رہیں، تو آپ کا بچہ بھی اس سے ضرور ڈریگا۔ انسانی زندگی خطروں سے پُر ہے۔ عقلمند وُہ ہے، جو ان خطروں کو ٹال دے۔ لیکن جو خطرے ٹل نہ سکیں، ان میں بھی وہ مردانہ طریقے سے ثابت قدم رہے۔ اگر کوئی مصیبت نازل ہو رہی ہو، تو اُس کے دفعیے کے لیے اسباب بہم پہنچانا، خوف نہیں، بلکہ عین عقل ہے۔ لیکن خوف ... احساس کا عکس ہے۔ اگر آپ کسی خطرے میں خوف کے احساس کو روک نہیں سکتے، تو ... کوشش ضرور کریں کہ آپ کے بچے آپ کے خوف سے واقف نہ ہونے پائیں۔

زندگی کے متعلق بچوں کے خیالات کو اتنا وسیع کر دو اور اُس کی دلچسپیوں کو اُن کی نظر میں اتنا بڑھادو کہ وُہ اس بات پر غور کرنا چھوڑ ہی دیں کہ انسان پر مصیبت بھی آتی ہے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے۔ جس کے ذریعے آپ اُسے دنیا کا ایک آزاد شہری بنا سکتے ہیں۔

[ماخوذ از برٹرینڈ رسل]

ڈالٹن پلین

تجویز تعلیم انفرادی

از

محمد عبدالغفور خاں، خلیق بسوی، ادیب فاضل، منشی فاضل

(گزشتہ سے پیوستہ)

پانچواں باب

اس تجویز کا اصول اوّلین "آزادی" ہے۔ طالب العلم کو انفرادی طور پر اپنی آزادی استعمال کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ وہ اس کا پابند نہیں ہے کہ فلاں وقت فلاں کام ضروری ہے۔ خواہ طبیعت چاہے یا نہ چاہے۔ اس کے خلاف اس تجویز کے تحت وُہ آزاد ہے کہ اپنے رجحانِ طبع کے مطابق خاص حدود کے اندر جب، جیسے اور جو کام پسند کرے، کرے۔ وُہ اپنی اصلی اور ناقابلِ فراموش مشکلات کو خود دُور کرتا اور حسب ضرورت اُستاد سے مدد لیتا ہے۔ ضبط کی غیر ضروری اور محض نمائشی زنجیروں میں جکڑا ہوا نہیں ہے، بلکہ "ضابطہ نفس" کا پابند ہے۔ اس سے اس تجویز کا دوسرا اصول "موالات و تعاون" پیدا ہوتا ہے، یا یوں کہو کہ وُہ اپنے پیشِ نظر معیار تک پہنچنے کے لیے ہم خیال رفقائے کار سے تعاون کرتا اور دوسروں کی واقفیت سے خود فائدہ اُٹھاتا اور اپنی تحقیق سے اُنھیں فائدہ پہنچاتا ہے۔

اُسے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جانے، ایک مضمون کو چھوڑ کر دوسرے

کو اختیار کرنے اور حسب خواہش دوسرے مضمونوں کی طرف توجّہ منعطف کرنے کی پوری آزادی ہے۔ اگر وُہ پابند ہے، تو صرف اس قانونِ غیر مرئی کا جو اُس نے اور اُس کے رفقائے کار نے متفقہ طور پر جمہوری ضروریات کو مدّنظر رکھ کر اپنے لیے تجویز کیا ہے۔ بدیں صورت کہ اگر وہ کبھی قانونِ غیر مرئی کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے، تو وہ اُس جمہوریت کے روبرو جس کا وُہ ایک فرد ہے، جواب دہ ہے۔

اس تجویز میں سال بھر کا نصابِ تعلیم طالب علم کے سامنے رکھا جاتا ہے اور اس کی موجودگی میں وہ ایک منزلِ مقصود اور ایک نصب العین اپنے لیے مقرر کرتا ہے، جسے اُس کو حاصل کرنا ہوتا ہے۔ وُہ اپنے کام کو اپنی طاقت اور میلانِ طبع کے مطابق ترتیب دیتا ہے اور اپنی ذہنی قابلیت، دماغی اہلیت، فطری رغبت اور ذاتی سعی سے سرانجام دیتا ہے اور کسی دوسرے کی کرمفرمائی یا رازدارانہ اعانت کا منتظر نہیں رہتا۔ چونکہ اس کے ساتھی بھی اسی منزل کی طرف گامزن ہوتے ہیں، اس لیے وُہ ان سے مل کر تلاشِ معلومات میں سرگرم ہوجاتا ہے۔ اگرچہ اس کی آخری کامیابی تمام و کمال خود اس کی اپنی ذات ہی پر منحصر ہے، مگر تاہم وہ اپنے رفقائے کار سے تعاون کرنے ہی میں اپنی ترقّی و کامرانی سمجھتا ہے اور اس طرح جو کچھ بھی وہ حاصل کرتا ہے، حقیقی معنوں میں حاصل کرتا ہے۔ کیونکہ ہم فطرتاً وہ یاد نہیں رکھتے، جو ہم نہایت سخت محنت سے حاصل کرتے ہیں۔ ان میں خود اعتمادی کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور وہ خود اعتمادی کے بل بوتے پر عملی زندگی شروع کرنے سے پہلے اپنے آپ کو اُس کے لیے تیار پاتے ہیں اور سچ پوچھو، تو تعلیم و تربیت کا مقصد ہونا بھی یہی چاہیے کہ انسان کو ہر لحاظ سے عملی زندگی کے لیے تیار کر دے۔

اس تجویز کے تحت طالب علم مدرسہ اور اُس کی چار دیواری کے اندر مقیّد نہیں رہتا،

بلکہ وہ فضائے آزادی میں سانس لیتا ہے۔ وقت اور موقع کی نزاکت کو سمجھنا اور اُس کے مطابق اپنا کام تجویز کرکے اُس کی تکمیل کے وسائل پر غور وفکر کرنے لگتا ہے۔ وہ قوامِ عالم کو سمجھ کر جمہوریت کے اصولوں پر عمل پیرا ہونا شروع کر دیتا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ "ڈالٹن پلین" کی تجویز منضبط قواعد کا ایک ایسا مجموعہ ہے، جن پر مذہبی رسوم کی طرح اس شدّ و مدّ سے عمل پیرا ہونا ہے کہ ذرا بھی پس وپیش نہ کیا جائے، بلکہ وُہ تو صرف ایک رہنمائی ہے، جس کے ذریعے راہ رو اپنی راہ اور طالب علم اپنے نصب العین کے مطابق حسب ضرورت کام لیتا ہے۔ ہر مدرسہ اور اُس کے منتظمین اپنی ضرورت اور حالات کے مطابق اس میں ترمیم کرنے کے مجاز ہیں۔ یہ ایک اصول ہے، جسے حالات کے مطابق استعمال میں لانا چاہیے۔

پس مختصر طور پر "ڈالٹن پلین" کے عملدرآمد کا انحصار مندرجۂ ذیل اصولوں پر ہے:۔

(۱) آزادی (۲) موالات وتعاون (۳) ذاتی سعی و خودداری

چھٹا باب

مدرسے میں ڈالٹن پلین کا اجراء

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم موجودہ ماحول (جماعت بندی کے موجودہ جھمیلے اور سالانہ امتحانِ ترقی کے بکھیڑے کی صورت میں) کے اندر کس طرح اس تجویز سے مستفید ہو سکتے ہیں؟

اس کا جواب نہایت آسان اور خود آپ کے روزمرّہ عمل میں موجود ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اب تک تو یہ تجویز ہمارے دیہاتی مدارس میں مدرس کے اپنے معیار اور نصب العین

کے تحت درپردہ غیر منضبط صورت میں کارفرما رہی ہے اور ہے۔ مگر اب تجویز کو اصولی طور پر عملی جامہ پہنانے کے لیے ضروری ہے کہ مدرس طلبہ کی ضرورت، طاقت اور کیفیت ذہنی کے مطابق نصاب و دستور العمل کو مرتّب کر کے کام میں لائے اور اپنی آزادی کے ساتھ طلبہ کو بھی آزادی کی فضا میں اطمینان کا سانس لینے کا حق تفویض کرے۔

اگر مدرّس پہلے اپنے کام کا سلیبس مرتّب کر کے اپنی مصروفیت و بیکاری کے ایّام پر تقسیم کرتا ہے، تو اب اس کام کو اس کے اصل کارندوں کے روبرو ایک خاص مگر مناسب و موزوں ترتیب و نظام سے پیش کرے تا کہ ان کو شروع سال ہی سے اپنی منزلِ مقصود کا علم ہو جائے اور یہ درخشاں خیال راہِ ترقی پر قدم اُٹھانے کا محرک ہو سکے۔

اگر آج تک مدرس اپنے رجحانِ طبع کا فرمانبردار رہا ہے، تو اب طلبہ کے میلانِ طبع کا خود پابند ہو جائے اور جان لے کہ آزادی کا راز پابندی ہی میں مضمر ہے۔ مدرسے میں نظامِ اوقات کا خاتمہ کر دیا جائے۔ طلبہ مدرسے میں پڑھنے آئیں اور وہ ایک مضمون کو اپنی دلچسپی یا کمزوری کے مناسب جتنا وقت چاہیں، آزادی سے دیں اور جب ایک مضمون سے جی اُکتا جائے، تو دوسرے مضمون کو شروع کر دیں۔

کمروں کی تقسیم جماعت وار نہیں، مضمون وار ہو جائے۔ ہر مضمون کے کمرے میں اس مضمون کے متعلق ہر قسم کا ضروری سامان، کتب حوالجات وغیرہ، مختلف طلبہ کی ضروریات کے مطابق ایک سے زیادہ تعداد میں نہایت ترتیب و تنظیم کے ساتھ موجود ہوں تاکہ تربیت کا یہ مفہوم کہ "بچے کی اردگرد کی چیزوں کو ٹھیک ٹھاک رکھنا تربیت ہے"، اصلی معنوں میں حاصل ہو سکے۔ گویا کمرہ ایک عجائب خانہ ہو، جس میں معلوماتِ عجیبہ و غریبہ سے پُر کتابیں، نقشہ جات، فہرستیں، نمونے اور مرقّع جات مہیّا ہوں اور مدرس

مہتمم عجائب خانہ کی طرح ہر نادر و عجیب چیز کی ندرت و غرابت سے اس درجہ واقف ہو کہ طلبہ کی رہنمائی کے وقت بداہتہً کتبِ معاون کا نام، باب اور فصل حتیٰ کہ بدرجۂ غایت صفحہ اور سطر کا حوالہ دے سکے اور حق امداد ادا کرتے ہوئے، نقشِ اُستادی طلبہ کے لوحِ دل پر بٹھا سکے۔

نصابِ تعلیم اور جماعت بندی پُرانے دستور کے مطابق ہیں، اس لیے ان کو افسرانِ محکمہ تعلیم کی اصلاح تک بحال خود رہنے دیں، بلکہ فی الحال اپنی ترقی و کامیابی کا مقابلہ دوسری درسگاہوں سے کرنے کے لیے ضروری خیال کرے۔ زبانی تعلیم کا جماعتی طریقہ سردست بالکل ترک نہ کیا جائے، بلکہ کم کر دیا جائے اور صرف اس وقت اختیار کیا جائے، جبکہ کوئی خاص مشکل مسئلہ ساری جماعت کو سمجھانا ضروری ہو۔ ایک سال کے کام کا خاکہ مرتّب کر کے اُسے حصّوں میں تقسیم کر دیا جائے کہ ایک جماعت کا ایک طالب علم اچھی طرح کس قدر کام کس قدر عرصے میں کر سکتا ہے اور اس لیے کہ ذہین ترین، متوسط اور غبی طلبہ میں تقسیم ہو سکے۔ آسانی کے لیے بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا حصّہ بھی معیّن کر دیا جائے۔ طلبہ کو انتخابِ معیار کا حق دیا جائے۔ وُہ اپنی قوّتِ ذہنی اور رفتارِ عملی کے لحاظ سے اپنے حسب حال کسی درجے کا کام انتخاب کر سکتے ہیں۔ یہ تمام حصّے بلحاظ اوسط یکساں ہونگے۔ فرق صرف مشکل و آسان کتب و تحریری مشقوں کا ہو گا۔

اس تجویز کی موجدہ مس پارک ہرسٹ نے اپنے ہاں یہ دستور قائم کیا ہے کہ مڈل تک طلبہ اپنے اپنے حصّے پورا کرنے کا اجارہ (Contract) لیتے ہیں اور ایک فارم پُر کر کے اُستاد کو دیتے ہیں، جو ان کے اجارہ کے مکمل ہو جانے پر اُنھیں واپس دیدیا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پاس ہو گئے ہیں۔

آسانی کے لیے نصابِ تعلیم کو ضروری اور معمولی مضامین میں تقسیم کیا جائے۔ یہ تقسیم صرف معیارِ ترقی اور وقت کے لحاظ سے ہوگی۔ طالب علم جب سارے مضامین کو کما حقہٗ پورا کر دکھائے، تو اُس کا اجارہ واپس دیدیا جائے، ورنہ نہیں۔

مگر اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ تعلیم کا تمام بار طلبہ پر ڈال کر مدرس بیٹھے دیکھا کریں، بلکہ جُوں جُوں طلبہ اس طرزِ عمل سے واقف ہوتے اور اپنے نام نہاد نصابِ تعلیم پر قابو پاتے جائیں گے، مدرسین کو بہت زیادہ مستعدی، تیاری اور ذکاوتِ طبع سے کام لیکر طلبہ کے ساتھ پورا اُترنا پڑیگا اور جماعتی اسباق کے بجائے انفرادی طور پر ہر طالب علم کا خیال رکھنا ہوگا اور ایک زبردست حسّیات کے مالک نبّاض طبیب کی طرح تبدیلِ توجّہ اور تبحرِ عملی کا کرشمہ دکھانا پڑیگا۔ اُسے ہوشیار و باخبر رہ کر طلبہ کے لیے ہُوئے کام کی پڑتال کا فرض بھی انجام دینا ہوگا اور یہ کام کثرتِ طلبہ کی صورت میں ایسا اہم ہوجائیگا کہ بغیر وسعتِ مطالعہ، محدود قابلیت کے اُستاد کے بس کا نہیں۔ اس لیے لازمی طور پر مدرس کو اپنے مضمون کے متعلق ہر وقت مطالعے میں مصروف رہنا پڑیگا۔ علاوہ ازیں تقریری اسباق کے لیے بھی ہر وقت تیار رہنا ہوگا اور اہم مضامین کی حالت میں ایسی مشکلات، جو سب کے لیے یکساں، ضروری اور مفید ہونگی۔ اُستاد جماعت کے سب طلبہ کو جمع کر کے ایک کانفرنس منعقد کریگا۔ اس قسم کے جلسہ ہائے مشاورت گرامر جیسے استدلالی مضامین میں ازبس مفید ثابت ہونگے اور طلبہ نہایت ذوق و شوق کا اظہار کرینگے۔ زباندانی اور علمِ ادب، جن میں تلفّظ اور لہجے کی مشکلات اُستاد کی رہنمائی کی محتاج ہیں، زبانی اسباق کے ذریعے حل کی جائینگی اور ہیڈ ماسٹر ہر طبقے کی ضرورت کے مطابق ایک خاص وقت روزانہ یا ہفتے وار، جیسا مناسب ہوگا، مقرر کیا کریگا۔ جس میں اُستاد اجتماعی طور پر ایک خاص نظام کے ماتحت اصول قرأت کی تعلیم دے گا۔ مگر یہاں بھی اندھا دھند کام کرنے کے

بجائے اوصافِ خوشخوانی اور مدارجِ قرأت مقرر کرکے نصابِ قرأت وتقریر ختم کرانا ہوگا، تاکہ فنِ قرأت وتقریر کی موجودہ کس مپرسی کا انسداد خاطر خواہ ہو جائے۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ بلحاظ قابلیتِ قرأت وتقریر مڈل کی چاروں اور پرائمری کی اعلیٰ جماعتوں میں ما بہ الامتیاز قائم کرنا مشکل ہوگیا ہے۔ ایک قابل سے قابل مگر اجنبی نووارد نقادِ فن مختلف جماعتوں کے ملے جلے طلبہ سے ایک ہی عبارت پڑھا کر ان کی جماعت بندی، نام نہاد جماعت بندی کے مطابق کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ وجہ ظاہر ہے کہ اوصافِ خوشخوانی اور اصولِ قرأت کی تحصیل و ترقی کے لیے ہم کوئی خاص نصب العین مدِنظر نہیں رکھتے۔ اگر مدرس چاہے، تو تجویز کے باعث یہ مقصد بھی خاطر خواہ حاصل کرسکتا ہے اور زیادہ نہیں، تو چار سال کے عرصے ہی میں مدرسے میں بہتر سے بہتر قاری وخطیب بکثرت پیدا کرسکتا ہے، جو آجکل کمیاب ہیں۔

موجودہ طرزِ تعلیم اور طریقِ امتحان کے سبب مشرقی اور دیسی زبانوں کی جو دُرگت پرائمری اور لوئر مڈل مدارس سے گزر کر اپر مڈل مدارس میں ہو رہی ہے۔ اس کو دیکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ یہ مرض متعدی ہو کر قلیل عرصے میں ہائی اسکولوں اور کالجوں میں پہنچے بغیر نہ رہیگا اور ابتدائی جماعتوں میں کام کرنے والے اساتذہ کی کوتاہیوں کا ٹھیکرا مدرسین اعلیٰ کے سر ضرور پھوٹ کے رہیگا، جو ایک حد تک مجبور و معذور ہیں، کیونکہ بسا اوقات اپر مڈل کی آخری جماعت میں سات سال کی ان تمام کمیوں کو پورا کرنا ہوتا ہے، جو طرزِ تعلیم کی خرابی، مدرسین کی بےفکری اور بعض حالات میں غیر ذمے داری اور خود طلبہ کی بے پروائی و بے توجہی سے مستقل صورت اختیار کرچکی ہوتی ہے پھر نو یا دس مہینے کے قلیل عرصے میں زبان، گرامر، قرأت اور قوتِ بیانیہ اور اس کے ساتھ دوسرے مضامین کی اتنی ہی ناقابلِ ذکر کمیوں و کوتاہیوں سے عہدہ برآ ہونا، ایک ہمہ تن مصروف و بہر نوع ذمے دار شخص کے لیے ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ امیدواران

امتحان ورنیکلر فائنل اور حصہ ہائی کے طلبہ زباندانی میں ہجوں، مخارج حروف اور اسم و فعل کی شناخت تک سے نابلد ہوتے ہیں اور ایسا ہی حساب کے سوالات حل کرتے ہُوئے ضرب و تقسیم کی بھی معمولی طفلانہ غلطیاں کرتے ہیں مقسوم و مقسوم علیہ وغیرہ اصطلاحاتِ حسابیہ کو تو جانے ان کی بلا۔

ہم پیشہ حضرات! ان بصارت سوز مناظر اور تخیّل کش تصوّرات کا خاتمہ کیا چاہتے ہو، تو تعلیمِ انفرادی کو اصولِ مذکورہ کے ساتھ ذریعۂ کار بنائیے اور پھر تعاون و موالاتِ باہمی اور شوقِ قلبی کے ساتھ طلبہ میں خود اعتمادی، تعاونِ باہمی اور شوقِ روز افزوں، جو تحصیلِ علم کی روحِ رواں ہے، پیدا کر کے حصولِ مقاصد میں کوشش کیجیے اور دیکھیے کہ عرصۂ قلیل ہی میں استاد اور شاگرد اپنی اپنی جگہ بزرگانِ سلف کی زندہ مثالیں دکھائی دیتے ہیں کہ نہیں۔

یہ بالکل سچ ہے کہ مدرس کا کام طلبہ کے سامنے گراموفون کی طرح مطالب سبق بیان کرنا نہیں ہے، بلکہ مطالعہ کا سچّا ذوق پیدا کر کے اُس سے مستفید ہونے کا ڈھنگ بتا دینا اور تجسس و تحقیقِ علمی کی صحیح روح اپنے طالب علموں میں پیدا کرنا ہے۔ گویا مدرس کو مدرسے کی چار دیواری کے اندر سامانِ تعلیمی کے استعمال اور اپنے بہترین نمونے سے طلبہ میں مطالعہ اور تجسسِ معلومات کی ایسی کم نہ ہونے والی اشتہا پیدا کرنے کا کام سرانجام دینا ہے، جو تادمِ واپسیں جاری و ساری رہ کر خیراتِ جاریہ کی طرح ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی ہمہ گیر ہو جائے اور تمام ملک کے دماغ کو علمی روشنی سے منوّر و مزیّن کر دے۔

(باقی آئندہ)

اشتہار

اشتہار

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۴۱	سلطان علاؤالدین خلجی	۲ر۱۱ پائی
۴۲	فیروزالدین تغلق . . .	۳ر
۴۳	امیر تیمور	۲ر۷ پائی
۴۴	پرتھوی راج	۲ر۸ 〃
۴۵	محمود غزنوی	۲ر۶ 〃
۴۶	مصر کی داستان . .	۳ر
۴۷	جاپان کی کہانی	۴ر
۴۸	چین کی کہانی	۳ر۶ پائی
۴۹	مستورات چین وجاپان	۴ر
۵۰	ایران کی کہانی	۲ر
۵۱	ایشیائی روم . . .	۲ر۷ پائی
۵۲	ٹرکی (یورپی روم) . . .	۲ر۸ 〃
۵۳	لنکا	۱ر۱۱ 〃
۵۴	بصرہ وبغداد . . .	۵ر
۵۵	یونان	۲ر
۵۶	تین سوال	۲ر۷ پائی
۵۷	امرت ورشا	۲ر۱۰ 〃
۵۸	زمانہ سلف کے قصے کہانیاں نمبر ا داؤد بادشاہ	۲ر۶ 〃
۵۹	کہانیاں بتیس پتلیاں حصہ اول	۳ر۹ 〃
۶۰	〃 〃 دوم 〃	۴ر۵ 〃
۶۱	ہیرالال	۲ر۶ 〃
۶۲	خوفناک خواب	۲ر
۶۳	دولت کی پٹاری . . .	۲ر۱ پائی
۶۴	سادھو کی چکی	۲ر
۶۵	نیلا باز	۲ر۱۱ 〃

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۶۶	بہادر شہزادہ	۲ر۱ پائی
۶۷	جوتی موتی	۲ر۱۰ 〃
۶۸	جواہرات کا خزانہ . . .	۳ر۷ 〃
۶۹	چھوا اور خزانہ ہُوا بالتصویر	۲ر
۷۰	علی بابا چالیس چور . . .	۴ر
۷۱	علاؤ الدین و عجیب وغریب لیمپ	۴ر۶ پائی
۷۲	ملا دو پیازے کا سفر .	۳ر
۷۳	سادھو کنور سدھارتھ . . یعنی مہاتما بدھ کا دھرم گیان	۳ر
۷۴	نیشا پور کا سوداگر . . .	۲ر۱۱ پائی
۷۵	پرستان کا موچی . . .	۳ر
۷۶	سندر پیاری	۳ر
۷۷	چاندی کی کنجی	۳ر
۷۸	سلکِ جواہر نمبر ا (حکمرانی کا گر)	۲ر۶ پائی
۷۹	〃 〃 نمبر ۲ (اوج وپستی)	۱ر۱۱ 〃
۸۰	〃 〃 نمبر ۳ (شہید الفت)	۱ر۶ 〃
۸۱	سلکِ جواہر ۔ مردِ میدان	۱ر۹ 〃
۸۲	〃 〃 نیک وبد	۱ر۹ 〃
۸۳	〃 〃 عیب وہنر	۱ر۴ 〃
۸۴	〃 〃 جہاں گرد	۱ر۶ 〃
۸۵	〃 〃 جواب باصواب	۱ر۱۰ 〃
۸۶	〃 〃 سخاوت کی انتہا	۱ر۲ 〃
۸۷	〃 〃 حسنِ تدبیر	۱ر۳ 〃
۸۸	ڈرامہ نئی بستی یعنی شہر بت	۱ر۳ 〃
۸۹	ڈرامہ غم خوار عالم	۱ر۷ 〃

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۹۰	مہاراجہ بکرماجیت اور اُس کا تخت	۱/۶ پائی
۹۱	سنہری گیت حصہ اوّل	۲/۴ "
۹۲	" " دوم	۲/۴ "
۹۳	" " سوم	۲/۷ "
۹۴	جومانگو	۳/
۹۵	اسرار دل	۵/
۹۶	جارج واشنگٹن ..	۱/۶ پائی
۹۷	سکاؤٹوں کا بادشاہ ..	۱/۸ "
۹۸	لوہے کا بادشاہ ...	۱/۶ "
۹۹	آزادی کا بادشاہ ...	۱/۱۱ "
۱۰۰	صابن کا بادشاہ ...	۱/۱ "
۱۰۱	ڈاکو کی مرمت	۲/۶ "
۱۰۲	چھومنتر	۴/۵ "
۱۰۳	فرصت کے کام ...	۳/۴ "
۱۰۴	دنیا کے کام کاج	۵/۵ "
۱۰۵	آداب و اخلاق	۱۰/
۱۰۶	موقعہ	۵/۴ "
۱۰۷	نیک اطوار	۲/
۱۰۸	خوشی کا کھیل	۳/۱۰ "
۱۰۹	بہادر محمود	۱/۷ "
۱۱۰	سہراب و رستم ...	۲/۱ "
۱۱۱	دھوپ چھاؤں	۳/
۱۱۲	راجہ ہریش چندر ...	۲/
۱۱۳	گورو کے پانچ بچن	۱/۸ "
۱۱۴	سنہری پرندہ	۲/۱ "
۱۱۵	کرشن جی کا بچپن	۱/۴ پائی
۱۱۶	تبدیل قسمت	۱/۹ "
۱۱۷	جادو کا قلعہ	۳/
۱۱۸	راجہ گوپی چند ...	۱/۷ پائی
۱۱۹	بندر کی ہوشیاری ..	۱/۶ "
۱۲۰	بارہ بھائی	۱/۱۰ "
۱۲۱	مشاہیر عالم حصہ اوّل	۳/
۱۲۲	" " دوم	۳/
۱۲۳	" " سوم	۳/

کتب لائبریری
برائے لوئر و اپر مڈل سکولز

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱	رسوم ہند حصہ اوّل ..	۲/۶ پائی
۲	" " دوم ..	۴/۷ "
۳	تخت سلیمانی ...	۷/۸ "
۴	الہ دین چراغ	۴/۶ "
۵	مہابھارت کی کہانی ..	۵/۶ "
۶	رامائن کی کہانی ...	۲/۸ "
۷	پیارا گورو نانک ..	۳/۷ "
۸	سیّد انشاء اللہ خاں انشا	۴/۱ "
۹	سوانح عمری نواب مرزا خاں	۴/۲ "
۱۰	داغ	
۱۱	" تذکرہ ...	۳/۶ "
۱۲	" میر درد ..	۳/۴ "
۱۳	" میر تقی ..	۵/۵ "

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱۴	سوانح عمری شبلی . .	۳ر۴ پائی
۱۵	″ ″ مولانا نذیر احمد مرحوم	۳ر۹ ″
۱۶	″ ″ مرزا غالب	۳ر۱۰ ″
۱۷	پھولوں کی ٹوکری	۴ر
۱۸	سچے موتی	۳ر۱ ″
۱۹	آزمائش	۴ر
۲۰	سدا بہار کے پھول . .	۳ر۱ ″
۲۱	تاریخی کہانیوں کا سلسلہ	۸ر
۲۲	اٹل	۲ر۹ ″
۲۳	امتحان	۵ر۱۰ ″
۲۴	پنچ رتنی	۴ر۲ ″
۲۵	بہادر مائیں	۴ر۱۰ ″
۲۶	غلطی کا شکار	۶ر
۲۷	سات سوال	۶ر۵ ″
۲۸	برہم رشی وشوامتر . .	۵ر
۲۹	کرشمۂ جہالت ماسٹر کنہیالال	۸ر
۳۰	دلچسپ کہانیاں نمبر ۱ دوارکا پرشاد	۵ر
۳۱	″ ″ ″ نمبر ۲	۶ر
۳۲	ملکۂ مہر انگیز	۵ر
۳۳	فتنۂ عالم	۳ر
۳۴	راجہ نل و دمینتی . . .	۴ر
۳۵	شکنتلا	۲ر۷ پائی
۳۶	سیلاب خون . . .	۶ر۶ ″
۳۷	ہندوستان اور جنگ عالمگیر	۷ر۴ پائی
۳۸	شہرت	۴ر۸ ″
۳۹	آئین شہرت و قوانین صحت	۶ر
۴۰	دیہات کی قوت و طاقت کا سرچشمہ	۴ر
۴۱	باغ عالم	۱۳ر۵ ″
۴۲	ہندوستان کی تاریخی کہانیاں ″ ″ حصہ اول ″	۱۲ر۶ ″
۴۳	″ ″ حصہ دوم ″	۱۱ر۹ ″
۴۴	انمول موتی کی مالا	۶ر
۴۵	مشکلات کی عظمت . . .	۶ر
۴۶	داستان وطن . . .	۶ر
۴۷	مشاہیر عالم۔ حصہ چہارم	۳ر
۴۸	″ ″ ″ پنجم	۴ر
۴۹	″ ″ ″ ششم	۳ر
۵۰	″ ″ ″ ہفتم	۴ر
۵۱	ہرش چندر مصنفہ ایم سروپ کوشل ایم اے	۵ر۲ پائی
۵۲	ہنومان ″ ″ ″	۵ر
۵۳	دھرو ″ ″ ″	۵ر۳ ″
۵۴	ارجن ″ ″ ″	۶ر۱ ″
۵۵	بھیشم ″ ″ ″	۵ر۶ ″
۵۶	پرہلاد ″ ″ ″	۵ر۳ ″
۵۷	چندر ہاس ″ ″ ″	۵ر
۵۸	نرسی بھگت ″ ″ ″	۳ر۵ ″

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز ایجوکیشنل پبلشرز لاہور

Printed and published by L. Moti Ram, Manager, for Messrs. R.S.M. GULAB SINGH & SONS, at the Mufid-i-'Am Press, Chatterji Road, Lahore.